سیرت

حضرت عمرو بن العاص رضؓ

(فاتح مصر)

ڈاکٹر

حسن ابراهیم حسن

(پی ایچ ، ڈی)

ترجمه :

شیخ محمد احمد پانی پتی

لاهور

مکتبۂ جدید

(انار کلی)

بار اول - ۱۹۵۶ء

طابع : نذیر احمد چودھری
سویرا آرٹ پریس ، لاہور

ناشر : رشید احمد چودھری
مکتبہ جدید ، انار کلی ، لاہور

ترتیب

(دوسرا حصہ) فتح مصر

(تیسرا حصہ) معزولی سے وفات تک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمدللہ رب العالمین والصلواۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین ۔

' تاریخ عمرو بن العاص ' ۱۹۲۱ء میں چھپی تھی اور اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ایک ہی سال کے عرصے میں طبع اول کی تمام جلدیں ختم ہوگئیں ۔

اس کتاب کے متعلق مجھے بہت سے ذی علم اصحاب خصوصاً مستشرقین کی طرف سے تعریفی خطوط موصول ہوئے تھے ۔ مجھے لندن یونیورسٹی میں داخلے کا موقع ملا تو وہاں میں نے اپنے کئی محترم پروفیسروں کی خدمت میں جن کا شمار چوٹی کے مستشرقین میں ہوتا ہے اس کتاب کا ایک ایک نسخہ پیش کیا ۔ پروفیسر سر ڈینسن راس ، صدر شعبہ علوم شرقیہ لندن یونیورسٹی اور سر ٹامس آرنلڈ، پروفیسر تاریخ اسلام نے اس کتاب کو سراہا اور میری بے حد حوصلہ افزائی فرمائی ۔ ساتھ ہی مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ میں لندن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لیے ایک تحقیقی مقالہ سپرد قلم کروں ۔ یہ شرف مجھ سے پہلے اور کسی مصری کو حاصل نہیں ہوا ۔

میں نے اس کتاب کی نظرثانی کرتے وقت اسے ثانوی سکولوں

اور کالجوں کے طلبہ کے مفید مطلب بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ چنانچہ (۱) ' فلسطین ، شام اور مصر کی فتوحات' (۲) ' اسلام سے پہلے مصر کی حالت ' (۳) ' حضرت علی اور حضرت معاویہ کا اختلاف ' اور (۴) 'مصر میں عمرو بن العاص کی اصلاحات ' کے ابواب کو نسبتاً مبسوط شکل میں پیش کیا ہے۔

میں جناب اسماعیل رأفت بک ، استاد شیخ محمد خضری بک ، استاد شیخ عبدالوهاب نجار ، ڈاکٹر طهٰ حسین ، پروفیسر یوسف آفندی مفتش محکمہ آثار قدیمہ مصریہ ، شیخ محمد مختار یونس پرنسپل ٹریننگ کالج منصورہ ، محمد آفندی یوسف چیف انجینئر محکمہ رفاہ عامہ اور اپنے محترم دوست آفندی عیسیٰ ابراھیم کیوریٹر ' الاملاک الامیریہ ' قاہرہ ، کا دلی شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی عنایات بے پایاں اور نوازش ہائے پیہم اس کتاب کی تالیف کے دوران میں میرے شامل حال رہیں اور جن کے اخلاص و محبت کی بدولت میں اس کتاب کو آپ کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہؤا۔

حسن ابراھیم حسن

لندن

۱۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء

پہلا حصّہ

ولادت سے فتح مصر تک

پہلا باب

اسلام لانے سے قبل

۱ : قبیلہ

حضرت عمرو بن العاص کے حالات ، فتوحات ، سیاست اور اخلاق پر بحث کرنے سے پہلے ان کے قبیلے بنو سہم کا مختصر حال بیان کرنا مناسب ہے کیونکہ لوگوں کے اعمال و افکار پر ان کا قبیلہ ، خاندان اور ماحول کافی حد تک اثر انداز ہوتا ہے ۔ اور قبیلہ و خاندان پر نظر ہو تو کسی شخص کے عادات و اخلاق کے متعلق بہت کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔

بد قسمتی سے بنو سہم کے متعلق کتب تاریخ میں بہت کم تحریر کیا گیا ہے ۔ جو کچھ تھوڑا بہت لکھا گیا ہے وہ چنداں اہم نہیں اور اس سے قبیلے کی کوئی واضح تصویر ہمارے سامنے نہیں آتی ۔ کتابوں کی چھان بین سے ہمیں جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ ہے کہ ' قبیلہ بنو سہم بن عمرو بن ھصیص بن کعب بن لوئی ، قریش کا ایک معزز قبیلہ تھا ۔ جاھلیت اور اسلام دونوں زمانوں میں اس قبیلے کے فرزند اعلیٰ عہدوں پر سرفراز رہے ۔ مکہ کی سیاست اور سیادت میں ان کا بہت عمل دخل تھا ۔

خانۂ کعبہ اور مکہ کا انتظام کرنے کے لیے قریش نے جو کونسل قائم کر رکھی تھی بنو سہم کو اس میں کافی نمائندگی حاصل تھی ۔ ان وجوہ کی بنا پر یہ قبیلہ عزت و شرف اور سطوت و شوکت میں دوسرے معزز قبائل سے کسی طرح کم نہ تھا ۔

جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے اسلام سے قبل بنو سہم کو قریش کی انتظامی کونسل میں حصہ ملا ہؤا تھا اور مکہ کی حکومت میں بھی انہیں نمائندگی حاصل تھی ۔ وہ حکومت کس طرز کی تھی ؟ اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ، تاہم جہاں تک ہم جانتے ہیں اس وقت عربوں اور ان کے علاوہ دیگر اقوام بلحاظ تہذیب و تمدن اپنے ابتدائی دور میں سے گزر رہی تھیں ۔ یہ طریقہ رائج تھا کہ بڑے بڑے قبائل مختلف اجتماعی امور کو باہم تقسیم کرلیا کرتے تھے اور ایک کونسل شہر یا علاقے پر حکومت کے فرائض انجام دیتی تھی ۔ بنو سہم کو حکومت کا جو شعبہ تفویض تھا وہ غالباً قضا کا تھا ۔ قریش اور دیگر اہل مکہ اپنے جھگڑے اور مقدمات تصفیہ کے لیے سرداران بنو سہم کے سامنے پیش کیا کرتے تھے ۔ جن لوگوں کے سپرد یہ اہم کام تھا وہ اصحاب الرائے اور صاحب فہم و ذکاء ہوتے تھے ۔ چونکہ اسلام کے ظہور تک بلکہ اسلام کے بعد بھی مکہ کی حکومت انہیں لوگوں کے ہاتھوں میں رہی اس لیے یہ لازم تھا کہ موروثی حکومت کا اثر ان کے عادات و خصائل پر پڑتا اور وہ عقلمندی ، ذہانت ، فطانت اور معاملہ فہمی کی صفات سے بہرہ ور ہوتے ۔ یہ عادات و خصائل وراثت کی طرح ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتے چلے آتے تھے ۔ عمرو بن العاص کی سیاسی مہارت اور عقل و فراست میں بہت بڑا حصہ اس موروثی حکومت کا بھی تھا ۔

بنو سہم کے سپرد خزانۂ کعبہ کی تولیت اور اوقاف عامہ کا انتظام بھی تھا ۔ کعبہ اور اس میں رکھے ہوئے بتوں پر جو چڑھاوا چڑھتا تھا اس کی تقسیم کا سارا کام بنو سہم ہی کرتے تھے ۔ اس کے لیے بھی تدبر و عقلمندی، معاملہ فہمی اور مالی امور سے کماحقہ واقفیت کی ضرورت تھی ۔ اسی کا اثر تھا کہ عمرو بن العاص میں مالی امور کا انتظام کرنے کی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی ۔

بنو سہم کے اکثر افراد عزت و شرف ، ادب ، شعر گوئی ، سخاوت ، مہمان نوازی اور انفصال مقدمات میں بہت مشہور تھے ۔ قیس بن عدی ، عزت و وجاہت میں ایک خاص مقام رکھتا تھا ۔ اگر کبھی عربوں کو عزت و شرف کی مثال دینی ہوتی تھی تو وہ کہا کرتے تھے " فلاں شخص عزت و وجاہت میں قیس بن عدی کی مانند ہے ۔" حارث بن سعید بن سہم، سخاوت اور مہمان نوازی میں مشہور تھا ۔ شعر گوئی میں بھی اس قبیلے کے کئی لوگوں نے نام پیدا کیا تھا ۔ عبداللہ بن زبعری بن قیس بن عدی ، جس کا شمار قریش کے معدودے چند بڑے بڑے شعراء میں ہوتا تھا اور جو فتح مکہ سے قبل مسلمانوں کی ہجو کہنے میں مشہور تھا اسی قبیلے کا ایک فرد تھا ۔

عمرو بن العاص کے والد 'عاص بن وائل' کو جاہلیت میں جو بلند رتبہ ، سیادت، جاہ و عزت اور شرف حاصل تھا وہ محتاج بیان نہیں ۔ ہجرت سے قبل جنگ فجار ثانی میں بنو سہم کی سرداری اور سپہ سالاری انہیں کے سپرد تھی ۔ وہ مکہ کے بہت مالدار تاجر تھے ۔ ان کے تجارتی قافلے شام اور یمن تک جایا کرتے تھے ۔ عمرو بن العاص اور ان کے بھائی ہشام (جو مہاجرین اولین میں سے تھے اور جنگ یرموک میں شہید ہوئے) قبیلے میں بلند رتبے

کے مالک تھے۔ عاص بن وائل کے دو اور بیٹوں، عبداللہ اور محمد نے ادب اور اصابت رائے میں شہرت حاصل کی تھی - جس طرح جاہلیت میں بنو سہم کے سپرد قضا کا کام تھا اسی طرح اسلام میں بھی رہا - چنانچہ فتح مصر کے بعد سب سے پہلے جس شخص کے سپرد وہاں قضا کا کام کیا گیا وہ اسی قبیلے کے ایک فرد قیس بن ابو العاص بن عدی تھے - قیس، ثروت، مہمان نوازی اور عزت و وجاہت کی وجہ سے بہت مشہور تھے - سب سے پہلے انہیں نے مصر میں مسافروں کے لیے مہمان خانہ تعمیر کرایا - ان کی وفات کے بعد حضرت عمر کی خلافت کے آخری سال انہیں کے بیٹے عثمان بن قیس کو مصر کی قضا کا کام سونپا گیا - اس عہدے پر وہ ۴۲ھ تک فائز رہے - وہ زمانہ حضرت معاویہ کی خلافت کا تھا - حذافہ بن قیس بن عدی کے دو بیٹوں، قیس اور عبداللہ کا شمار بھی بنو سہم کے سر کردہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ یہ دونوں ابتدائی مسلمانوں میں سے تھے - انہیں رسول اللہ کی لمبی صحبت اور حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کا شرف حاصل ہے - عبداللہ ھی کسریٰ، شہنشاہ ایران کے پاس رسول اللہ کا تبلیغی خط لے کر گئے تھے -

چنانچہ اس قبیلے میں جو نامور شخص گزرے ان کی ترقی میں ان کی خاندانی صفات کا بہت زیادہ دخل تھا۔ عمرو بن العاص کو بھی ان خصائل ستودہ میں سے کثیر حصہ ملا - دور اندیشی، عقلمندی، شجاعت، عالی همتی، فصاحت وغیرہ، جن جن اوصاف عالیہ سے آپ متصف تھے وہ سب آپ کو اپنے آبا و اجداد سے ورثے میں ملے تھے -

ب : خاندان

(۱) والد : عاص بن وائل بن سعید بن سہم بن عمرو بن ھصیص بن کعب السہمی القرشی کا شمار عرب کے سرداروں اور اعیان و اشراف میں ھوتاتھا ۔ ھجرت سے قبل جنگ فجار ثانی میں بنو سہم کی کمان عاص کے سپرد تھی ۔ آنھوں نے اسلام کا زمانه آنکھوں سے دیکھا لیکن آن کی بد قسمتی تھی که اسلام قبول کرنے کی توفیق نه ملی ۔ رسول اللہ کا مذاق آڑانے ، اور آپ کو اور آپ کے صحابه کو دکھ دینے میں ھمیشه پیش پیش رھتے تھے ۔ جب رسول اللہ کے دو لڑکے ، قاسم ارو عبداللہ یکے بعد دیگرے وفات پا گئے تو آنھوں نے کہا تھا که " لو ! محمد ابتر رہ گئے * ۔" اس پر اللہ تعالی نے ان کے متعلق ' ان شانئک ھوالابتر ' کی آیت نازل فرمائی ۔ ابن اثیر کی روایت کے مطابق ان کا انتقال پچاسی برس کی عمر میں ھجرت سے ایک ماہ بعد ھؤا † ۔

جاھلیت کے زمانے میں عاص مکه کے بہت بڑے تاجر اور مالدار شخص گنے جاتے تھے ۔ ان کے قافلے یمن ، حبشه اور شام جاتے رھتے تھے اور یمن سے چمڑا اور حبشه سے خوشبویات لےجا کر شام میں اور شام سے کشمش ، انجیر وغیرہ لے جا کر یمن اور حبشه میں فروخت کیا کرتے تھے ۔

ایک دفعه یمن کے قبیلے ' زبید ' کے ایک شخص سے عاص نے

---

* ابن اسحاق کہتے ھیں که عاص نے یه الفاظ قاسم اور عبداللہ کی وفات پر کہے تھے لیکن ابن اثیر لکھتے ھیں که یه الفاظ انھوں نے ابراھیم کی وفات کے بعد کہے ۔ تاھم مستند روایت ابن اسحاق ھی کی ھے ۔

† کامل ابن اثیر ، جلد ۲ ، صفحه ۲۹

کچھ مال خریدا لیکن اس کی قیمت ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتے رہے ۔ کافی انتظار اور بار بار کے تقاضوں کے بعد جب زبیدی شخص کو صبر کا یارا نہ رہا تو وہ ایسے وقت جب قریش خانہ کعبہ میں جمع تھے جبل ابوقبیس پر چڑھا اور بلند آواز سے یہ اشعار پڑھنے شروع کیے :

" اے لوگو ! تم اس مظلوم شخص کی مدد کے لیے کیوں آگے نہیں بڑھتے جو اپنے وطن اور قبیلے سے کوسوں دور پڑا ہے اور جس پر تمھارے ہی قبیلے کے ایک فرد نے ظلم کیا ہے ۔ عجیب بات ہے کہ اہل مکہ حرم میں رہنے کے باعث ہر قسم کی باز پرس سے آزاد ہو چکے ہیں ۔ لیکن حرم کے اندر اگر مجھ جیسے کسی اجنبی شخص پر ظلم و ستم ڈھایا جائے اور اسے دھوکا دیا جائے تو اس کے حال زار پر کوئی توجہ نہیں کی جاتی اور اس کے مال اور عزت کی حرمت کو علی‌الاعلان توڑا جاتا ہے ۔"

یہ اشعار سن کر اہل مکہ کے دلوں پر بہت اثر ہؤا اور ان کے بعض قبائل نے عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہو کر عہد کیا کہ اگر وہ کسی مظلوم شخص کو بے کسی کی حالت میں دیکھیں گے تو بے یار و مددگار نہ چھوڑیں گے بلکہ اس کے ساتھ مل کر ظالم سے اس کے ظلم کا بدلہ لیں گے ۔ یہ معاہدہ تاریخ میں حلف‌الفضول کے نام سے مشہور ہے ۔ رسول‌اللہ بھی اس معاہدے میں شریک تھے ۔

یاقوت حموی نے معجم الادباء میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سعید بن المسیب * مکہ کی گلیوں سے گزر رہے تھے ۔ انھوں نے

---

* سعید بن‌المسیب حضرت عمرفاروق کی وفات کے تیسرے سال پیدا ہوئے ۔ انھوں نے اگرعاص کے گھر میں کچھ سنا ہوگا تو عاص کی وفات سے نصف صدی سے زیادہ عرصے کے بعدھی سنا ہوگا ۔

سنا کہ عاص بن وائل کے گھر میں محفل جمی ہوئی ہے اور کوئی بڑی پر سوز لے میں گا رہا ہے ۔ وہ کافی دیر تک کھڑے گانا سنتے رہے ۔ آخر میں انھوں نے پاؤں زمین پر مارتے ہوئے کہا ''واللہ! اس گانے کا کہیں جواب نہیں ۔''

یہ واقعہ درج کرنے سے صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ بنو العاص بن وائل موسیقی کے شوقین اور ادب کے دلدادہ تھے ۔ بنو سہم اکثر شاعری کا ذوق رکھتے تھے اور بہت اچھے شعر کہہ لیتے تھے ۔ عمرو بن العاص بھی ان میں شامل تھے (آن کی شاعری کا مفصل تذکرہ آگے آئے گا) ۔ ہو سکتا ہے کہ سعید بن المسیب نے یہ گانا عاص کے گھر کی کسی لونڈی یا ان کے کسی بیٹے سے سنا ہو ۔

عاص کی دو بیویاں تھیں ۔ ایک سلمیٰ نابغہ ، ان سے عمرو بن العاص پیدا ہوئے ۔ دوسری ام حرملہ جو حضرت عمر بن الخطاب کی خالہ تھیں ، ان کے بطن سے ہشام بن عاص کی ولادت ہوئی ۔ عمرو بن العاص بڑے تھے اور ہشام بن العاص چھوٹے ۔

(۲) والدہ : ایک مرتبہ کسی شخص نے عمرو بن العاص سے آپ کی والدہ کے متعلق دریافت کیا ۔ آپ نے فرمایا '' میری والدہ کا نام سلمیٰ بنت حرملہ تھا ۔ لقب نابغہ تھا اور وہ قبیلہ بنو عذرہ*

* بنو عذرہ ، بنو قحطان کے قبیلہ قضاعہ کی ایک شاخ تھے ۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے : بنو عذرہ بن سعد هذیم بن لیث بن اسود بن اسلم بن حانی بن قضاعہ ۔ قضاعہ کے متعدد قبائل اس علاقے میں رہتے تھے جو ارض حجاز کے شمال میں مدینہ اور ینبع کے درمیان واقع ہے ۔ بنو عذرہ کے گاؤں ، ذات القری کے قریب اس سے ذرا ہٹ کر واقع تھے ۔ ان کے اور مدینہ کے درمیان دس دن کی مسافت کا فاصلہ تھا ۔

سے تعلق رکھتی تھیں ۔ ایک مرتبہ قبیلے پر بعض بدوؤں نے ڈاکا ڈالا اور انھیں پکڑ کر همراہ لے گئے اور فاکہ بن مغیرہ کے هاتھ بیچ ڈالا ۔ انھوں نے انھیں عبداللہ بن جدعان کے هاتھ فروخت کر دیا ۔ عبداللہ بن جدعان کے پاس سے وہ میرے والد عاص بن وائل کے پاس آئیں اور ان سے اولاد پیدا هوئی ۔"

به خلاف اس کے ابوالعباس المبرد مؤلف کتاب الکامل نے اپنی کتاب (صفحہ ۲۷۴) میں لکھا ھے کہ ایک مرتبہ عمرو بن العاص سے ان کی والدہ کے متعلق دریافت کیا گیا لیکن انھوں نے ٹال دیا اور کچھ نہ بتایا ۔ بعد میں مصر کی گورنری کے زمانے میں ایک شخص آپ کے پاس آیا اور وهی سوال آپ سے کیا کہ میں امیر کی والدہ کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاهتا هوں ۔ آپ نے جواب دیا " وہ قبیلہ عنزہ* سے تعلق رکھتی تھیں ، نام سلمیٰ تھا اور لقب نابغہ ۔"

ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ آپ افضل هیں یا آپ کے بھائی هشام ؟ تو آپ نے جواب دیا تھا " هشام کو مجھ پر چار باتوں میں فضیلت حاصل ھے ۔ ان کی والدہ هشام بن مغیرہ کی بیٹی تھیں اور میری والدہ عنزیہ ۔ وہ میرے والد کو میری نسبت زیادہ محبوب تھے ۔ وہ مجھ سے پہلے اسلام لائے ۔ انھوں نے شہادت حاصل کی اور میں اس دنیا کی خاک چھاننے کے لیے باقی رہ گیا (کتاب المعارف لابن قتیبہ ، صفحہ ۹۶)

---

* عنزہ ، قبیلہ اسد بن ربیعہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان کی بستیاں صحرائے عین التمر کے قریب انبار سے تین منزل کے فاصلے پر واقع تھیں ۔ اور بعد میں یہ لوگ خیبر کے نواح میں آ کر آباد هو گئے تھے ۔

ج : ولادت

مؤرخین کے پاس کوئی ایسا قطعی ثبوت نہیں جس سے آپ کے سال ولادت کا صحیح علم ہو سکے - عمر کا صحیح علم بھی اسی وجہ سے نہیں ہو سکا کہ اس کی بنیاد بھی آپ کے سن ولادت پر ہے -

ابن حجر نے اپنی کتاب (الاصابہ فی تمییز الصحابہ ، جلد ٥ ، صفحہ ٣) میں لکھا ہے کہ عمرو بن العاص حضرت عمر بن الخطاب سے سات سال بڑے تھے اور آپ کی وفات حضرت عمر کی وفات کے بیس سال بعد (٤٣ھ میں) ہوئی -

ابن خلکان ، واقدی اور ابن حجر نے بھی یحییٰ بن بکیر کی روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ عمرو بن العاص نوے سال کی عمر کو پہنچے - عجلی نے لکھا ہے کہ آپ نے ننانوے برس کی عمر پائی (الاصابہ ، جلد ٥ ، صفحہ ٣)- ابن قتیبہ اپنی کتاب (المعارف ، صفحہ ٩٧) میں لکھتے ہیں کہ " آپ کی وفات تہتر سال کی عمر میں ٤٢ھ یا ٤٣ھ یا ٥١ھ میں ہوئی - آپ کے بیٹے عبداللہ کی وفات ٦٥ھ میں بہتر سال کی عمر میں ہوئی اور وہ اپنے والد سے بارہ سال چھوٹے تھے -"

اگر ابن قتیبہ کی روایت صحیح ہو تو عبداللہ کی ولادت ٧ قبل ھجرت (٦١٥ ء) میں اور عمرو بن العاص کی ولادت ١٩ قبل ھجرت (٦٠٩ ء) میں ماننی پڑے گی - اگر آپ کا سن وفات ٤٣ھ مانا جائے تو آپ کی عمر باسٹھ سال اوراگر ٥١ھ مانا جائے تو ستر سال بنتی ہے -

ابن قتیبہ حضرت عمر فاروق کی عمر پچپن سال بتاتے ہیں اور واقدی تریسٹھ سال - اگر یہ روایت تسلیم کر لی جائے

کہ عمرو بن العاص حضرت عمر فاروق سے سات سال بڑے تھے تو ابن قتیبہ کی روایت کی رو سے حضرت عمر فاروق کی ولادت ۳۲ قبل ھجرت (۵۷۴ء) میں اور عمرو بن العاص کی ولادت ۳۹ قبل ھجرت (۵۸۱ء) میں بنتی ھے اور وفات کے وقت آپ کی عمر (۴۳ھ سن وفات تسلیم کر لینے کے مطابق) بیاسی سال - اگر واقدی کی یہ روایت تسلیم کی جائے کہ حضرت عمر فاروق کی عمر تریسٹھ برس کی تھی تو حضرت عمر کی ولادت ۴۰ قبل ھجرت (۵۸۲ء) میں اور عمرو بن العاص کی ولادت ۴۷ قبل ھجرت (۵۷۰ء) میں ھے اور وفات کے وقت آپ کی عمر نوے سال کی ھوتی ھے -

ان حوالوں کی روشنی میں بھی ھم کوئی قطعی نتیجہ نہیں نکال سکتے کیونکہ :

(۱) اول تو حضرت عمر فاروق کی عمر کے بارے میں بھی مؤرخین میں اختلاف ھے - بعض کہتے ھیں کہ آپ تریسٹھ سال کی عمر میں فوت ھوئے اور بعض کہتے ھیں پچپن برس کی عمر میں۔

(۲) اسی طرح عمرو بن العاص کے بیٹے عبداللہ کے متعلق ابن قتیبہ لکھتے ھیں کہ وہ ۶۴ ھ میں فوت ھوئے - اسدالغابہ (جلد۳، صفحہ ۲۳۳) میں سال وفات ۶۳ھ لکھا ھے - ان کےعلاوہ بعض مؤرخین لکھتے ھیں کہ آپ نے ۶۵ھ میں بمقام مصر وفات پائی - بعض لکھتے ھیں کہ ۶۷ھ میں بمقام مکہ فوت ھوئے - بعض کا کہنا ھےکہ ۵۵ھ میں بمقام طائف وفات پائی - بعض کے قول کے مطابق سن وفات ۶۸ھ ھے - ان متناقص روایات کی موجودگی میں ھم عمرو بن العاص کی عمر کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہ سکتے البتہ ھمارا خیال یہ ھے کہ آپ کی عمر نوے برس کے لگ بھگ ھوئی ھے -

ان مختلف بیانات کے علاوہ ابوالمحاسن نے آپ کی عمر ننانوے

سال بتائی ہے ۔ بعض لوگوں نے سو سال لکھی ہے ۔ نووی نے ستر سال عمر لکھی ہے ۔

مشہور مستشرق بٹلر نے دیگر اقوال پر نووی کے قول کو ترجیح دی ہے اور اپنی تائید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کیئے ہیں :

(۱) اگر آپ کی عمر نوے سال مانی جائے تو ماننا پڑے گا کہ آپ نے مصر چھیاسٹھ برس کی عمر میں فتح کیا ۔ یہ عمر ایسی ہوتی ہے جب انسانی قویٰ بالعموم کام سے جواب دینے لگتے ہیں ۔ عمرو بن العاص کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس عمر میں سفر اور جنگ کی صعوبتیں جھیلتے اور فوجیں لے کر دور دراز علاقوں میں پہنچتے ۔

(۲) اسی طرح جنگ صفین اور تحکیم کے مواقع پر بھی آپ کے لیے اس قدر سرگرمی دکھانا ممکن نہ تھا جس قدر سرگرمی آپ نے دکھائی جب کہ آپ کی عمر پچاسی برس سے بھی متجاوز ہو چکی تھی ۔

بٹلر کا خیال ہے کہ بعد میں آنے والے مؤرخین کو سبعین (ستر) اور تسعین (نوے) کی ظاہری صورت میں مشابہت کی وجہ سے مغالطہ ہؤا ہے اور اسی مغالطے کے باعث انہوں نے آپ کی عمر سبعین کے بجائے تسعین لکھ دی (The Arab Conquest of Egypt-Page 548)

نہ معلوم بٹلر چھیاسٹھ سال کی عمر میں فتح مصر جیسے عظیم الشان کام کو محال کیوں سمجھتا ہے ؟ حالانکہ جنگ عظیم (اول) کے دوران میں ہنڈ نبرگ ، مولٹک ، ٹرپٹر ، فوش ، جوفر اور فرنش جیسے متعدد کمانڈر ایسے تھے جن کی عمریں ساٹھ سال

سے متجاوز ہوگئی تھیں لیکن پیرانہ سالی کے باوجود انھوں نے بڑے بڑے لشکروں کی کمان کی اور بڑی بے جگری سے لڑے ۔ کلیمانصو جیسا شخص جس نے جنگ کے سارے عرصے میں فرانسیسی فوج کی قیادت اپنے ہاتھ میں رکھی اور اس دوران میں بڑے بڑے معرکے انجام دیے اس وقت(۱۹۲۱ء میں) ستر سال سے زیادہ عمر کا ہے ۔ اب بھی کہ اس کی پیرانہ سالی حد سے بڑھ چکی ہے وہ برابر فرانس کے مشرقی مقبوضات کا دورہ کرتا رہتا ہے اور فرانسیسی استعماریت کی مضبوطی کے لیے ہر دم کوشاں رہتا ہے ۔

علاوہ بریں تاریخ میں عربوں کے بے شمار ایسے سپہ سالاروں کے نام محفوظ ہیں جنھوں نے انتہائی پیرانہ سالی کے باوجود میدان جنگ میں داد شجاعت دی ۔ انھیں میں سے ایک شخص عمرو بن معدیکرب الزبیدی ہیں جنھوں نے جنگ قادسیہ میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو کبھی فراموش نہیں کیے جا سکتے ۔ اس وقت ان کی عمر سو برس کے لگ بھگ تھی لیکن جرأت و ہمت اور بہادری و شجاعت کے لحاظ سے وہ سیکڑوں نوجوانوں سے بہتر تھے ۔

ان شواہد کی موجودگی میں بٹلر کا یہ گمان بالکل بے بنیاد ثابت ہوتا ہے کہ عمرو بن العاص ، فتح مصر کی عظیم الشان مہم چھیاسٹھ برس کی عمر میں کسی طرح انجام نہ دے سکتے تھے ۔

رہا ابن قتیبہ کا یہ قول کہ عمرو بن العاص اپنے بیٹے عبداللہ سے صرف بارہ برس بڑے تھے یہ بھی بظاہر عقل کے خلاف دکھائی دیتا ہے ۔ اس لیے اس روایت کی صحت میں بھی کچھ شک و شبہ کی گنجائش ہے ۔ لے دے کر ہمارے لیے صرف یہی راستہ باقی رہ جاتا ہے کہ ہم آپ کی عمر نوے سال یا ایک دو برس کم و بیش تصور کریں ۔

د : تربیت

عاص بن وائل کا گھرانا قریش کے معزز ترین گھرانوں میں سے تھا - عمرو بن العاص کے بچپن کا زمانہ ان ہمجولیوں کے ساتھ گزرا جو مکہ کے بڑے بڑے اعیان و اشراف کے فرزند تھے - وہ لوگ اپنے بچوں کی تربیت کا خاص خیال رکھتے تھے اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتے تھے کہ ان کا بچہ بڑا ہو کر اوصاف حمیدہ اور خصائل جمیلہ سے متصف ہو تاکہ وہ ان کے لیے دائمی فخر کا باعث بنے - وہ مکہ کے رهنے والے تھے جو حجاز کا تجارتی ، مذهبی اور شعر و سخن کا مرکز تھا - حج اور میلوں کے ایام میں ہر چہار طرف سے لوگ کھچ کھچ کر وهاں چلے آتے تھے - ان ایام میں اهل عرب کو فخر و مباهات کے لیے بڑا زریں موقع ملتا تھا - جا بجا شعر و شاعری اور خطابت کی مجلسیں منعقد هوتی تھیں جن میں وہ اپنی بہادری ، مہمان نوازی اور حسب و نسب کی فضیلت کا ڈھنڈورا بڑے زور سے پیٹتے تھے - ان اجتماعات کا اثر ان کی اولاد پر پڑنا لازم تھا - جب وہ اپنے بزرگوں کی زبان سے اپنی فضیلت کے تذکرے سنتے تھے تو ان کے دلوں میں بھی قدرتی طور پر ان عادات و خصائل کو اختیار کرنے کا جذبہ موجزن هوتا تھا جن کے باعث ان کے آبا و اجداد نے فضیلت ، ناموری ، عزت اور وجاهت حاصل کی تھی -

عمرو بن العاص کی علمی تربیت کے بارے میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کیونکہ باقاعدہ علمی تربیت کا اس زمانے میں نام و نشان نہ تھا ، اور نہ عربوں کو اس زمانے کے مروجہ علوم سے کسی قسم کا تعلق تھا - پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا

جا سکتا کہ عمرو بن العاص لکھنا پڑھنا بخوبی جانتے تھے ۔ مگر مؤرخین یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ آپ نے لکھنا پڑھنا کب اور کہاں سیکھا ؟ ہمارے خیال میں لکھنا پڑھنا آپ نے جوانی میں سیکھا جب آپ تجارتی میدان میں قدم رکھ چکے تھے ۔ مکہ والوں کے ہاں اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے کوئی ذریعہ موجود نہ تھا ۔ البتہ اگر کسی شخص کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو وہ اپنے طور پر انتظام کر کے سیکھتا تھا ۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن العاص کو شعر گوئی کا بھی بہت شوق تھا۔ آپ سے متعدد بہترین اشعار منقول ہیں ۔ عرب میں آپ کی فصاحت و بلاغت اور طلاقت لسانی کی دھوم تھی۔ حضرت معاویہ نے ایک بار ان سے عبداللہ بن ہاشم بن عتبہ بن مالک بن ابی وقاص کے بارے میں مشورہ کیا ۔ عبداللہ کے باپ ہاشم جنگ صفین کے موقع پر حضرت علی کی حمایت میں معاویہ سے لڑ چکے تھے ۔ عمرو بن العاص نے مشورہ دیا کہ عبداللہ کو قتل کر دیا جائے ۔ لیکن حضرت معاویہ نے در گزر سے کام لیا ۔ اس پر عمرو بن العاص ناراض ہو کر ان کے پاس سے چلے آئے اور انہیں یہ اشعار لکھ بھیجے :

امر تک امراً حازماً فعصیتنی ۔
وکان من التوفیق قتل ابن ہاشم
الیس ابوہ یا معاویۃ الذی
اعان علینا یوم حزالغلاصم
فقاتلنا حتی جری من دمائنا
بصفین امثال البحور الخضارم
وھذا ابنہ و المرء یشبہ عیصہ
و تو شک ان تلقی بہ جد نادم

(میں نے آپ کو درست مشورہ دیا لیکن آپ نے میرے مشورے کو ٹھکرا دیا ۔ حالانکہ آپ چاہتے تو بڑی آسانی سے ابن ہاشم کو قتل کر سکتے تھے ۔ اے معاویہ ! کیا اس کا باپ وہی نہیں جس نے اس روز ہمارے دشمنوں کی مدد کی جب بڑے بڑے سردار موت کے گھاٹ اتارے جا رہے تھے ۔ وہ صفین میں ہم سے بےجگری سے لڑا جہاں ہمارے لہو سے میدان جنگ ایک بحر زخار کی شکل میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یہ اسی شخص کا بیٹا ہے اور قطعی اپنے باپ سے مشابہ ۔ یقیناً آپ کو ایک دن اس عفو و ترحم کے بدلے ندامت سے دو چار ہونا پڑے گا)

عمرو بن العاص کی فصاحت و بلاغت کے بہترین نمونے ہمیں آپ کے خطبات اور خطوط میں ملتے ہیں ۔ آپ کے بیان کردہ اقوال سے آپ کے محکم یقین، پیہم عمل ، اخلاص اور صدق و صفا کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے ۔ کہیں آپ قومی اجتماعات کے موقعوں پر فصیح و بلیغ خطبوں میں رعایا کو سعی و ہمت اور ترقی کی طرف توجہ دلاتے نظر آتے ہیں اور کہیں رزم گاہوں میں فوجوں کے سامنے دھواں دھار تقریریں کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ آپ کی نثر بھی بلاغت اور اثر انگیزی میں شعر سے کسی طرح کم نہیں ۔ یورپ کے ایک فاضل نے آپ کے اس خط کو جو آپ نے حضرت عمر فاروق کو مصر کے حالات کے بارے میں لکھا تھا بلاغت کا حیرت انگیز نمونہ اور ادبی معجزہ قرار دیا (اس خط کا ذکر آگے آئے گا)۔

عمرو بن العاص کے بیان کردہ اقوال سے ہمیں واضح طور پر آپ کی ذاتی صلاحیتوں کا علم ہو جاتا ہے ۔ آپ کے اقوال ، آپ کی عقل و فراست ، جودت طبع ، اصابت رائے اور دور اندیشی پر برھان قاطع ہیں ۔ چند اقوال ملاحظہ ہوں ۔

آپ فرماتے ہیں : ” عاقل وہ نہیں جو خیر و شر کی تمیز رکھتا ہو بلکہ وہ ہے جو یہ جانتا ہو کہ دو برائیوں میں سے کون سی نسبتاً کم بری ہے ۔“

ابن عساکر روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت معاویہ سے کہا ” نیک شخص اس وقت حملہ کرتا ہے جب وہ بھوکا ہوتا ہے اور کمینہ اس وقت حملہ کرتا ہے جب اس کا پیٹ بھرا ہؤا ہوتا ہے اس لیے نیک آدمی کی بھوک دور کرو اور کمینے کو قابو میں رکھو ۔“

ہشام کلبی بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ نے عمرو بن العاص سے پوچھا ” لوگوں میں سب سے زیادہ سخی کون ہے ؟“ آپ نے جواب دیا ” جو شخص اپنی دنیا اپنے دین کی بہتری میں خرچ کرے ۔“ انھوں نے پھر پوچھا ” سب سے زیادہ شجاع کون ہے ؟“ آپ نے جواب دیا ” جو شخص حلم سے اپنی جہالت پر غالب آ جائے ۔“

مؤلف کتاب ’ سراج الملوک ‘ نے آپ کا یہ قول درج کیا ہے ” ایک ہزار لائقوں کے مر جانے سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا جتنا ایک نالائق کے صاحب اختیار ہونے سے ۔“

مبرد نے اپنی کتاب ’ کامل ‘ (صفحہ ۲۸) میں لکھا ہے کہ عمرو بن العاص نے عبدالملک بن مروان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے حضرت معاویہ سے کہا ” میں نے تین باتیں اختیار کر رکھی ہیں اور تین باتوں کو ترک کر رکھا ہے ۔ جو باتیں اختیار کر رکھی ہیں وہ یہ ہیں (۱) میں لوگوں کے دل ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتا ہوں ۔ (۲) ہر شخص کی بات کان دھر کر سنتا ہوں ۔ (۳) جب کسی امر میں اختلاف پیدا ہو جائے تو

جو امر زیادہ سہل ہوتا ہے اسے اختیار کرتا ہوں - جن باتوں کو ترک کر دیا ہے وہ یہ ہیں (۱) جھگڑے سے ہمیشہ پرہیز کرتا ہوں۔ (۲) کمینے کی صحبت کبھی اختیار نہیں کرتا۔ (۳) ہر ایسی بات سے بچتا ہوں جس کے متعلق مجھے بعد میں عذر و معذرت پیش کرنی پڑے - میری مثال اس شعر جیسی ہے :

فقلت لہ تجنب کل شیئ یعاب علیک ان الحر حر

(میں نے اس سے کہا ، تو ہر ایسی چیز سے پرہیز کر جس کی وجہ سے بعد میں تجھ پر عیب لگایا جائے - یاد رکھ کہ شریف آدمی ہمیشہ وہی کام کرتا ہے جو فی الواقع شرفاء کر زیب دیتے ہیں)

مصر کی امارت کے زمانے میں ایک مرتبہ آپ ایسے خچر پر سوار ہوئے جو بے حد بوڑھا ہو چکا تھا - لوگوں نے آپ سے کہا " آپ امیر ہیں اس کے باوجود ایسے خچر پر سوار ہوتے ہیں۔" آپ نے جواب دیا "جب تک جانور میرا بوجھ اٹھاتا رہے ، جب تک بیوی مجھ سے خوش اخلاق اور حسن سلوک سے پیش آتی رہے ، اور جب تک دوست میرے راز کی حفاظت کرتا رہے اس وقت تک میں ان تینوں سے ملول نہیں ہوتا - ملول ہونا چھوٹے اخلاق میں سے ہے -"

ایک دفعہ آپ نے فرمایا " اگر میں اپنا راز اپنے دوست کے سامنے ظاہر کر دوں ، اور وہ اسے فاش کر دے تو اسے اس کا حق ہے ، اور اس وقت قابل ملامت میں ہوں گا نہ کہ وہ -" لوگوں نے دریافت کیا " یہ کیونکر ؟" آپ نے فرمایا اپنے راز کی حفاظت کی ذمہ داری سب سے زیادہ مجھ پر عاعد ہوتی ہے -"

ایک مرتبہ اسکندریہ میں آپ کی محفل میں کسی شخص نے نے کہا " ہمیں خبر ملی ہے کہ آج رات چاند گہن ہو گا -

ایک صحابی پاس بیٹھے تھے ، آنھوں نے فرمایا ” جو شخص ایسا کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے ۔ لوگوں کو زمین کے احوال کی تو خبر نہیں ، آسمان کے احوال کی خبر کہاں سے مل گئی ؟“ یہ سن کر آپ نے فرمایا ”غیب تو صرف پانچ ھیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں فرمایا ہے ۔ ان کے علاوہ جو باتیں ھیں انھیں انسان عقل سے معلوم کر سکتا ہے ۔“ یہ کہ کر آپ نے یہ آیت پڑھی :

ان اللہ عندہ علم الساعۃ و ینزل الغیث ویعلم ما فی الارحام و ما تدری نفس ماذا تکسب غداً وما تدری نفس بای ارض تموت ۔ ان اللہ علیم خبیر ۔

(بے شک اللہ تعالیٰ ھی کو قیامت کا علم ہے ، وہ پانی برساتا ہے اور جانتا ہے اسے جو عورتوں کے رحم میں ہے ۔ کوئی شخص نہیں جانتا کہ کل اسے کیا پیش آئے گا اور نہ کسی کو یہ علم ھی ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا ۔ بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے)

اس واقعے سے ظاھر ھوتا ہے کہ عمرو بن العاص کو قرآن کریم پر کس قدر عبور حاصل تھا ۔ آپ نے بحث و مباحثہ میں پڑنا نہ چاھا بلکہ قرآن کریم ھی کی ایک آیت کے ذریعے سے صحابی پر واضح کر دیا کہ غیب کی ایک حد ھوتی ہے ۔ ان حدود کو چھوڑ کر اگر عقل انسانی غور و فکر سے کام لے تو اسے اسرار قدرت اور مُتعدد مخفی خزانوں سے آگاھی حاصل ھو سکتی ہے ۔

بچپن سے تجارت کے شوق اور شام ، حبشہ اور مصر کی طرف کثرت سے سفر اور مختلف اقوام سے میل جول کے باعث عمرو بن العاص کو ان اقوام کے اجتماعی اور سماجی احوال معلوم کرنے کا بہت اچھی طرح موقع مل گیا ۔ اس نے ان کی عقل کو صیقل اور ذھنی

صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بڑی مدد دی ۔ آپ کی سیرت کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آپ محض ایک تاجر ہی نہ تھے بلکہ با کمال شاعر ، بے نظیر سیاست دان اور ماہر سپہ سالار بھی تھے ۔ اسی وجہ سے آپ کا شمار عرب کے نہایت عقلمند ، صائب الرائے اور بہادر اشخاص میں کیا جاتا تھا ۔

عمرو بن العاص کو جہاں شجاعت ، بہادری اور جرأت وہمت سے حصۂ وافر ملا تھا وہاں آپ علم ، حکمت ، عقلمندی ، عزیمت اور دیگر صفات عالیہ سے بھی متصف تھے ۔ جو کمالات آپ کی ذات میں جمع تھے وہ مشاہیر عالم میں سے بہت کم لوگوں کے حصے میں آئے ہیں ۔ انہیں صفات کی وجہ سے آپ اپنی قوم میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے ، اور انہیں اخلاق کے باعث آپ سے وہ عظیم الشان کارہائے نمایاں صادر ہوئے جنھوں نے آپ کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا ۔

۲ : پیشہ

مکہ کی سر زمین پتھریلی تھی اور زراعت کے قطعاً ناقابل ۔ قریش کی شہرت مکہ سے نکل کر دور دور تک پھیلی ہوئی تھی ۔ وہ قبائل عرب میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے ۔ خانۂ کعبہ کے محافظ اور متولی ہونے کی وجہ سے عرب کے تمام قبائل ان کا غایت درجہ احترام کرتے تھے ۔ مکہ کی زمین ناقابل زراعت تھی اس وجہ سے قریش زراعت کا پیشہ اختیار نہ کرسکتے تھے لیکن خوش قسمتی سے مکہ کی جغرافیائی حیثیت تجارت کے میدان میں ان کی ترقی کے لیے بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی ۔ مکہ کا شہر ان قافلوں کے راستے میں پڑتا تھا جو تجارت کے لیے یمن ، شام اور حبشہ جایا کرتے تھے ۔ مکہ والوں نے

اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تجارت شروع کردی - جدہ کی بندر گاہ جو مکہ سے چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے عرب اور حبشہ کے درمیان تجارت کا ذریعہ تھی - وہ لوگ حبشہ سے تجارتی چیزیں جزیرۂ عرب میں لاکر بحرین میں قطیف تک جاتے تھے ، اور وہاں سے موتی لے کر (جو خلیج فارس کے ساحل پر نکالے جاتے تھے) دریائے فرات تک پہنچتے تھے - اس لیے مکہ ، یمن اور شام کے تجارتی راستے کے درمیان ہونے کی وجہ سے تجارتی مرکز بن گیا تھا - قریش کے قافلے صنعاء کے بازاروں اور عمان و یمن کے علاقوں سے عطریات لے جاکر بصریٰ اور شام میں فروخت کرتے تھے ، اور بصریٰ اور دمشق کے بازاروں سے گیہوں اور مصنوعات خرید کر صنعاء ، عمان اور یمن میں بیچتے تھے - اس طرح اس بین المملکتی تجارت پر قریش پوری طرح حاوی تھے - حج کے دنوں میں حجاج بھی اپنے اپنے علاقوں کی چیزیں لا کر مکہ میں فروخت کیا کرتے تھے - چنانچہ کعبہ کی بدولت مکہ کے لوگوں کو ہر قسم کی چیزیں بہ‌فراط مل جایا کرتی تھیں - اگر کعبہ کا وجود نہ ہوتا تو اہل مکہ کے لیے اس ناقابل زراعت وادی میں زندگی گزارنا قطعاً ناممکن ہو جاتا -

تجارتی سفروں اور عراق و شام کی متمدن سلطنتوں اور بلاد حبشہ و یمن کے لوگوں سے بکثرت میل جول کے باعث قریش کے تجربات اور ذکاوت و فطانت میں بے حد اضافہ ہؤا اور وہ علم و فضل ، فہم و فراست اور دولت مندی میں تمام قبائل عرب سے بازی لے گئے - تجارت کے لیے وہ سال میں دو بار مکہ سے نکلا کرتے تھے - سردیوں میں ان کا سفر یمن کی جانب ہوتا تھا اور گرمیوں میں شام کی طرف - عرب کی زمین حد درجہ سنگلاخ تھی اور سارا ملک لق و دق صحراؤں ، بے آب و گیاہ وادیوں اور

جلی ہوئی پہاڑیوں پر مشتمل تھا ۔ اہل شام اور اہل حبشہ کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ان سیکڑوں میل لمبے چوڑے لق و دق صحراؤں کو عبور کر کے تجارت کا کوئی راستہ نکالتے جہاں قدم قدم پر ان کے لیے مشکلات اور بدوی ڈاکوؤں کے حملوں کا خوف دامن گیر رہتا تھا ۔ لیکن قریش کے لیے کسی قسم کی مشکلات نہ تھیں ۔ وہ ان صحرائی راستوں پر سفر کرنے کے عادی تھے ، اور ارض مقدس کے باشندے ہونے کی وجہ سے انھیں ڈاکوؤں اور رہزنوں کا بھی کوئی خوف نہ تھا ۔ چنانچہ ان قدرتی مواقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے یمن ، شام اور حبشہ کی تجارت پر قبضہ کر لیا ۔

تجارت کا پیشہ اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے دوسرے مشاغل کو ترک نہ کیا ۔ شہسواری اور فنون جنگ سے انھیں غیر معمولی شغف تھا اور شرفاء اور معززین کے بچے بچپن ہی سے تجارت کے ساتھ سپہ گری اور شہسواری کی مشق بھی جاری رکھتے تھے ، اور اسے اپنے لیے انتہائی فخر کا موجب سمجھتے تھے* ۔

عمرو بن العاص جو ایک بڑے سردار کے فرزند تھے جاہلیت میں بہت بڑے تاجر تھے اور یمن اور حبشہ سے چیزیں منگوا کر شام میں اور شام سے چیزیں منگرا کر یمن اور حبشہ میں بھیجتے رہتے تھے ۔ یمن سے چمڑا منگوا کر حبشہ میں بیچتے تھے ، اور حبشہ سے خوشبوئیات ، شام سے کشمش اور انجیر و غیرہ منگوا کر یمن میں فروخت کرتے تھے ۔ کندی لکھتا ہے کہ "عمرو بن العاص اپنا مال تجارت لے کر جو چمڑے اور عطریات پر مشتمل ہوتا تھا اکثر مصر جایا کرتے تھے ۔" اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست

* زوال سلطنت روما از 'گبن' جلد ۹ ، صفحہ ۹۴

نہیں کہ آپ کا سارا مال تجارت صرف چمڑے اور عطریات پرمشتمل ہوتا تھا بلکہ اصل مطلب یہ ہے کہ انواع و اقسام کے سامان میں جو عمرو بن العاص اپنے ساتھ لے کر شام ، حبشہ ، یمن اور مصر جایا کرتے تھے چمڑا اور عطر خصوصیت سے ہوتے تھے ۔

تجارت کے پیشے نے عمرو بن العاص کو بے شمار مادی اور سماجی فوائد سے بہرہ مند کر دیا تھا ۔ تجارت کے لیے بار بار غیر ممالک میں جانے اور تہذیب و تمدن کی حامل اقوام سے میل جول کے نتیجے میں آپ کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے میں بڑی مدد ملی ۔ آپ کی نظر میں وسعت اور ذہن میں جلاء پیدا ہوئی ۔ آگے چل کر آپ نے سیاسی اور جنگی میدانوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور جس طرح بے نظیر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا وہ سب تجارت کے سلسلے میں بیرونی ممالک میں جانے اور غیر اقوام سے میل جول کا نتیجہ تھا ۔ ان سفروں نے آپ کی ذکاوت و فطانت میں غیر معمولی اضافہ کردیا تھا، اور آپ کی عقل مندی عرب میں بطور ضرب المثل بیان کی جانے لگی تھی ۔

س : سفر

سیوطی نے اپنی کتاب 'حسن المحاضرہ' (جلد۲ ، صفحہ ۱۴) میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عمرو بن العاص قریش کے چند لوگوں کے ہمراہ تجارت کے لیے بیت المقدس گئے ۔ ایک روز آپ وہاں کے پہاڑوں میں اپنے اور اپنے ساتھیوں کے اونٹ چرانے گئے ہوئے تھے (اس زمانے میں دستور تھا کہ سفر میں باری باری ایک آدمی سارے قافلے کے اونٹ چرایا کرتا تھا) کہ ادھر سے ایک آدمی گزرا جس کا نام شماس تھا ۔ اس دن شدید گرمی تھی ۔ شماس کو سخت پیاس لگی ہوئی تھی ۔

عمرو بن العاص نے اسے اپنے مشکیزے سے پانی پلایا۔ سیر ہو کر پانی پینے کے بعد وہ وہیں لیٹ کر سو گیا ۔ اس کے قریب ہی ایک گڑھا تھا ۔ وہاں سے ایک بہت بڑا سانپ نکلا ۔ عمرو بن العاص نے اسے دیکھ لیا ۔ آپ نے کمان میں تیر جوڑا اور شست باندھ کر سانپ کی طرف چلا دیا ۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا اور سانپ کا سر اڑ گیا۔ جب شماس بیدار ہؤا اور اسے اس واقعے کا پتا چلا تو اس نے عمرو بن العاص کے سر کو بوسہ دیا اور کہنے لگا " آپ نے مجھے دو بار موت کے منہ سے بچایا ہے ۔ ایک بار شدید پیاس سے اور ایک مرتبہ اس موذی سانپ کے ڈسنے سے ۔ میں آپ کے اس احسان کا بدلہ کسی طرح ادا نہیں کرسکتا ۔" پھر اس نے آپ سے پوچھا " آپ کے نزدیک آپ کو اس سفر میں کس قدر نفع ہوگا ؟" آپ نے جواب دیا " جو مال میرے پاس ہے اسے فروخت کرنے سے مجھے تگنا منافع ہوگا ۔" اس نے پھر پوچھا " آپ کے ہاں مقتولین کا خونبہا کتنا دیا جاتا ہے ؟" آپ نے جواب دیا " سو اونٹ ۔" شماس نے کہا " ہمارے یہاں اونٹوں کا نہیں ، سکے کا رواج ہے ، اس حساب سے بتائیے ۔" آپ نے جواب دیا " نقدی کے حساب سے خونبہا ایک ہزار دینار کا ہوتا ہے ۔" شماس نے کہا " میں اس علاقے میں اجنبی ہوں ، میں نے نذر مانی تھی کہ بیت المقدس میں آ کر عبادت کروں گا اور ان پہاڑوں میں ایک ماہ تک گشت کروں گا ۔ میں اس منت کو پورا کرنے کے لیے یہاں آیا تھا ۔ اب میں اپنے شہر واپس جانے والا ہوں ۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں ۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ وہاں چل کر آپ کو دو خونبہا ادا کردوں گا کیونکہ خدا نے مجھے آپ کے ذریعے سے دو بار زندہ کیا ہے ۔" عمرو بن العاص نے پوچھا " تم کس شہر کے رہنے والے ہو ؟" اس نے جواب دیا " میں اسکندریہ کا رہنے والا ہوں جو مصر کا مشہور شہر

ہے -" عمرو بن العاص نے کہا " میں آج تک نہ تو کبھی وہاں گیا ہوں اور نہ کبھی اس شہر کا نام سنا ہے*-" شماس نے کہا " آپ وہاں چلیے ، مجھے یقین ہے کہ آپ نے آج تک اس جیسا اور کوئی شہر نہ دیکھا ہوگا -" عمرو بن العاص نے کہا "اگر تم یقین دلاؤ کہ تم نے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کروگے تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے متعلق غور کر سکتا ہوں -" شماس نے کہا " میں عہد کرتا ہوں کہ میں نے آپ سے جو کچھ کہا ہے اسے ہر حال میں پورا کروں گا -" عمرو بن العاص نے پوچھا " مجھے آنے جانے میں کتنا عرصہ لگے گا ؟ " شماس نے کہا " ایک مہینہ - دس دن جانے میں لگیں گے ، دس دن تک آپ کا اسکندریہ میں قیام ہوگا اور دس دن واپسی میں صرف ہوں گے - میں یہاں سے آپ کو بحفاظت لے جاؤں گا اور واپسی پر بھی آپ کو آپ کے ساتھیوں کے پاس بحفاظت پہنچانے کا انتظام کردوں گا -" عمرو بن العاص نے کہا " اچھا تھوڑی سی مہلت دو ، میں ساتھیوں سے مشورہ کرلوں -" چنانچہ وہ ساتھیوں کے پاس گئے اور انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا اور کہا کہ وہ ان کی واپسی تک ان کا انتظار کریں اور اپنے میں سے ایک شخص کو ان کے ساتھ کردیں تو جو مال انھیں شماس سے ملے گا اس میں سے آدھا وہ ان میں بانٹ دیں گے - ان کے ساتھی مان گئے اور عمرو بن العاص ان میں سے ایک آدمی کو ہمراہ لے کر شماس کے ساتھ مصر روانہ ہوگئے - جب اسکندریہ پہنچے تو آپ شہر کی شاندار اور بلند و بالا عمارات ، وہاں کی خوبصورتی ، رونق اور مال و دولت کی

* یہ روایت کندی کے اس بیان کے خلاف ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ عمرو بن العاص جاہلیت میں بہ سلسلۂ تجارت بہت دفعہ مصر گئے -

فراوانی دیکھ کر بہت متحیر ہوئے اور آپ نے کہا " میں نے اب تک ایسا عظیم الشان شہر نہیں دیکھا ۔"

اتفاق یہ ہؤا کہ جس دن عمرو بن العاص اسکندریہ پہنچے اس روز باشندگان شہر کوئی جشن منا رہے تھے جس میں شہر کے حکام اور رؤساء بھی شریک تھے ۔ تمام لوگ ایک میدان میں جمع تھے ۔ رؤساء اور ملوک کے پاس سونے کی ایک چمکیلی گیند تھی جسے وہ ہوا میں اچھالتے تھے اور تمام لوگ آستینیں پھیلائے منتظر ہوتے تھے کہ کس شخص کی آستین میں وہ گیند گرتی ہے ۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ گیند جس شخص کی آستین میں گرے گی وہ اس وقت تک نہ مرے گا جب تک اسے اس شہر کی بادشاہی نہ مل جائے گی ۔ اسکندریہ پہنچنے پر شماس نے عمروبن العاص کو دیباج کا لباس پہنایا اور نہایت تعظیم و احترام سے لا کر وہاں بٹھا دیا جہاں سونے کی گنید اچھالی جارہی تھی ۔ چنانچہ جب گیند اچھالی گئی تو وہ عمرو بن العاص کی آستین میں آ گری ۔ لوگوں نے بڑے تعجب سے عمرو بن العاص کو دیکھا اور کہا کہ اس گیند نے اس مرتبہ کے سوا اور کبھی ہمیں دھوکا نہیں دیا ۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ بدو ہمارا حاکم بن جائے ؟ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوسکتا ۔

اس کے بعد شماس نے شہر والوں کے پاس جانا شروع کیا اور انہیں بتایا کہ کس طرح عمرو بن العاص نے دو مرتبہ اس کی جان بچائی اور اس کے صلے میں اس نے انہیں دو ہزار دینار دینے کا وعدہ کیا ہے ۔ اس لیے وہ یہ رقم جمع کر دیں ۔ شہر والوں نے بڑی خوشی سے دو ہزار دینار کی رقم جمع کرکے عمرو بن العاص کے حوالے کردی ۔ جب آپ کی واپسی کا وقت آیا تو شماس نے بڑے اعزاز و اکرام سے آپ کو رخصت کیا اور

دو آدمیوں کو بطور رہنما آپ کے ساتھ کر دیا ۔ اس طرح آپ کو مصر کے راستوں سے بخوبی آگاہی ہوگئی اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مصر زرخیزی اور دولت و ثروت کے لحاظ سے ارد گرد کے تمام علاقوں پر فضیلت رکھتا ہے ۔ جب آپ واپس اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچے تو وعدے کے مطابق ایک ہزار دینار ان میں تقسیم کردیے اور ایک ہزار دینار خود رکھ کر کہا "یہ پہلا مال ہے جو میں نے جمع کیا ہے ۔"

جہاں تک اس قصے کا تعلق ہے اس کی حقیقت ایک من گھڑت کہانی سے زیادہ نہیں ۔ تاریخ سے ہمیں کسی ایسے بادشاہ اور حاکم کا پتا نہیں چلتا جو سیوطی کی بیان کردہ روایت کے مطابق سونے کی گیند کے باعث مصر کا بادشاہ بنا ہو ۔ وہاں کے حاکم براہ راست شہنشاہ روم کی جانب سے مقرر کیے جاتے تھے اور صرف وہی شخص حاکم بنایا جاتا تھا جو اسکندریہ کا باشندہ ہو اور اسے رومی شہریت کے حقوق حاصل ہوں* ۔ رومی سلطنت نے حکام کو عام مجمعوں میں جانے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی ۔ اس صورت میں وہ حاکم کہاں سے آگئے جو سیوطی کے بیان کے مطابق ایک عام مجمع میں بڑی بے تکلفی سے گیند پھینک رہے تھے ۔ یہ مسئلہ بھی حل طلب ہے کہ عمرو بن العاص اور شماس کے درمیان بات چیت کس زبان میں ہوتی تھی ۔ اگر یونانی یا قبطی زبان میں ہوتی تھی تو عمرو بن العاص اسے سمجھنے سے قاصر تھے ۔ اور اگر عربی میں ہوتی تھی تو شماس اور اہل مصر اس سے نا واقف تھے ۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شماس کو اسکندریہ والوں سے مانگ کر دو ہزار دینار کی رقم جمع کرنی

* A Histoy of Egypt Under Roman Rule by Milne J.Grafton, Page 3.

پڑی - جب یہ رقم اس کے پاس تھی ھی نہیں تو اس نے عمرو بن العاص سے اس کے دینے کا حتمی وعدہ کس بنیاد پر کیا تھا ؟ —

اگرچہ اس قصے میں کسی قسم کی صداقت نہیں تاھم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عمرو بن العاص زمانۂ جاھلیت میں اسکندریہ ضرور گئے تھے (جیسا کہ کندی نے بھی ذکر کیا ہے) اور آپ مصر کے راستوں اور وھاں کے شہروں سے اچھی طرح واقف تھے -

دوسرا باب

قبول اسلام سے مرتدین کی جنگوں کے اختتام تک

۱ : قبول اسلام

طبری نے عمرو بن العاص کے اسلام لانے کا واقعہ آپ ہی کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے : " جنگ خندق سے واپسی پر میں نے قریش کے بعض ایسے آدمیوں کو جمع کیا جو اکثر میری رائے سے اتفاق کیا کرتے تھے اور میری بات توجہ سے سنا کرتے تھے - میں نے ان سے کہا " خدا کی قسم ! مجھے تو اب یہ دکھائی دے رہا ہے کہ محمد کے عروج کا ستارہ اوج پر پہنچنے والا ہے - اس حالت میں ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے پاس چلے جائیں اور وہاں سکونت اختیار کر لیں کیونکہ نجاشی کی حکومت میں رہنا محمد کے تابع ہو کر رہنے سے بہتر ہے ، اگر محمد نے ہماری قوم پر غلبہ حاصل کر لیا تو اس طرح ہم اس کی دسترس سے باہر رہیں گے اور اگر ہماری قوم غالب آ گئی تو پھر ہمارے وارے نیارے ہیں -" انھوں نے میری تائید کی اور کہا " آپ کی رائے بہت درست اور صائب ہے -" میں نے ان سے کہا " اچھا ! نجاشی کے لیے کچھ عمدہ سوغاتیں لے چلو -" ہمارے ہاں چمڑے سے بہتر کوئی

سوغات نہیں سمجھی جاتی تھی - چنانچہ ہم نے بہت سا چمڑا جمع کیا اور حبشہ کی جانب روانہ ہو گئے -

" جب ہم نجاشی کے محل کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ عمرو بن امیہ ضمری جنھیں رسول اللہ نے جعفر اور ان کے ساتھیوں کے پاس بھیجا تھا نجاشی کے محل میں داخل ہوئے اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر واپس چلے گئے - میں نے ساتھیوں سے کہا " یہ عمرو بن امیہ ضمری جا رہا ہے - میں نجاشی کے پاس جا کر اسے طلب کروں گا - اگر اس نے اسے میرے حوالے کر دیا تو اس کی گردن اڑا دوں گا - پھر اگر قریش محمد کو قتل کریں گے تو میں محمد کے ایلچی کو قتل کرنے کی وجہ سے ان کے برابر ہو جاؤں گا -"

" جب میں نجاشی کے دربار میں پہنچا تو حسب دستور اسے سجدہ کیا - نجاشی نے کہا " آؤ دوست ! کیا تم اپنے ملک سے میرے لیے کوئی ہدیہ لائے ہو؟" میں نے جواب دیا "جہاں پناہ! لایا ہوں -" یہ کہ کر وہ چمڑا جو میں عرب سے لایا تھا اس کی خدمت میں پیش کر دیا - اس نے دیکھ کر بہت پسند کیا - میں نے موقع غنیمت جان کر اس سے کہا " جہاں پناہ ! میں نے ابھی ایک آدمی کو آپ کے دربار سے نکلتے دیکھا ہے - وہ ہمارے دشمن کا ایلچی ہے - آپ کی بڑی نوازش ہو گی اگر اسے میرے حوالے کر دیں تا کہ میں اسے قتل کر دوں کیونکہ اس نے ہمارے متعدد سرداروں اور معززین کو قتل کیا ہے -" یہ سن کر نجاشی سخت غضب ناک ہؤا اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر اس زور سے اپنی ناک پر مارا کہ میں نے خیال کیا ، وہ ضرور ٹوٹ گئی ہو گی - میں یہ دیکھ کر بہت شرمندہ ہؤا اور کہا " جہاں پناہ ! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کو یہ بات

ناگوار گزرے گی تو میں کبھی ایسا سوال آپ سے نہ کرتا۔" اُس نے کہا "کیا تم مجھ سے یہ چاہتے ہو کہ میں اس شخص کے ایلچی کو قتل کرنے کے لیے تمھارے حوالے کر دوں جس کے پاس وھی ناموس اکبر (جبریل) آتا ھے جو موسیٰ کے پاس آتا تھا؟" میں نے کہا "جہاں پناہ! کیا واقعہ اسی طرح ھے؟" اُس نے جواب دیا "اے عمرو! تم پر افسوس۔ تم میرا کہا مانو اور اس کی اطاعت قبول کر لو۔ خدا کی قسم! وہ حق پر ھے اور جس طرح موسیٰ فرعون پر غالب آ گئے تھے اسی طرح یہ شخص بھی اپنے دشمنوں پر غالب آ جائے گا۔" میں نے کہا "میں مسلمان ھونا چاھتا ھوں۔ کیا آپ اسلام پر میری بیعت لے سکتے ھیں؟" اس نے جواب دیا "بے شک۔" یہ کہ کر اُس نے اپنا ھاتھ بڑھایا اور میں نے اسلام پر اس کی بیعت کر لی۔

نجاشی کے دربار سے نکل کر میں ساتھیوں کے پاس آیا لیکن ان سے اپنے اسلام لانے کا حال بیان نہ کیا۔ اس کے بعد میں خاص رسول اللہ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کی خاطر مدینہ روانہ ھؤا۔ راستے میں مجھے خالد بن ولید مکہ سے آتے ھوئے ملے (یہ فتح مکہ سے چھ ماہ قبل کا واقعہ ھے)۔ میں نے ان سے پوچھا "اے ابو سلیمان! کہاں کا ارادہ ھے؟" اُنھوں نے کہا "مجھ پر یہ بات ظاھر ھو گئی ھے کہ محمد اللہ کا رسول ھے اس لیے میں تو اسلام قبول کرنے جا رھا ھوں۔ آخر کب تک ھم اس کی مخالفت کرتے چلے جائیں گے؟" میں نے کہا "خدا کی قسم! میں بھی مسلمان ھونے کے لیے جا رھا ھوں۔" مدینہ پہنچ کر ھم رسول اللہ کی خدمت میں حاضر ھوئے۔ پہلے خالد بن ولید آگے بڑھے اور بیعت کی۔ ان کے بعد میں آگے بڑھا اور عرض کی "یا رسول اللہ! میں اس شرط سے آپ کی بیعت کرتا ھوں کہ میرے

پچھلے گناہ سب معاف ہو جائیں ۔ آئندہ کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا ۔" رسول اللہ نے فرمایا " اے عمرو! بیعت کر لو ۔ اسلام پچھلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے ۔ اسی طرح ہجرت بھی پچھلے گناہ دور کر دیتی ہے ۔" چنانچہ میں نے بیعت کر لی ۔" (الطبری ، جلد ۳ ، صفحہ ۱۰۳ - ۱۰۴)

ابن عساکر اپنی تاریخ میں زبیر بن بکار سے روایت کرتے ہیں کہ عمرو بن العاص سے بعض لوگوں نے پوچھا " آپ نے اسلام قبول کرنے میں دیر کیوں کی حالانکہ آپ عقل و دانش میں تمام قریش سے بڑھے ہوئے تھے ؟" اس پر آپ نے جواب دیا " ہماری قوم کے رؤساء ایسے تھے جن کی عقلیں پہاڑوں سے بھی زیادہ بھاری تھیں ۔ جو راستہ وہ اپنے لیے اختیار کرتے تھے ہمیں بھی اسی پر چلنا پڑتا تھا خواہ وہ کتنا ہی دشوار گزار کیوں نہ ہو ۔ جب انھوں نے رسول اللہ کو ماننے سے انکار کیا تو ہم نے بھی بغیر سوچے سمجھے ان کی تقلید کی اور انکار کر دیا ۔ لیکن جب وہ گزر گئے اور قوم کا بوجھ ہمارے سروں پر آپڑا تو ہمیں اسلام کے متعلق غور و فکر کرنے کا موقع ملا ۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ معاملہ کچھ اور ہی ہے ۔ پھر میرے دل میں اسلام کی حقانیت کا یقین پیدا ہونا شروع ہوا ۔ جب قریش نے دیکھا کہ میں اسلام کے خلاف ان کی معاندانہ کوششوں میں ان کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ الگ تھلگ رہتا ہوں تو انھیں میرے متعلق شک و شبہہ پیدا ہونے لگا اور ایک آدمی میرے پاس بھیجا گیا ۔ اس نے مجھ سے کہا :

" اے ابو عبداللہ ! قوم کا خیال ہے کہ تمہارا میلان محمد کی جانب ہے ۔" میں نے اس سے کہا " اے میرے بھتیجے ! میں تمھیں اس خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں جو تمہارا ،

تمھارے پہلوں اور تمھارے بعد میں آنے والوں کا رب ہے کہ ہم ہدایت پر ہیں یا فارس و روم ؟"

اس نے کہا " ہم ہدایت پر ہیں۔"

میں نے پوچھا "یہ بتاؤ کہ کیا ہم معاشی لحاظ سے بہتر ہیں یا فارس و روم ، اور ہماری سلطنت زیادہ وسیع ہے یا فارس و روم کی ؟"

اس نے جواب دیا " فارس و روم کی -"

میں نے کہا " اگر اس دنیا کے بعد اور کوئی زندگی نہیں تو پھر ہماری فضیلت اور ہدایت ہمارے کس کام آئی جب طاقت و قوت، شوکت و عزت اور وسعت سلطنت میں روسی و فارسی ہم سے بہتر ہیں - اس لیے میرا دل گواہی دیتا ہے ، محمد کی یہ تعلیم بالکل صداقت پر مبنی ہے کہ اس دنیا کے بعد ایک اور جہان بھی ہے جہاں نیکی کا بدلا نیکی سے اور برائی کا بدلا برائی سے دیا جائے گا - اے میرے بھتیجے ! میرے دل میں ہر وقت یہی خیالات گردش کرتے رہتے ہیں - زیادہ دیر تک گمراہی میں پڑے رہنے سے کیا فائدہ ؟"

عبدالرحمان بن زید بن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب نے ایک مرتبہ عمرو بن العاص سے پوچھا " جب میں تمھاری ذہانت اور عقلمندی دیکھتا ہوں تو مجھے بڑا تعجب ہوتا ہے کہ تم مہاجرین اولین کے زمرے میں کیوں شامل نہ ہوئے ؟"

آپ نے جواب دیا " اے عمر ! انسان کا دل اس کے اپنے اختیار میں نہیں بلکہ ایک اور ہستی کے ہاتھ میں ہے - وہی جدھر چاہتا ہے ادھر پھیر دیتا ہے -"

حضرت عمر نے فرمایا " تم سچ کہتے ہو - واقعی یہی بات ہے -"

قریش کے حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں ان کا ہر چھوٹا بڑا اسلام کو مٹانے کے درپے تھا - لڑائیوں میں رسول اکرم کی ہر فتح اور آن کی ہر شکست ان کی ہمتوں کو پست کرنے کے بجائے ان کے جوش کو اور زیادہ بھڑکانے کا موجب ہوتی تھی - لیکن جب انہیں پے درپے شکستوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا ، ان کے تمام بڑے بڑے سردار مارے گئے اور تمام سربرآوردہ اشخاص انہیں داغ مفارقت دے گئے تو ان کے نوجوانوں میں سخت اضطراب برپا ہؤا اور انہوں نے آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا شروع کیا - ایک طرف انہیں تاریکی ہی تاریکی دکھائی دیتی تھی ، اور دوسری جانب امید کی روشن کرن جلوہ دکھا رہی تھی - انہیں معلوم تھا کہ اگر اب بھی وہ اسلام کی روز افزوں قوت کا ساتھ دیں تو بالآخر وہ فائدے میں رہیں گے - لیکن ساتھ ہی وہ ڈرتے بھی تھے کہ ایسا کرنے سے وہ عزت و وجاہت جو انہیں اپنی قوم میں حاصل ہے جاتی رہے گی اور وہ آزادی بھی ان سے چھن جائے گی جس سے وہ اب تک بہرہ ور ہوتے رہے تھے - بعض لوگ تو ایسے تھے جنھوں نے تمام مشکلات اور خوف و خطر کو نظرانداز کرتے ہوئے مدینہ جا کر رسول اللہ کی بیعت کر لی - اور بعض جو تردد میں بہت بڑھے ہوئے تھے انہوں نے اسلام کے خلاف تمام سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور جب ان پر عین الیقین کی طرح یہ ظاہر ہو گیا کہ محمد بہر حال قریش پر غالب آنے والے ہیں تو انہوں نے بھی موقع کھو جانے سے پہلے فائدہ حاصل کرنے کی ٹھان لی اور فتح مکہ سے قبل اسلام میں

داخل ہو گئے ۔ پہلے گروہ میں سر فہرست خالد بن ولید ہیں اور دوسرے گروہ میں عمرو بن العاص ، جو جزیرہ عرب کو چھوڑ کر سرزمین حبشہ میں چلے گئے تھے تا کہ وہاں جا کر حالات کا بنظر غائر مطالعہ کریں ۔ جب انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ اور نجاشی کے باہمی تعلقات بہت اچھے ہیں ، عرب میں اسلام کی کامیابی عروج کو پہنچنے والی ہے اور مکہ کا سقوط اب کچھ دن کی بات ہے تو خیال کیا کہ کیوں نہ وہ بھی ان لوگوں میں اپنی جگہ بنا لیں جو سبقت کر کے اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور وہ کام جو آخرکار مجبوراً کرنا پڑے گا پہلے ہی سے برضا و رغبت کر لیں ۔

عمرو بن العاص کا وہ جواب جو آپ نے اس سوال کے جواب میں کہ آپ نے اسلام قبول کرنے میں دیر کیوں کی ؟ صرف آپ ہی کی ذات پر صادق نہیں آتا بلکہ ان بیشتر لوگوں پر بھی صادق آتا ہے جو فتح مکہ کے قریب اسلام لائے ۔ لاریب اسلام قبول کرتے وقت ، عمرو بن العاص کو یہ یقین واثق تھا کہ قریش پر مسلمانوں کا غلبہ ایک لازمی اور لابدی امر ہے اور اب اسلام صرف جزیرہ عرب ہی میں محدود نہ رہے گا بلکہ ارد گرد کے ممالک میں بھی پھیل جائے گا تاہم آپ کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ آپ محض جاہ طلبی کی خاطر اسلام میں داخل ہوئے ۔ حقیقتاً اسلام قبول کرتے وقت آپ نے تہیہ کر لیا تھا کہ آپ کی وہ قوتیں جو قبل ازیں اسلام کی مخالفت میں خرچ ہوتی رہی ہیں آئندہ اسلام کی سر بلندی اور اشاعت کی خاطر صرف ہوں گی ۔ آپ نے ابتدا ہی سے اپنے لیے ایک پروگرام مرتب کر لیا تھا جس پر آپ آخر وقت تک کاربند رہے اور دل و جان سے اسلام کی خدمت کرتے رہے ۔ آپ کی انتہائی خواہش

تھی کہ عرب اور ہمسایہ ممالک میں اعلاء کلمۃالحق اور اشاعت اسلام کی خاطر اپنے آپ کو کلیتاً وقف کر دیں جو آپ نے فی الحقیقت کر کے دکھا دیا - رسول اللہ نے بھی آپ کے اس جذبے کو معلوم کر لیا تھا ، چنانچہ آپ فرماتے ہیں " دوسرے لوگ اسلام لائے لیکن عمرو بن العاص ایمان لائے -" آئندہ صفحات میں رسول اللہ کے اس قول کی صداقت کا واضح ثبوت مل جائے گا -

ب : رسول اللہ کی طرف سے عزت افزائی

رسول اللہ نے سابقون الاولون مسلمانوں اور ان لوگوں میں جو تردد کے بعد مسلمان ہوئے کوئی فرق نہیں فرمایا - مؤخرالذکر مسلمانوں میں سے بیشتر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو صدق دل سے اسلام میں داخل ہوئے تھے - رسول اللہ نے انہیں اپنی قربت کا شرف بخشا - بعض لوگ ایسے تھے جو خوف کی بنا پر اسلام میں داخل ہوئے تھے اور ابھی ان کے دلوں میں شکوک و شبہات موجود تھے ، رسول اللہ نے انہیں بھی کامل حقوق سے بہرہ ور فرمایا - آپ چاہتے تھے کہ نو مسلمین میں سے کسی شخص کے دل میں احساس کمتری پیدا نہ ہو اور تمام لوگ اسلام کے لیے مفید وجود ثابت ہو سکیں - عمرو بن العاص خود بیان فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ، رسول اللہ نے مجھے او خالدبن ولید کو کسی جنگ میں بھی اپنے دیگر صحابہ سے علیحدہ نہیں فرمایا -

رسول اللہ کو معلوم تھا کہ عمرو بن العاص سچے دل سے اسلام میں داخل ہوئے ہیں اور ان کے دل میں خدمت اسلام کی تڑپ اور جذبہ موجزن ہے - آپ کو ان کی عقلمندی اور ذکاوت و فطانت کا حال بھی معلوم تھا اس لیے آپ نے انہیں اسلام لانے

کے کچھ عرصہ بعد سریہ ذات السلاسل میں امیر لشکر بنا دیا حالانکہ اس غزوے میں حضرت ابوبکر صدیق ، حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت ابو عبیدہ بن الجراح جیسے چوٹی کے صحابی شامل تھے ۔ اس کے بعد رسول اللہ نے 'سواع' بت کو توڑنے کے لیے جو دستہ روانہ فرمایا؟ اس کا امیر بھی عمرو بن العاص ہی کو بنایا اور بالآخر عمان کا والی مقرر کر دیا ۔

ج : غزوۂ ذات السلاسل کی قیادت

قبائل عرب کو دعوت اسلام دینے کے لیے رسول اللہ مبلغین اسلام کی جاعتیں مختلف اطراف میں روانہ فرمایا کرتے تھے ۔ عاص بن وائل کی ننھیال ، جو 'بلی' اور 'عذرہ' کے قبیلوں میں تھی ، سرزمین جذام میں آباد تھی ۔ رسول اللہ کو خبر پہنچی کہ یہ لوگ مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ۔ چونکہ ان لوگوں سے عمرو بن العاص کی رشتہ داری تھی اس لیے رسول اللہ نے انھیں سمجھانے بجھانے اور اسلام دشمنی سے باز رکھنے کے لیے آپ ہی کو روانہ فرمایا ۔ آپ کے ساتھ تین سو مہاجر اور انصار تھے ۔ جب آپ سرزمین جذام کے ایک چشمے 'سلاسل' پر پہنچے تو آپ کو خیال پیدا ہوا کہ اس قلیل فوج سے کام نہ بنے گا اس لیے آپ نے رسول اللہ کو مزید فوج بھیجنے کے لیے لکھا ۔ رسول اللہ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو دو سو مہاجرین اور انصار کے ساتھ ان کی مدد کے لیے روانہ فرمایا ۔ ان میں حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر بن الخطاب بھی شامل تھے ۔ روانگی کے وقت رسول اللہ نے ابوعبیدہ بن الجراح کو بہت سی قیمتی نصائح فرمائیں اور انھیں اختلاف سے بچنے کی تلقین کی ۔

وہاں پہنچ کر قریب تھا کہ دونوں رہنماؤں میں اختلاف

پیدا ہو جاتا اور وہی چیز وقوع میں آ جاتی جس سے رسول اللہ نے حضرت ابو عبیدہ کو ڈرایا تھا لیکن حضرت ابو عبیدہ کی معاملہ فہمی اور دور اندیشی نے اس جھگڑے کو ابتداء ہی میں ختم کر دیا ۔ ہؤا یہ کہ جب حضرت ابو عبیدہ عمرو بن العاص کے پاس پہنچے تو انھوں نے چاہا کہ فوج کی امامت کرائیں ۔ لیکن عمرو بن العاص نے کہا " آپ میری مدد کے لیے آئے ہیں ۔ اس وقت میں امیر ہوں ، آپ نہیں ۔" حضرت ابوعبیدہ نے جواب دیا " یہ بات نہیں ، میں اس فوج کا امیر ہوں جو میرے ساتھ ہے اور آپ اس فوج کے امیر ہیں جو آپ کے ہمراہ ہے[۱] ۔" عمرو بن العاص نے حضرت ابوعبیدہ کی یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور دونوں میں جھگڑا ہونے لگا ۔ آخر حضرت ابوعبیدہ کو رسول اللہ کی وہ نصیحت یاد آئی جو آپ نے چلتے وقت انہیں کی تھی اس لیے آپ نے عمرو بن العاص کی بات مان لی اور جھگڑا ختم کر دیا ۔

اس کے بعد لشکر دشمن پر حملہ آور ہؤا ۔ قضاعہ کے بے شمار آدمی مارے گئے ، ان کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور جہاں جس کے سینگ سمائے چل دیا ۔

مسلمانوں نے ان کا تعاقب کرنا چاہا لیکن عمرو بن العاص نے انہیں ایسا کرنے سے روک دیا ۔ پھر انھوں نے سردی سے بچاؤ کے لیے آگ جلانی چاہی تو عمرو بن العاص نے اس کی بھی اجازت نہ دی اور کہا کہ جو شخص آگ جلائے گا میں اسے اسی آگ میں جلا دوں گا ۔ آپ کے ساتھیوں کو یہ سختی بہت شاق گزری حالانکہ جیسا بعد میں ظاہر ہؤا ، جنگی نقطۂ نگاہ سے ایسا کرنا بہت ضروری تھا ۔ جب لشکر واپس مدینہ پہنچا تو لوگوں نے رسول اللہ سے عمرو بن العاص کی سختی کی شکایت کی ۔ رسول اللہ

نے آپ سے باز پرس فرمائی ۔ اس پر آپ نے جو جواب دیا وہ آپ کی بے نظیر جنگی بصیرت اور دور اندیشی پر دلالت کرتا ہے ۔ آپ نے کہا " میں نے انھیں دشمن کا تعاقب کرنے سے اس لیے منع کیا کہ کہیں دشمن کو کمک نہ پہنچ جائے اور وہ پلٹ کر مسلمانوں پر حملہ کر دے اور آگ جلانے سے اس لیے روکا کہ اس طرح دشمن کو مسلمانوں کی قلیل تعداد کا علم ہو جائے گا ۔"

رسول اللہ نے عمرو بن العاص کے ان عذرات کو قبول کیا اور فرمایا کہ واقعی تمھیں وہی کرنا چاہیے تھا جو تم نے کیا ۔

د : 'سواع' بت کا انہدام

سواع ، قبیلہ ھذیل کا بت تھا اور یہ قبیلہ مکہ سے تین میل کے فاصلے پر آباد تھا ۔ یہ بت عورت کی شکل کا تھا اور اس پر خوب چڑھاوے چڑھتے تھے ۔ رسول اللہ نے عمرو بن العاص کو چند آدمیوں کے ہمراہ اس بت کو منہدم کرنے کے لیے بھیجا ۔ جب آپ وہاں پہنچے تو بت خانے کے پجاری نے آپ سے پوچھا " آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں ؟" آپ نے جواب دیا " مجھے رسول اللہ نے اس بت کو توڑنے کے لیے بھیجا ہے ۔" پجاری نے کہا " آپ ایسا کرنے پر ہرگز قادر نہ ہو سکیں گے ۔" آپ نے پوچھا " کیوں ؟" اس نے جواب دیا " وہ دیوتا ہے ۔ اگر آپ نے اسے ضرر پہنچانا چاہا تو وہ آپ کو ہلاک کر دے گا ۔" آپ نے کہا " افسوس ! تیری باطل پرستی اب بھی نہ گئی ۔ کیا یہ بت دیکھ یا سن سکتا ہے ؟" یہ کہ کر آپ بت کے پاس گئے اور اسے توڑ ڈالا اور یہ کام کرنے کے بعد پجاری سے

پوچھا " بتا ! اب تیری کیا رائے ہے ؟ " اس نے جواب دیا " واقعی مجھے معلوم ہو گیا کہ بت وغیرہ کچھ حقیقت نہیں رکھتے ، میں اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لاتا ہوں ۔"

۷ : عمان میں زکوۃ کی وصولی پر تقرر

رسول اللہ نے عمرو بن العاص سے صرف جنگی خدمات ہی نہ لیں بلکہ آپ کی بصیرت اور عقلمندی دیکھ کر آپ کو سیاسی اور دینی امور کی انجام دہی کے لیے بھی متعین فرمایا ۔ چنانچہ ذی الحجہ ۸ھ میں آپ نے انھیں عمان کے دو رئیسوں ، جیفر اور عباد ، پسران جلندی کے پاس ایک تبلیغی خط دے کر روانہ فرمایا ۔ اس علاقے میں مجوسی مذہب پھیلا ہؤا تھا ۔ رسول اللہ کے خط کا مضمون یہ تھا :

" بسم اللہ الرحمان الرحیم ۔ یہ خط محمد ، اللہ کے بندے اور اس کے رسول کی طرف سے جیفر اور عباد ، پسران جلندی کی طرف ہے ۔ سلامتی ہو اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی ۔ میں تمھیں اسلام لانے کی دعوت دیتا ہوں ۔ تم اسلام قبول کر لو ، محفوظ رہو گے ۔ میں اللہ کا رسول ہوں اور ساری دنیا کی طرف بھیجا گیا ہوں تا کہ ہر اس شخص کو ڈراؤں جو زندہ ہے اور کافروں پر اتمام حجت کروں ۔ اگر تم اسلام لے آؤ گے تو میں تمھیں بدستور وہاں کا حاکم رہنے دوں گا اور اگر اسلام قبول کرنے سے انکار کرو گے تو تمھاری ریاست تم سے چھن جائے گی ۔"

یہ سفارت نہایت کامیاب رہی اور اہل عمان عمرو بن العاص کے ہاتھ پر اسلام لے آئے ۔ رسول اللہ نے اظہار خوشنودی کے طور

پر آپ کو عمان ھی میں زکوۃ کی وصولی کے کام پر مقرر فرما دیا ۔ اور رسول اللہ کی وفات تک آپ اسی عہدے پر برقرار رہے ۔ آپ عمان کے حالات اور اھل عمان کے عادات و خصائل اور سرشت سے اچھی طرح واقف تھے ۔ کیونکہ زمانۂ جاھلیت میں آپ تجارتی سفروں کی وجہ سے بہت دفعہ یہاں آ چکے تھے اس لیے آپ نے دیرینہ واقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور سیاست کے اصولوں سے بخوبی واقف ہونے کے باعث اپنا مفوضہ کام نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی سے انجام دیا اور تھوڑے ھی عرصے میں سارا عمان حلقہ بگوش اسلام ھوگیا ۔ یہ کام جہاں اپنے اندر دینی اھمیت رکھتا ھے وھاں اس کی سیاسی اھمت بھی کچھ کم نہیں ۔

عمرو بن العاص کو جب رسول اللہ نے جیفر اور عباد کی طرف روانہ فرمایا تو آپ مدینہ سے عمان پہنچے ۔ چھوٹا بھائی عباد ، حلم ، عقل اور حسن اخلاق میں اپنے بڑے بھائی سے بہتر تھا ۔ اس نے آنے کی غرض پوچھی ۔ آپ نے جواب دیا "مجھے رسول اللہ نے تمھارے اور تمھارے بھائی کے پاس خط دے کر بھیجا ھے ۔" عباد نے کہا " جیفر میرا بھائی اور صاحب اختیار ھے ۔ میں آپ کو اس کے پاس پہنچائے دیتا ھوں ، آپ خود اسے وہ خط پڑھ کر سنا دیں ۔" عباد نے آپ سے اسلام کے متعلق کچھ سوالات کیے اور پوچھا کہ یہ دین کن کن باتوں کا حکم دیتا ھے ؟ کن کن باتوں سے روکتا ھے ؟ عمرو بن العاص نے نہایت خوش اسلوبی اور وضاحت سے عباد کے سوالات کے جواب دیے اور اسلام کی حقیقت اچھی طرح اس کے ذھن نشین کرا دی ۔ عباد کے دل پر عمرو بن العاص کی باتوں کا بڑا گہرا اثر ھؤا ، اس کا دل اسلام کی طرف مائل ھو گیا اور وہ بے اختیار پکار اٹھا " یہ دین جس کی آپ مجھے دعوت دیتے ھیں ، واقعی صداقت پر مبنی

ہے ۔ کاش ایسا ہو سکتا کہ میرا بھائی بھی اس صداقت کو قبول کر لیتا اور ہم خود محمد کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ کے دست حق پرست پر بیعت کر سکتے ۔" عمرو بن العاص نے کہا " اگر تمھارا بھائی مسلمان ہو جائے تو رسول اللہ اسی کو اس علاقے کا حاکم مقرر فرمائیں گے ور صدقات و زکوٰۃ وغیرہ کی وصولی کا سارا انتظام اسی کے ہاتھ میں رہے گا ۔

عمرو بن العاص چند روز تک عباد ہی کے پاس مقیم رہے ۔ آپ کے اور عباد کے درمیان روزانہ جو گفتگو ہوتی اسے عباد بڑے اچھے پیرائے میں اپنے بڑے بھائی کو سنا دیتا ۔ آخر ایک دن اس نے ملاقات کا انتظام کر کے عمرو بن العاص سے اپنے بھائی کے پاس چلنے کو کہا ۔ آپ جیفر کے پاس پہنچے اور رسول اللہ کا خط ، جس پر آپ کی مہر لگی ہوئی تھی ، اس کے حوالے کر دیا ۔ جیفر نے خط کھول کر پڑھا اور پوچھنے لگا " اگر میں اسلام قبول نہ کروں تو کیا ہو گا ؟" عمرو بن العاص نے جواب دیا " تمھارے لیے دو ہی راستے ہیں ، یا تو اسلام قبول کر لو یا مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ ۔ اگر تم اسلام نہ لائے تو مسلمانوں کے گھوڑے تمھارے ملک کو روند ڈالیں گے اور اگر اسلام لے آئے تو نہ صرف یہ کہ بالکل محفوظ رہو گے بلکہ رسول اللہ تمھیں بدستور تمھاری قوم کا حاکم بنائے رکھیں گے اور تمھاری ریاست تمھارے ہی پاس رہے گی ۔ آخرالذکر راستہ اختیار کرنے میں سعادت دارین سے بہرہ ور ہو گے اور اول الذکر راستہ اختیار کرنے میں تمھیں قتل و تباہی سے دو چار ہونا پڑے گا۔"

جیفر نے غور و فکر کرنے کے لیے آپ سے ایک دن کی مہلت مانگی اور اگلے روز پھر آنے کو کہا ۔ دوسرے روز عمرو بن العاص عباد کو ساتھ لے کر پھر جیفر کے پاس پہنچے اور جواب مانگا ۔

اس نے اسلام لانے سے انکار کر دیا اور کہ دیا کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی میراث کو کسی اور کے حوالے نہ کرے گا، مسلمان کبھی اس کے علاقے پر قابض ہونے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے، اول تو راستہ اتنا لمبا اور پر صعوبت ہے کہ مسلمان یہاں پہنچ ہی نہ سکیں گے اور اگر کسی طرح پہنچ بھی گئے تو اہل عمان کی تلواریں ان کا استقبال کرنے کے لیے موجود ہوں گی۔

عمرو بن العاص جیفر کے اسلام لانے سے مایوس ہو کر اس کے پاس سے چلے آئے اور مدینہ واپس جانے کا ارادہ کیا۔ عباد کو معلوم تھا کہ جیفر کے انکار کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس نے اپنے بھائی کو سمجھایا، بہتر یہی ہے کہ رسول اللہ کی دعوت قبول کر لی جائے۔ چنانچہ اس نے عمرو بن العاص سے کہلا بھیجا کہ وہ اور عباد اسلام قبول کرنے کے لیے تیار ہیں۔ زکواۃ کی وصولی اور تقسیم کا کام انھوں نے آپ کے سپرد کر دیا اور خود ہر کام میں آپ کی مدد کرنے لگے۔

عمرو بن العاص اس اہم دینی و سیاسی منصب پر تقریباً دو سال تک فائز رہے اور لوگوں کو اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ آپ کی سعی و کوشش سے اس علاقے کے اکثر باشندے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ آپ عمان ہی میں مقیم تھے کہ حضرت ابو بکر صدیق کا خط پہنچا جس میں رسول اللہ کی وفات کی خبر تھی اورلکھا تھا کہ رسول اللہ نے انھیں جن امور کی انجام دہی کے لیے بھیجا تھا ان کی انجام دہی میں سر مو بھی فرق نہ آنے پائے۔ کوئی ایسا ٹیکس، جسے رسول اللہ نے نافذ کیا تھا، انھیں معاف کرنے کا حق نہیں اور کوئی ایسا ٹیکس، جو رسول اللہ نے انھیں وصول کرنے کے لیے نہیں کہا تھا، کسی حالت میں

بھی وصول نہ کیا جائے ۔

عمرو بن العاص یہ خط پڑھ کر بہت روئے اور سب لوگوں کو رسول اللہ کی وفات کی خبر دی ۔

س : عمرو بن العاص اور فتنۂ ارتداد

رسول اللہ کی وفات کے بعد عرب میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا ۔ اب بدوی قبائل برگشتہ ہوگئے اور انھوں نے آئندہ قریش کی اطاعت کا جؤا اٹھانے سے انکار کر دیا ۔ ان کا خیال تھا اب کہ رسول اللہ وفات پا چکے ہیں ، عرب پر قریش کی سیادت باقی نہ رہے گی اور وہ اس غلامی سے چھٹکارا حاصل کر سکیں گے جو دینی اور سیاسی لحاظ سے ان پر مسلط ہے ۔ چنانچہ اکثر قبائل نے حضرت ابو بکر صدیق کو اپنا حاکم تسلیم کرنے اور زکوۃ دینے سے انکار کردیا ۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا قبیلہ ارتداد اختیار کرنے لگا ۔ صورت حال یہاں تک ابتر ہوگئی کہ مکہ ، مدینہ ، طائف کی بستیوں اور قبیلہ عبدالقیس کے سوا باقی سارا عرب مرتد ہوگیا اور مرکز اسلام میں لرزش کے آثار نمودار ہونے لگے ۔

حضرت ابوبکر صدیق کو اس عظیم الشان فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے لوگوں کی تلاش شروع ہوئی جو صاحب عزم و ہمت ہوں اور بڑی پامردی سے ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہوں ۔ اس کی خاطر آپ نے عمرو بن العاص کو بھی عمان سے طلب فرمایا ۔ خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں آپ مدینہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں بنو عامر کی بستیاں پڑتی تھیں ، وہاں کا رئیس قرہ بن ہبیرہ تھا ، آپ نے اس کے یہاں قیام فرمایا۔

ابن ھبیرہ اپنے قبیلے میں بہت اثر و رسوخ کا مالک تھا ، اس نے اپنی سرکردگی میں بنو عامر کا ایک لشکر بھی تیار کر رکھا تھا ۔ عمرو بن العاص کے پہنچنے پر اس نے آپ کی بڑی خاطر تواضع کی اور بڑے اعزاز و اکرام سے پیش آیا ۔ جب آپ وھاں سے چلنے لگے تو وہ آپؓ کو تنہائی میں لے گیا اور کہنے لگا ”عرب زکواۃ دینے پر کبھی راضی نہ ھوں گے کیونکہ وہ اسے اپنے لیے تاوان سمجھتے ھیں ۔ اگر آپ ان کو زکوۃ سے مستثنیٰ کر دیں تو وہ دل و جان سے آپ کی اطاعت کرنے کو تیار ھوں گے لیکن اگر آپ نے اس کی وصولی پر اصرار کیا تو آپ ان سے اطاعت کی امید نہ رکھیں ۔“

یہ بات سن کر عمرو بن العاص نے جرأت و دلیری کا وہ نمونہ پیش کیا جو معمولی آدمیوں کے بس کی بات نہیں ۔ آپ ارتداد کے بڑھتے ھوئے سہیب طوفان سے مطلق خوفزدہ نہ ھوئے اور ایسے ھولناک وقت میں نرمی برتنے کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی آپ کے دل میں نہ آیا ۔ آپ نے فوراً قرہ کو جواب دیا:
”تم ھمیں عرب کے ارتداد سے ڈراتے ھو ، خدا کی قسم ! ھم گھوڑوں کے سموں سے تمھارے سارے قبیلے کو روند ڈالیں گے ۔“

مدینہ پہنچ کر آپ نے حضرت ابوبکر صدیق کو تمام حالات سے مطلع کیا اور کہا کہ دبا سے مدینہ تک تمام قبائل ھمارے خلاف آمادہ پیکار ھیں اور لشکر فراھم کر کے مدینہ پر حملہ آور ھونے کی تیاریاں کر رھے ھیں ۔

بعد میں جب قرہ بن ھبیرہ حالت اسیری میں حضرت ابوبکر صدیق کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا کہ میں بدستور اسلام پر قائم ھوں اور شہادت میں عمرو بن العاص کو پیش کر

دیا - حضرت ابوبکر صدیق نے عمرو بن العاص سے پوچھا - آپ نے قرہ کی کہی ہوئی تمام باتیں بیان کرنی شروع کیں - جب زکواۃ کی بات پر پہنچے تو قرہ بول اٹھا " بس بس اسے رہنے دو۔" آپ نے کہا " کیوں ؟ خدا کی قسم ! میں تو ساری باتیں بیان کروں گا ۔" تاہم حضرت ابوبکر صدیق نے اسے معاف کر دیا اور اس کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیا - (ابن اثیر ، جلد ۲ ، صفحہ ۱۷۰)

حضرت ابو بکر صدیق نے عمرو بن العاص کو قضاعہ کے مرتدین سے جنگ کرنے کا کام سپرد کیا * - آپ رسول اللہ کی زندگی میں بھی غزوۂ ذات السلاسل میں قبیلہ قضاعہ سے لڑ چکے تھے -

رسول اللہ کی وفات کے بعد قضاعہ نے بھی ارتداد کی راہ اختیار کی تھی - وہ خوشی سے اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے بلکہ دیگر قبائل کی طرح انھوں نے بھی خوف کے باعث یا مال و جاہ کی طمع میں اسلام قبول کیا تھا اور ان کے دل اسلام کی محبت سے خالی تھے - بارگاہ خلافت سے حکم جاری ہونے پر عمرو بن العاص

---

* جن قائدین کو حضرت ابو بکر صدیق نے نشان مرحمت فرما کر مرتدین سے جنگ کرنے کے لیے بھیجا تھا وہ مندرجۂ ذیل تھے: خالد بن ولید ، عکرمہ بن ابو جہل ، مہاجر بن امیہ مخزومی العرشی ، خالد بن سعید بن العاص ، عمرو بن العاص ، قبیلہ حمیر کے حذیفہ بن محسن الغلفانی ، قبیلہ ازد کے عرفجہ بن ہرثمہ البارق ، بنو زہرہ کے حلیف شرجیل بن حسنہ ، معن بن حاجز السلمی ، قبیلہ اوس کے سوید بن مقرن اور بنوامیہ کے حلیف علاء بن حضرمی -

اپنے لشکر کے ہمراہ اسی راستے سے جذام کی جانب روانہ ہوئے جس سے پہلے گئے تھے۔ وہاں پہنچ کر اسلامی فوجوں اور قضاعہ میں زبردست مقابلہ ہوا۔ پہلے کی طرح اب بھی قضاعہ کو شکست کھانی پڑی اور عمرو بن العاص ان سے زکواۃ لے کر اور انہیں دوبارہ حلقہ بگوشِ اسلام بنا کر مظفر و منصور مدینہ واپس آ گئے۔

تیسرا باب

شام اور فلسطین کی جنگیں

۱ : حضرت ابو بکر صدیق کا خط

مرتدین کی جنگوں کے خاتمے کے ساتھ ہی اسلامی فوجیں ہمسایہ مملکتوں کو فتح کرنے کی خاطر نکل کھڑی ہوئیں ۔ عمرو بن العاص سے یہ امر بعید تھا کہ آپ اس موقع پر خاموش رہتے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شام اور فلسطین کی فتوحات میں دیگر سپہ سالاروں کی طرح آپ بھی برابر کے شریک تھے اور مصر کی فتح تو کلیتہً آپ ہی کے ہاتھوں ہوئی ۔

رومی حکام نے سلطنت کے آخری دور میں محکوم رعایا پر سخت ظلم و ستم ڈھانے شروع کردیے تھے ۔ ان کے جور و تعدی سے تنگ آ کر رعایا نے بھی ان سے نجات حاصل کرنے اور غلامی کی ان زنجیروں کو توڑنے کے لیے ، جو ایک لمبے عرصے سے ان کے پاؤں میں پڑی ہوئی تھیں ، جدوجہد شروع کردی ۔ حاکم اور رعایا کی باہمی کشمکش سے رومی سلطنت داخلی انتشار میں مبتلا ہوگئی لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اس داخلی انتشار کے باعث رومی سلطنت نمایاں کمزوری کا شکار ہوگئی تھی ۔ یقیناً اس میں اب بھی اتنی طاقت باقی تھی کہ وہ عربوں سے بہ آسانی نبردآزما ہوسکتی تھی اور ان کے حملوں

کو روک کر انھیں اپنی حدود سے باھر نکال سکتی تھی ۔

رومیوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف انتقام اور حسد کی آگ اس وقت سے بھڑک رھی تھی جب سے حضرت اسامہ بن زید نے اپنے والد کا انتقام لینے کے لیے اُن کے علاقے پر چڑھائی کی تھی ۔ اسامہ کے حملے کا بدلہ لینے کے لئے ھرقل ، شہنشاہ روم نے عرب اور فلسطین کی سرحدوں کے قریب ایک لشکر جرار جمع کر رکھا تھا ۔

یہ صورت حال دیکھ کر حضرت ابوبکر صدیق نے سارے جزیرۂ عرب سے قبائل کو جمع کیا تاکہ رومی جارحیت کا خاطرخواہ مقابلہ کیا جاسکے۔ تمام قبائل عرب نے آپ کی آواز پر دل و جان سے لبیک کہی اور جوق در جوق مدینہ پہنچنے لگے۔ عمرو بن العاص مرتد قبائل کی شورش کو فرو کرکے عمان واپس جاچکے تھے ۔ حضرت ابوبکر صدیق نے انھیں لکھا :

”رسول اللہ نے پہلے تمھیں بنو قضاعہ کی مہم پر بھیجا تھا، اس کے بعد عمان کا والی بنایا ۔ میں نے بھی تمھیں بنو قضاعہ کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا ، اس کے بعد عمان کی ولایت پر واپس بھیج دیا ۔ اب اے ابو عبداللہ ! میں تمھارے سپرد وہ کام کرنا چاھتا ھوں جو دین و دنیا ، دونوں کے اعتبار سے تمھارے لیے بہتر ھے اور جو یقیناً تمھیں بھی تمھارے موجودہ کام سے زیادہ پسند ھوگا ۔“

(طبری جلد ۴ ، صفحہ ۲۸)

عمرو بن العاص نے جواب میں لکھا :

”میں اسلام کے تیروں میں سے ایک تیر ھوں اور آپ اس کے تیر انداز ۔ جس طرف سے آپ کو کوئی خطرہ نظر آئے آپ

بے تامل اس طرف یہ تیر چلائیے ۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ جگر
کو چھید کر پار نکل جائے گا ۔"

یہ جواب موصول ہونے پر حضرت ابوبکر صدیق نے
عمرو بن العاص کو عمان سے بلا لیا ۔ آپ نے شام کی طرف روانہ
ہونے والی اسلامی فوج کے چار حصے کیے اور ہر حصے کا علحدہ
علحدہ امیر مقرر کر کے شمال کی جانب مندرجہ ذیل علاقوں کی
طرف روانہ کیا :

(۱) ابو عبیدہ بن الجراح : حمص
(۲) عمرو بن العاص : فلسطین
(۳) یزید بن ابی سفیان : دمشق
(۴) شرحبیل بن حسنہ : وادیٔ اردن

روانگی کے وقت حضرت ابوبکر صدیق نے ان امراء کو
ارشاد فرمایا کہ " وہ ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے کی مدد
کریں ، چاروں امراء ابوعبیدہ کی سر کردگی میں ہوں گے ،
فلسطین کی فتح کے لیے عمرو بن العاص ہی جائیں ، اگر ضرورت
پڑی تو مزید فوج بھی بطور کمک روانہ کی جائے گی *۔"
روانگی سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق نے عمرو بن العاص
کو چند نصائح فرمائیں ۔ ان نصائح سے جہاں عمرو بن العاص کے
بعض اخلاق و عادات کا علم ہوتا ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا
ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کو مسلمانوں کی فلاح و بہبود ،
خیر خواہی اور مفتوحہ ممالک کے باشندوں سے حسن سلوک کا

* طبری ، جلد ۴ صفحہ ، ۸۲ ۔ ابن اثیر ، جلد ۲ ، صفحہ ۱۹۵ ۔
امیر علی ، صفحہ ۳۴ — ۳۶ ۔ ایرفنج صفحہ ۱۲

کس درجہ خیال تھا ۔ چنانچہ واقدی لکھتا ہے :

"حضرت ابوبکر صدیق نے عمرو بن العاص کو بلایا اور علم ان کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا "میں نے طائف ' ہوازن اور بنو کلاب پر مشتمل اس فوج کی قیادت تمھارےسپرد کی ہے ۔ تم اسے لے کر فلسطین جاؤ ۔ ابوعبیدہ سے برابر خط و کتابت کرتے رہنا اور ضرورت پڑنے پر ان کی مدد کو پہنچنا ۔ کوئی اہم کام ان سے مشورہ کیے بغیر نہ کرنا ۔ ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرتے رہنا اور خلوت میں بھی شرم و حیا سے کام لینا کیونکہ کوئی مخفی عمل اللہ سے مخفی نہیں ۔ دیکھو! میں نے تمھیں ان لوگوں پر بھی ترجیح دی ہے جنھوں نے تم سے پہلے اسلام قبول کیا اور حرمت میں بھی وہ تم سے مقدم ہیں اس لیے چاہیے کہ تمھاری تمام کوششیں آخرت کے لیے ہوں ۔ تم اپنا ہر کام اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیےانجام دینا ۔ فلسطین جانے کے لیے ایلیاء کا راستہ اختیار کرنا ۔ جو کام تمھارے سپرد کیا گیا ہے اس میں مطلق سستی نہ کرنا اور کاہلی کو پاس تک نہ پھٹکنے دینا ۔ خبردار! کہیں ایسا نہ ہو ، تم یہ کہنے لگو کہ ابن ابی قحافہ نے مجھے ایسےلشکر کا سامنا کرنے کے لیےبھیج دیا جس سے لڑنے کی طاقت مجھ میں نہیں ۔ اے عمرو ! اچھی طرح جان لو کہ تمھارے ساتھ وہ مہاجرین اور انصار ہیں جنھوں نے جنگ بدر میں حصہ لیا تھا ۔ ان کی ہر طرح تعظیم و تکریم کرنا ، ان کے حقوق کا ہرطرح خیال رکھنا ، امارت کی وجہ سے ان پر اپنی فوقیت نہ جتانا ۔ تمھارے دل میں یہ شیطانی وسوسہ داخل نہ ہونے پائے ، چونکہ تمھیں ابوبکر نے امیر بنایا ہے اس لیےتم ان سے بہتر ہو ۔ نفس کے دھوکوں سے خبردار رہنا ۔ لوگوں سے اس طرح مل جل کر زندگی بسر کرنا گویا تم بھی

آنھیں کی طرح ایک فرد ہو ۔ ہر کام میں ان سے مشورہ لینا ۔ ادائے نماز کا خیال رکھنا ۔ میں تمھیں پھر کہتا ہوں کہ نماز ادا کرنے کا خیال رکھنا ۔ جب نماز کا وقت آ جائے تو اذان دلوا کر نماز پڑھنا ۔ دشمن کی چالوں سے خبردار رہنا ۔ اپنے ساتھیوں کو ہر دم چوکس رہنے کی تاکید کرتے رہنا ۔ دشمن کے تمام حالات سے مطلع رہنا ۔ راتوں کو اپنے رفیقوں کے ساتھ زیادہ بیٹھنا ۔ مقابلے کے وقت طلایہ کو آگے بھیجنا ۔ اللہ سے ڈرتے رہنا ۔ فوج کو نصیحت کرتے وقت اختصار سے کام لینا ۔ پہلے اپنے نفس کی اصلاح کرنا ، اس سے تمھارے ماتحتوں کی بھی اصلاح ہوگی ۔ دشمن کو سامنے دیکھ کر صبر و ثبات سے کام لینا اور قدم پیچھے نہ ہٹانا ، یہ تمھارے لیے فخر کا موجب ہوگا ۔ اپنے ساتھیوں کو قرآن کریم کی تلاوت کرنے کی تاکید کرتے رہنا اور زمانۂ جاھلیت کے تذکروں سے روکنا کیونکہ اس کی یاد ان کے دلوں میں عداوت پیدا کردے گی ۔ دنیوی ساز و سامان سے کنارہ کشی اختیار کرنا تاکہ تمھارا شمار تمھارے اسلاف میں ہو اور تم ان ائمہ میں سے گنے جاؤ جن کے متعلق اللہ قرآن کریم میں فرماتا ھے ' وجعلنا ھم ائمة یھدون بأمرنا و اوحینا الیھم فعل الخیرات و اقام الصلوٰة وایتاء الذکوٰة وکانوا لنا عابدین ' (اور ھم نے انہیں امام بنایا ، وہ ھمارے حکم سے ھدایت حاصل کرتے ھیں ۔ ھم نے انھیں نیکیاں کرنے ، نماز ادا کرنے اور زکوٰة دینے کی وحی کی اور وہ ھماری ھی عبادت کرتے ھیں)

"یہ نصائح کرنے کے بعد آپ نے فرمایا " اب تم روانہ ھوجاؤ ، اللہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے کام میں برکت دے ۔" چنانچہ عمرو بن العاص نو ھزار فوج کے ساتھ فلسطین روانہ

ہو گئے ۔" (واقدی ، جلد اول ، صفحہ ۹)

ب : فلسطین میں جنگی سرگرمیوں کی ابتدا

عمرو بن العاص نے حضرت ابوبکر صدیق کی نصائح پر پوری طرح عمل کیا اور ایلیاء کے راستے فلسطین پہنچ گئے ۔ وہاں پہنچ کر آپ نے ' غمرالعربات ' کے مقام پر قیام کیا ۔ جب ہرقل کو مسلمانوں کے لشکروں کی آمد کا حال معلوم ہؤا تو اس نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کی ہر فوج کے مقابلے میں ایک لشکر جرار روانہ کرے اور انہیں آپس میں ملنے نہ دے ، اس طرح مسلمانوں کی طاقت کم ہو جائے گی ۔ عمرو بن العاص کے مقابلے میں اس نے اپنے بھائی ' تذارق ' کو نوے ہزار فوج دے کر فلسطین کی جانب روانہ کر دیا ۔

جب مسلمانوں کو اس لشکر جرار کی آمد کی خبر ملی توقدرتاً ان کے دلوں میں خوف و ہراس پیدا ہؤا لیکن عمرو بن العاص مطلق خوف زدہ نہ ہوئے ۔ جب رومیوں کا مقدمۃالجیش ، جو دس ہزار سپاہ پر مشتمل تھا ، سامنے آیا تو آپ نے حضرت عبد اللہ بن عمر کو ایک ہزار فوج کے ساتھ سامنے سے حملہ کرنے کا حکم دیا اور ایک ہزار فوج کے ہمراہ خود دوسری طرف سے حملہ کر دیا ۔ حملہ اتنی پھرتی سے کیا گیا کہ رومی لشکر کا سردار ' تذارق ' اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کرسکا اور تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک نیزے نے اس کا کام تمام کر دیا ۔ اپنے سردار کو گرتے دیکھ کر رومی لشکر کی ہمت پست ہوگئی اور کچھ دیر کے مقابلے کے بعد وہ شکست کھا کر بھاگ کھڑا ہوا ۔ مسلمانوں کے ہاتھ بے شمار مال اسباب اور

غنیمتوں کے علاوہ سات سو قیدی بھی آئے ۔ واقدی کی روایت کے مطابق اس جنگ میں مسلمان شہداء کی تعداد صرف سات تھی (واقدی ، جلد اول ، صفحہ ۱۱ و ۱۲)

ج : ایک لاکھ رومیوں سے مقابلہ

اگلے روز مسلمانوں نے دیکھا کہ ایک لاکھ رومیوں کا ایک عظیم الشان لشکر ان کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے ۔ یہ لشکر دس حصوں میں منقسم تھا اور ہر حصے کا سالار صلیبی علم اٹھائے ہوئے اپنے اپنے دستے کے آگے تھا ۔ عمرو بن العاص نے بھی اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیا اور صفوں کی ترتیب شروع کردی ۔ میمنہ پر ضحاک ، میسرہ پر سعید بن خالد اور ساقہ پر ابوالدرداء کو مقرر کیا ۔ خود قلب میں جگہ سنبھالی ۔ چند لوگوں کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ لشکر میں پھر کر قرآن کریم کی آیات تلاوت کرتے رہیں اور سپاہیوں کو جوش دلا کر لڑائی کی ترغیب دیتے رہیں ۔ اسلامی لشکر کی ترتیب اس قدر عمدہ تھی اور سپاہیوں کے چہروں سے اتنی بے خوفی اور دلیری برس رہی تھی کہ رومی سالار لشکر ' روبیس ' بطریق روم بھی مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔

صف بندی اور ابتدائی انتظامات کے بعد جنگ شروع ہوئی ۔ مسلمانوں نے نیزے سنبھالے اور آگے بڑھ بڑھ کر رومیوں پر پرزور حملے شروع کردیے ۔ کچھ دیر تک لڑائی جاری رہی ۔ آخر رومی مسلمانوں کے حملوں کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹے اور بھاگ کھڑے ہوئے ۔ مسلمانوں نے شکست خوردہ فوج کا تعاقب کیا اور ہزاروں رومیوں کو بھاگتے ہوئے مار ڈالا ۔ ابھی

تعاقب جاری تھا کہ یکایک رومی پلٹے اور ایک بار پھر قوت مجتمع کرکے تعاقب کرنے والے مسلمانوں پر حملہ کر دیا ۔ اس حملے میں عمرو بن العاص کے سوتیلے بھائی سعید بن خالد شہید ہوگئے ۔ اس جنگ میں پندرہ ہزار رومی ہلاک اور ایک سو تیس مسلمان شہید ہوئے ۔

رومیوں پر عظیم الشان فتح حاصل کرنے کے بعد ، عمرو بن العاص نے حضرت ابو عبیدہ کو فتح کی خوش خبری دیتے ہوئے لکھا :

" میں سرزمین فلسطین میں پہنچ گیا ہوں ۔ یہاں ہمارا مقابلہ رومی سپہ سالار ' روبیس ' کی ایک لاکھ سپاہ سے ہؤا جس میں اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہماری مدد فرمائی اور سرزمین فلسطین ہمارے ہاتھوں فتح ہوگئی ۔ رومیوں کے پندرہ ہزار سپاہی ہلاک ہوئے لیکن ہمارا نقصان صرف ایک سو تیس جانوں تک محدود رہا ۔ اب اگر آپ کو میری ضرورت ہو تو میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے تیار ہوں ۔ والسلام علیک و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔" (واقدی ، جلد اول ، صفحہ ۱۳)

لیکن واقدی نے نہ معلوم عمرو بن العاص کی طرف یہ قول کس طرح منسوب کر دیا ہے کہ اس لڑائی کے باعث سرزمین فلسطین ہمارے ہاتھوں فتح ہوگئی۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ اس وقت رومی لشکر فلسطین کے چاروں طرف موجود تھے۔ غزہ ، رملہ ، بیت المقدس اور اجنادین وغیرہ اہم مقامات ابھی تک رومیوں کے قبضے میں تھے اور یرموک اور دمشق کی فتوحات تک مسلمان ان پر تسلط نہ جما سکے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ واقدی کے بیان کے مطابق رومی ایک لاکھ سے بھی زائد تھے اور عمرو بن العاص کی فوج نو ہزار سے زیادہ نہ تھی اس کے باوجود رومی مقتولین کی

تعداد پندرہ ھزار سے بھی زیادہ بتائی گئی ھے - خواہ رومیوں کی شکست کتنی ھی عبرت‌نا ک کیوں نہ ھو لیکن مقتولین کا یہ تقابل سمجھ میں آنے والی بات نہیں - مزید برآں واقدی کا بیان طبری ، ابن اثیر اور امیر علی کے مستند بیانات کے بھی خلاف ھے - ان حضرات نے لکھا ھے ، یہ معلوم ھونے پر کہ ھرقل نے چاروں اسلامی افواج کو کچلنے اور تباہ کرنے کے لیے چار عظیم‌الشان لشکر بھیجے ھیں ، اسلامی افواج میں خوف و ہراس کی ایک لہر دوڑ گئی - سپہ سالاروں نے اس نازک صورت حال سے عہدہ برآ ھونے کے لیے عمرو بن العاص سے مشورہ طلب کیا اور حضرت ابوبکر صدیق کو بھی تمام حالات سے اطلاع دے کر مزید ھدایات طلب کیں - عمرو بن العاص نے شامی قائدین کو لکھا کہ اس وقت رومی فوجوں سے علحدہ علحدہ مقابلہ کرنا مناسب نہیں ، ھمیں چاھیے کہ اپنے چاروں لشکروں کو اکٹھا کر لیں اور قوت مجتمع کر کے دشمن سے مقابلہ کریں - فوجوں کے اجتماع کے لیے آپ نے یرموک کا نام تجویز کیا - حضرت ابوعبیدہ سپہ سالار افواج شام نے یہ تجویز پسند کی - ادھر حضرت ابوبکر صدیق نے بھی وھی مشورہ دیا جو عمرو بن العاص نے دیا تھا * -

اس واقعے سے معلوم ھوتا ھے کہ گو عمرو بن العاص شامی افواج کے امیر اور سپہ سالار نہ تھے لیکن مسلمان قائدین کو آپ کی اصابت رائے پر اس درجہ یقین تھا کہ انھوں نے اس نازک ترین موقع پر آپ کی رائے معلوم کرنی ضروری سمجھی - آپ کے لیے یہ بات بھی باعث صد افتخار ھے کہ حضرت ابوبکر صدیق

---

* طبری ، جلد ۴، صفحہ ۳۱ - ابن اثیر ، جلد ۲، صفحہ ۱۹۸ - میور ، صفحہ ۲۸ - ایر فنچ ، صفحہ ۳۷

نے امرائے لشکر کو جو جواب دیا وہ اس مشورے کے بالکل مطابق تھا جو عمرو بن العاص نے انہیں دیا تھا ۔ اس رائے پر عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہؤا کہ مسلمانوں کو جنگ یرموک میں شاندار کامیابی نصیب ہوئی ، دشمن کو بھاری نقصان جان و مال اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا اور یہ فتح آئندہ متواتر فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ عمرو بن العاص کی جنگی مہارت اور اسلام کی بے لوث خدمات ھی کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق کے علاوہ حضرت عمرفاروق کو بھی ہمیشہ آپ پر پورا اعتماد رہا ۔ اگرچہ حضرت خالد بن ولید نے مرتدین کی جنگوں میں آپ سے بہت زیادہ کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اور عراق و شام کی فتوحات میں بھی آنہیں کا پلہ بھاری تھا تاہم حضرت عمر کی نگاہ میں جو مقام عمرو بن العاص کا تھا وہ حضرت خالد بن ولید کو نہ حاصل ہو سکا ۔

د : یرموک ، دمشق اور اردن کی جنگیں

جنگ یرموک* کا شمار مسلمانوں کی فیصلہ کن جنگوں میں ہوتا ھے ۔ یہ جنگ فلسطین اور عرب کی سرحد پر لڑی گئی تھی اور

* یرموک ایک دریا ھے جو حوران کی سطح مرتفع سے نکل کر جھیل گیلیلی کے جنوب میں چند میل کے فاصلے پر دریائے اردن میں جا گرتا ھے ۔ دونوں دریاؤں کے مقام اتصال سے تیس میل اوپر دریائے یرموک نصف دائرے کی صورت ایک چکر کاٹتا ھے جس سے اتنا وسیع میدان بن جاتا ھے کہ اس میں ایک پوری فوج سما سکتی ھے ۔ رومیوں نے اس مقام کو محفوظ خیال کرتے ہوئے ڈیرے ڈالے تھے ۔ (ھسٹری آف ساراسینز از امیر علی)

اس میں رومیوں نے اپنی پوری فوجی طاقت جھونک دی تھی۔ رومیوں کا حملہ اس قدر زور دار تھا کہ مسلمان اس کی تاب نہ لا سکے اور انھوں نے پیچھے ھٹنا شروع کر دیا۔ پیچھے ھٹنے والوں میں مسلمانوں کا علم بردار بھی تھا۔ یہ دیکھ کر عمرو بن العاص اور خالد بن ولید آگے بڑھے۔ عمرو بن العاص نے پھرتی سے علم بردار کے ھاتھ سے جھنڈا لے لیا اور اسے ایک لمحے کے لیے بھی نیچا نہ ھونے دیا۔ میدان جنگ میں اپنا جھنڈا پوری شان سے لہراتا ھؤا دیکھ کر ھزیمت خوردہ مسلمانوں کی بھی ھمت بندھ گئی اور انھوں نے دوبارہ مجتمع ھو کر نئے جوش اور ولولے کے ساتھ دشمن سے لڑنا شروع کر دیا اور اس وقت تک جنگ بند نہ کی جب تک رومیوں کو شکست فاش نہ ھو گئی۔

اس جنگ کے دوران میں رومیوں نے کچھ تیر انداز ایک خندق میں چھپا دیے اور انھیں ھدایت کی کہ وہ تاک تاک کر مسلمانوں کی آنکھوں پر تیر چلائیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ھی کیا اور سات سو مسلمانوں کی آنکھیں بے کار کر دیں۔ اسی وجہ سے اس دن کا نام ' یوم التعویر ' مشہور ھو گیا۔ اسلامی لشکر بدحواس ھو کر پیچھے ھٹا اور امراء اور علم برداروں کے سوا کوئی بھی ثابت قدم نہ رھا۔ اس موقع پر عمرو بن العاص، ابوعبیدہ بن الجراح، یزید بن ابی سفیان اور عبدالرحمن بن ابوبکر، امراء عساکر نے خود آگے بڑھ کر دشمنوں کا مقابلہ کیا اور ان کی پیش قدمی کو روکا۔ مسلمان عورتوں نے بھی اس موقع پر بہادری کا عدیم النظیر نمونہ دکھایا۔ بعض عورتیں میدان جنگ میں بے خوفی سے چکر لگاتی ھوئی زخمیوں کی مرھم پٹی کرنے اور انھیں پانی پلانے میں مشغول ھو گئیں اور بعض عورتیں مورچوں پر جا کر کھڑی ھو گئیں اور فرار ھونے والے مردوں کو

غیرت دلانے اور بھاگنے سے روکنے لگیں - ھزیمت خوردہ فوج نے جب یہ دیکھا تو اس نے اس ذلت و عار کے مقابلے میں لڑ کر مر جانے کو بہتر سمجھا - چنانچہ ساری فوج پلٹی اور دشمن کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی -

ان واقعات سے عمرو بن العاص کی شجاعت کا اظہار بخوبی ہوتا ہے - آپ کی بڑی خواہش تھی کہ دشمن کی پسپائی آپ کے ہاتھوں سے ہو اسی وجہ سے علم تھامنے کے لیے آپ نے خالد بن ولید سے سبقت کی - اگرچہ رومی لشکر نے چاروں طرف سے آپ کو گھیر لیا تھا لیکن جوش جہاد میں آپ نے اپنے آپ کو بھی بھلا دیا اورتمام خطرات و خدشات سے بے پروا ہوکر دشمن کے مقابلے میں ڈٹ گئے - اسی طرح دوسرے موقع پر جب دشمن کے بھر پور حملوں کے سامنے بے بس ہو کر اسلامی لشکر نے بھاگنا شروع کر دیا تھا ، آپ نے خوف و ہراس کو پاس تک نہ پھٹکنے دیا اور امراء کی ایک قلیل تعداد کے ساتھ مل کر دشمن سے اس وقت تک مردانہ‌وار لڑتے رہے جب تک ہزیمت خوردہ لشکر رومیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے دوبارہ میدان جنگ میں جمع نہ ہوگیا -

حضرت ابوبکر صدیق کی وفات کے بعد جب حضرت عمر نے خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو آپ نے عمرو بن العاص کے سوا باقی تمام امراء کو وہی فرائض انجام دینے کی ہدایت کی جن کی بجا آوری کے لیے حضرت ابوبکر صدیق نے انہیں روانہ فرمایا تھا - خالد بن ولید کو آپ نے ابوعبیدہ کے ماتحت کر دیا اور عمرو بن العاص کو حکم دیا کہ وہ شام میں لڑنے والی افواج کی مدد کریں اور شام کی فتوحات سے فراغت کے بعد جب جنگ کا رخ فلسطین کی جانب پھرے تو وہاں لڑنے والی افواج کی کمان سنبھالیں -

یرموک کی جنگ کے بعد اسلامی فوجوں نے دمشق کا رخ کیا ۔ عمرو بن العاص نو ہزار فوج کے ہمراہ مقدمۃ الجیش پر متعین تھے ۔ آپ کے پیچھے بقیہ فوج اپنے اپنے امراء کے ساتھ تھی ۔ دمشق پہنچ کر عمرو بن العاص نے 'باب فرادیس' کے سامنے ، شرحبیل بن حسنہ نے 'باب توما' کے سامنے ، قیس بن ہبیرہ نے 'باب فرج' کے سامنے اور ابوعبیدہ نے 'باب جابیہ' کے سامنے ڈیرے ڈالے ۔ خالد بن ولید 'باب شرقی' پر متعین کیے گئے ۔ مسلمانوں نے ستر روز تک دمشق کا سخت محاصرہ کیے رکھا ۔ رومیوں کی شدید کوشش اور فصیل شہر پر سے سنگ باری کے باوجود مسلمانوں نے محاصرے کی شدت میں کمی نہ آنے دی ۔ محاصرے کے علاوہ انہوں نے دمشق آنے والے تمام راستوں کی ناکا بندی بھی کر رکھی تھی جس کے باعث رومیوں کو کسی قسم کی فوجی مدد اور سامان رسد وغیرہ نہ پہنچ سکا ۔ مجبور ہو کر رومیوں نے صلح کی درخواست کی اور شہر کے دروازے مسلمانوں کے لیے کھول دیے ۔

دمشق کی فتح کے بعد مسلمانوں نے فحل کا قصد کیا ۔ فحل جانے والی فوج کے سالار شرحبیل بن حسنہ تھے ۔ انھوں نے خالد بن ولید کو مقدمہ پر ، عمرو بن العاص کو مجنبہ پر ، ضرار بن ازور کو سواروں پر اور عیاض کو پیدل سپاہ پر متعین کیا ۔ اس فوج نے شدید مقابلوں کے بعد ، فحل ، بیان اور طبریہ پر قبضہ کر لیا ۔ طبری اور یاقوت کے بیان کے مطابق ان معرکوں میں اسی ہزار رومی کام آئے ۔

۲ : عمرو بن العاص اور جنگ اجنادین

عمرو بن العاص نے فلسطین میں رومیوں کے جرار لشکروں کو

شکست فاش دینے کے بعد یرموک ، دمشق ، فحل اور بیسان کے معرکوں میں بھی شرکت کی تھی ، اس طرح آپ کی جنگی سر گرمیوں کا دائرہ صرف فلسطین ھی تک محدود نہ رھا بلکہ اردن اور شام تک پھیل گیا۔ جب سے آپ نے اس سرزمین میں قدم رکھا آپ چین سے نہ بیٹھے بلکہ برابر دشمنوں کی بیخ کنی اور جہاد میں مشغول رھے ۔ شام اور اردن کی فتوحات سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ دوبارہ فلسطین کی جانب متوجہ ھوئے اور وھاں سے رومی اقتدار کا مکمل خاتمہ کرنے اور ان شہروں کو فتح کرنے کی تدابیر اختیار کرنے لگے جو اب تک فتح نہ ھوئے تھے۔ جس زمانے میں ابوعبیدہ شمالی شام کے شہروں حمص ، قنسرین ، حلب ، لاذقیہ وغیرہ کی فتوحات میں مشغول تھے اسی زمانے میں فلسطین میں عمرو بن العاص کی عظیم الشان فتوحات بھی ابوعبیدہ کی فتوحات سے کچھ کم نہ تھیں ۔

اس زمانے میں فلسطین کا رومی حاکم ' ارطبون ' * تھا جو عقلمندی اور فرزانگی میں عمرو بن العاص کا ھم پلہ تھا ۔ اس نے بیت المقدس ، غزہ اور رملہ میں زبردست فوجیں جمع کر رکھی تھیں اور خود ایک عظیم الشان لشکر لیے ھوئے اجنادین† میں خیمہ زن تھا ۔

جب عمرو بن العاص کو معلوم ھؤا کہ رومیوں کی تعداد

---

* بٹلر لکھتا ھے کہ عرب مؤرخین نے اس رومی حاکم کا نام ' ارطبون ' غلط بیان کیا ھے ۔ اس کا اصل نام ' اریطیون ' تھا ۔

† اجنادین کے متعلق یاقوت معجم البلدان میں لکھتے ھیں " اجنادین فلسطین کی جانب شام کا ایک مشہور قصبہ ھے اور بیت جبرین کے ضلع میں شامل ھے ۔"

ان کے اندازے سے بہت زیادہ ہے تو انہوں نے حضرت عمر کو مدد کے لیے لکھا ۔ حضرت عمر نے انہیں لکھ بھیجا " ہم نے رومی ارطبون کے مقابلے میں عربی ارطبون کو بھیجا ہے ، اب دیکھیں کون بازی لے جاتا ہے ۔" ساتھ ہی آپ نے شامی سپہ سالاروں کو لکھا کہ وہ اپنی فوجوں کے ہمراہ قیساریہ ، رملہ اور ایلیاء (بیت المقدس) پہنچ جائیں تاکہ رومیوں کی توجہ کئی جانب بٹی رہے اور وہ مجتمع ہو کر عمرو بن العاصؓ کے مقابلے میں نہ آ سکیں ۔

ادھر عمرو بن العاص نے ارطبون کی قوت توڑنے کے لیے اجنادین کی جانب پیش قدمی شروع کی اور مقدمۃالجیش پر شرحبیل بن حسنہ کو مقرر کیا ۔ اجنادین پہنچ کر آپ نے شہر کا محاصرہ کر لیا ۔ محاصرہ کافی مدت تک جاری رہا لیکن شہر فتح نہ ہوسکا۔ آپ نے قلعہ کے استحکام اور فوج کی حالت کا اندازہ کرنے کے لیے متعدد لوگوں کو قاصد بنا کر ارطبون کے پاس بھیجا مگر وہ لوگ واپس آ کر فوج اور قلعے کی جو کیفیت بیان کرتے تھے اس سے عمرو بن العاص کی تشفی نہ ہوتی تھی ۔ آخر آپ نے خود قلعے کے اندر جانے اور ارطبون کے تمام انتظامات بچشم خود ملاحظہ کرنے کا ارادہ کیا ۔ چنانچہ آپ نے قاصد کا بھیس بدلا اور گفتگوئے مصالحت کے لیے ارطبون کے پاس پہنچ گئے ، باتیں کرتے جاتے تھے اور کن انکھیوں سے دشمن کی فوج اور قلعے کی فصیلوں کا جائزہ لیتے جاتے تھے۔ ارطبون بھی بڑا چالاک آدمی تھا ، وہ تاڑ گیا کہ عمرو بن العاص خود آئے ہیں ۔ اس نے چند آدمی راستے میں چھپا دیے کہ عمرو بن العاص ادھر سے گزریں تو وہ کمین گاھوں سے نکل کر انھیں قتل کر دیں۔ عمرو بن العاص بھی ذہانت اور فطانت سے ارطبون کا ارادہ بھانپ گئے اور

بڑی ہوشیاری سے باتوں باتوں میں ارطبون کی نظر بچا کر قلعے سے نکل آئے - جب ارطبون کو معلوم ہؤا کہ عمرو بن العاص اس کے چنگل سے نکل گئے تو اس نے کہا "افسوس! میں نے دھوکا کھایا - یہ شخص مجھ سے بھی زیادہ ہوشیار ہے -" حضرت عمر کو جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے بھی عمرو بن العاص کی عقلمندی کی تعریف فرمائی -

عمرو بن العاص قلعے کی حالت بچشم خود دیکھ آئے تھے - اب آپ نے فوج کو لڑائی کے لیے تیار کیا اور فصیل کی چاروں طرف سے شدید حملے شروع کردیے - ارطبون اسی ہزار فوج کے ساتھ باہر نکلا - یرموک کی طرح یہاں بھی دن رات شدید جنگ ہوئی، آخر ارطبون نے شکست کھائی اور وہ اپنی ہزیمت خوردہ فوج کے ہمراہ بیت المقدس چلا گیا - یہ جنگ ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ء میں ہوئی -

اجنا دین کی لڑائی کے متعلق مؤرخین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے - بعض مؤرخین جن میں واقدی، یا قوت اور ایر فنج شامل ہیں، لکھتے ہیں کہ فتح اجنا دین ۱۳ھ میں بصریٰ کی فتح کے بعد اس وقت ہوئی جب عرب دمشق کے محاصرے میں مشغول تھے - جب انھوں نے سنا کہ ہرقل نے 'وردان* ' کی سر کردگی میں ایک لاکھ رومیوں کا عظیم الشان لشکر ان کے مقابلے کو بھیجا ہے تو انھوں نے دمشق کا محاصرہ ختم کرکے رومیوں سے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں جو فتح اجنا دین پر منتج ہوئیں - حضرت ابوبکر صدیق کی وفات بھی ۱۳ھ میں

---

* یاقوت حموی نے اس فوج کے سپہ سالار کا نام 'وردان' کے بجائے 'ارطبون' ہی لکھا ہے (معجم البلدان، صفحہ ۱۲۶)

دمشق کی فتح سے قبل ہوئی لیکن دوسرا گروہ جس میں طبری ، بلاذری ، یعقوبی اور ابن اثیر شامل ہیں یہ کہتا ہے کہ دمشق کی فتح سے قبل یعنی ۱۳ھ میں جنگ اجنا دین نہیں بلکہ جنگ یرموک پیش آئی اور جنگ اجنا دین کا واقعہ ۱۵ھ میں رونما ہؤا - واقدی اور بعض یورپی مؤرخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اجنا دین کی جنگ دو بار واقع ہوئی - ایک مرتبہ ۱۳ھ میں فتح دمشق سے پہلے اور دوسری مرتبہ جنگ یرموک کے بعد ۱۵ھ میں - ہماری رائے بھی یہی ہے کہ اجنا دین کی جنگ دو بار ہوئی - پہلی مرتبہ ۱۳ھ میں یہاں رومیوں سے مقابلہ پیش آیا - اس کے بعد دونوں متحارب فریق دوسرے علاقوں کے اندر باہمی زور آزمائی میں مشغول ہوگئے - آخر مسلمانوں نے دو بارہ یہاں آکر تسلسط حاصل کیا -

طبری کی ایک اور روایت جو انہوں نے ابن اسحاق سے لی ہے یورپی مؤرخین کی اس رائے کے مطابق ہے کہ فتح اجنا دین ۱۳ھ میں ہوئی جب اسلامی فوجیں عمرو بن العاص کی امداد کے لیے اکٹھی ہوئی تھیں -

یورپی مؤرخین اور واقدی یہ بھی کہتے ہیں کہ عمروبن العاص اس خط و کتابت کے نتیجے میں جو انہوں نے خالد بن ولید اور دیگر اسلامی سپہ سالاروں سے کی تھی خالد بن ولید کی مدد کے لیے آئے تھے -

ان متناقص روایات میں تطابق کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ ہم اجنا دین کی لڑائی کا وقوع دو بار قرار دیں - پھر بھی ہمارا مقصد جنگوں کی ترتیب پر بحث کرنا نہیں بلکہ صرف یہ بیان کرنا ہے کہ عمرو بن العاص کا ان جنگوں سے کیا تعلق

تھا اور آپ نے ان میں کیا کیا کارھائے نمایاں انجام دیے۔
ارطبون پر حضرت عمرو بن العاص کی شاندار فتح کا نتیجہ یہ ھؤا کہ فسلطین کے متعدد شہروں یافا، نابلس، عسقلان، غزہ، رملہ، عکاء، بیروت، لد، جبلہ وغیرہ پر آسانی سے مسلمانوں کا تسلط ھوگیا۔ صرف بیت المقدس پر مسلمان بہ سہولت قبضہ نہ کرسکے۔

س: عمرو بن العاص اور فتح بیت المقدس

اجنادین کی جنگ کے بعد رومیوں نے فلسطین کے صدر مقام بیت المقدس کو مسلمانوں سے مقابلے کے لیے منتخب کیا۔ چاروں طرف سے رومی فوجیں وھاں آ آ کر جمع ھونے اور جنگی تیاریاں کرنے لگیں۔ شہر کی فصیلوں کو مزید مستحکم کیا گیا اور ان پر منجنیق چڑھا دیے گئے۔

غزہ اور لد وغیرہ کی فتوحات سے فراغت کے بعد عمروبن العاص نے بیت المقدس کا قصد کیا*۔ شروع ھی سے آپ کی کوشش یہ تھی کہ بغیر لڑے بھڑے شہر پر قبضہ ھو جائے۔ اس غرض کے لیے آپ نے سفیروں کے ذریعے سے ارطبون کے ساتھ گفت وشنید شروع کی اور اسے لکھا کہ شہر ان کے حوالے کر دیا جائے۔ اس کا جواب ارطبون نے یہ دیا:

---

*بعض مؤرخین نے لکھا ھے کہ حضرت عمر نے عمرو بن العاص کے بجائے ابوعبیدہ کے سپرد بیت المقدس کی فتح کا اھم کام کیا تھا۔ ابوعبیدہ نے پہلے یزید بن ابی سفیان کو پانچ ھزار فوج کے ھمراہ بیت المقدس بھیجا، پھر خود بھی بقیہ اسلامی لشکر کے ھمراہ جس میں عمرو بن العاص بھی تھے بیت المقدس پہنچ گئے۔

"آپ میرے دوست ہیں اور آپ کو اپنی قوم میں وہی حیثیت حاصل ہے جو مجھے اپنی قوم میں حاصل ہے۔ آپ اس خیال میں نہ رہیں کہ اجنادین کے بعد بھی آپ کوئی فتح حاصل کرسکیں گے۔ میں آپ کو مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ واپس چلے جائیں اور اپنی قوت و طاقت پر نازاں نہ ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو بھی ویسی ہی عبرت ناک شکست اٹھانی پڑے جیسی آپ سے پہلے حملہ آوروں کو اٹھانی پڑی تھی۔"

یہ خط پہنچنے پر عمرو بن العاص نے ایک ایسے شخص کو بلایا جو رومی زبان اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے ہاتھ ارطبون کو یہ خط ارسال کیا:

"تمہارا خط ملا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تمہیں اپنی قوم میں وہی حیثیت حاصل ہے جو مجھے اپنی قوم میں ہے پھر بھی تم نے میرے مرتبے کا اندازہ کرنے میں غلطی کی۔ مجھے ایک بات میں تم پر فضیلت حاصل ہے اور وہ فضیلت یہ ہے کہ میری حیثیت ایک فاتح کی ہے اور تمہاری مفتوح کی۔"

یہ ساری خط و کتابت عمرو بن العاص نے اجنا دین میں بیٹھے بیٹھے کی تھی جس کے بعد انھوں نے بیت المقدس پہنچ کر چاروں طرف سے شہر کا محاصرہ کرلیا لیکن وہ خاصی مدت تک رومیوں کو مطیع ہونے پر مجبور نہ کرسکے۔ مسلمانوں کو شدت سرما کے علاوہ ان منجنیقوں کی سنگ باری سے بھی بے حد نقصان اٹھانا پڑا جو رومیوں نے شہر کی فصیل پر نصب کر رکھے تھے اور جن سے رات دن اسلامی فوجوں پر سنگ باری ہوتی رہتی تھی۔ مسلمان چار ماہ تک بڑے صبر و استقلال سے شہر کا محاصرہ کیے پڑے رہے۔ اس دوران میں کوئی دن ایسا

نہ گزرتا تھا جس میں رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان چھوٹی موٹی جھڑپیں نہ ہوتی ہوں ۔

جب اہل شہر نے محاصرے کی شدت اور مسلمانوں کا استقلال دیکھا تو وہ سخت گھبرا اٹھے۔ تسخیر شہر کے متعلق مسلمانوں کی خواہش میں سیاست سے زیادہ مذہبی جذبات کو دخل تھا ۔ وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بعد بیت المقدس کو دنیا میں سب سے زیادہ مقدس شہر سمجھتے تھے کیونکہ یہ سر زمین انوارالٰہی کے نزول کی جگہ تھی - یہیں حضرت عیسیٰؑ پر وحی نازل ہوئی تھی اور اسی شہر میں اللہ کے متعدد برگزیدہ نبیوں کے مزار تھے - جب مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا تو ابو عبیدہ نے اہل بیت‌المقدس کے نام ایک خط لکھا کہ یا تو وہ اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد پر ایمان لے آئیں یا مسلمانوں کی اطاعت اور ادائے جزیہ قبول کرلیں ۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو مسلمان تو ہر قیمت پر شہر حاصل کرکے ہی رہیں گے لیکن ان کی خیر نہ ہوگی اور اسلامی فوج ان کے اہل و عیال اور مال اسباب سب کو تباہ و برباد کرکے رکھ دے گی ۔

اس دھمکی کا اثر خاطر خواہ ہؤا ، شہر والے مارے خوف کے کانپنے لگے۔ ادھر ارطبون نے جب اپنے آپ میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہ دیکھی تو وہ شہر والوں کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ چپ چاپ شہر سے نکل کر مصر بھاگ گیا۔ یہ دیکھ کر شہر کے رؤساء ایک جگہ جمع ہوئے اور مشورہ کرنے لگے کہ اس نازک وقت میں انہیں کیا کرنا چاہیے اور اس عظیم مصیبت کو جو ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے کس طرح دور کرنا چاہیے ۔

طویل و شدید محاصرے اور ارطبون کے شہر والوں کو

بے یار و مددگار چھوڑ جانے سے ان کی حالت انتہائی قابل رحم ہوگئی تھی - انہیں کسی بھی جگہ سے امداد پہنچنے کی توقع نہ تھی - ادھر مسلمان شام کے تمام بڑے بڑے شہروں پر قابض ہو چکے تھے اور ملک کا بیشتر حصہ اُن کے قبضے میں آ چکا تھا - رومی حکومت ان کے مقابلے سے عاجز تھی اور شام سے اسے ذلت کے ساتھ پسپا ہونا پڑا تھا - اس حالت میں بیت المقدس کے لوگوں کو یقین تھا کہ مسلمان انہیں کسی حالت میں بھی چھوڑنے والے نہیں اور وہ آن پر آج نہیں تو کل ضرور غالب آ جائیں گے - تمام رؤساء کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ اب بجز صلح کوئی چارہ نہیں ، لیکن دوسری طرف انہیں یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر انہوں نے شہر کو مسلمانوں کے حوالے کر دینے پر آمادگی ظاہر کی تو مسلمان آن سے آن شرائط پر مصالحت نہ کریں گے جن پر وہ دوسرے شہروں کے لوگوں سے کر چکے تھے کیونکہ بیت المقدس کے محاصرے میں مسلمانوں کو بہت تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور خاصا نقصان اٹھانا پڑا تھا - انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ بیت المقدس مسلمانوں کے نزدیک بھی قابل احترام ہے اس طرح انہیں یہ خطرہ تھا کہ کہیں مسلمان آن سے ان کا کلیسائے اعظم نہ چھین لیں اور انہیں ان کے مقدس ترین مقام سے محروم نہ کردیں - اس لیے ان کی یہ رائے ہوئی کہ امیر المومنین عمر بن الخطاب خود آن سے مصالحت کریں تاکہ مسلمان اپنے عہد کا پاس اچھی طرح کرسکیں اور شہر والوں کو کامل امان حاصل ہوسکے - چنانچہ ان کا بطریق 'سفرونیوس' فصیل کے اوپر چڑھا اور پکار کر مسلمانوں سے کہا کہ ہم صلح کرنے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ خلیفۂ اسلام بنفس نفیس تشریف لا کر ہم سے صلح کی شرائط طے کریں - مسلمان امراء نے اس پیش کش کی

اطلاع حضرت عمر کو دی ۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد عیسائیوں کی یہ شرط قبول کرلی اور حضرت علی کو اپنا نائب بنا کر خود بیت المقدس روانہ ہوگئے ۔ جابیہ کے مقام پر صلح نامہ لکھا گیا جس پر مسلمان امراء کے (جن میں عمرو بن العاص بھی تھے) دستخط ہوئے ۔ صلح نامہ کا مضمون بیشتر کتب تاریخ میں مذکور ہے*۔ صلح نامہ کی تکمیل کے بعد بیت المقدس والوں نے فوراً شہر کے دروازے کھول دیے ۔ یہ عظیم الشان فتح ۱۵ھ کے اواخر یا ۱۶ھ کے اوائل میں ہوئی ۔ (گبن ، جلد ۹ ، صفحہ ۲۴۹)

---

* صلح نامہ کا مضمون یہ تھا :

" یہ وہ امان نامہ ہے جو امیرالمومنین عمر بن الخطاب نے ایلیاء (بیت المقدس) والوں کو دیا ہے ۔ ایلیاء والوں کی جان ، مال ، گرجے ، صلیب ، بیمار ، تندرست سب کو امان دی جاتی ہے ۔ اور ہر مذہب والے کو امان دی جاتی ہے ۔ ان کے گرجاؤں کو قیام گاہوں میں تبدیل نہ کیا جائے گا اور نہ انہیں ڈھایا جائے گا یہاں تک کہ ان کے احاطوں کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائے گا ۔ نہ ان کی صلیبوں اور مالوں میں کسی قسم کی کمی کی جائے گی ۔ نہ مذہب کے بارے میں کسی قسم کا تشدد کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے گا ۔ ایلیاء میں ان کے ساتھ یہودی نہ رہنے پائیں گے (اس شرط سے حضرت عمر کی حیرت انگیز دور بینی اور غایت درجہ بصیرت کا پتا چلتا ہے ۔ آپ نے آج سے چودہ سو سال پہلے بھانپ لیا تھا کہ یہودی اس سرزمین میں اقامت اختیار کرکے اسے قبضے میں لانا چاہیں گے

باقی صفحہ ۷۹ پر

قسطنطین بن ھرقل کی شکست

بیت المقدس کی فتح کے بعد عمرو بن العاص ان متفرق رومی فوجوں کا استیصال کرنے میں مشغول ہوئے جو فلسطین کے مختلف مقامات میں موجود تھیں ۔ اپنی خداداد قابلیت اور جنگی مہارت کی بدولت آپ سب جگہ مظفر و منصور ہوئے ۔ اب صرف قیساریہ باقی رہ گیا تھا جہاں ھرقل کا بیٹا قسطنطین ایک بھاری فوج لیے پڑا تھا جس پر عمرو بن العاص نے ادھر کا رخ کیا مگر اسی اثناء میں قسطنطین کو یہ خبر ملی کہ طبریہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا ہے اور اس کا باپ انطاکیہ سے بھاگ کر قسطنطنیہ چلا گیا ہے ۔ یہ خبریں سن کر خوف اور دھشت نے اس پر غلبہ پا لیا اور اسے راتوں کو ایسا معلوم ہونے لگا جیسے

اس لیے پیش بینی کے طور پر آپ نے اس شرط کا اضافہ کیا ۔ کاش موجودہ زمانے کے مسلمان بھی اسی احتیاط سے کام لیتے اور 'اسرائیل' کے ناسور کو پھوٹنے سے، نمودار ہونے سے باز رکھ سکتے) ۔ ایلیاء والوں کا فرض ہے کہ وہ جزیہ دیں اور رومیوں کو نکال دیں ۔ رومیوں میں سے جو شہر سے نکل جائے گا اس کے جان و مال کو امان دی جاتی ہے جب تک وہ محفوظ مقام تک نہ پہنچ جائے ۔ اگر کوئی رومی ایلیاء ھی میں رھنا چاھے تو اسے باقی اھل شہر کی طرح جزیہ ادا کرنا ھوگا اور اگر اھل ایلیاء میں سے کوئی شخص رومیوں کے ساتھ جانا چاھے تو اسے امن و امان ہے یہاں تک کہ وہ محفوظ مقام پر پہنچ جائے ۔ جو کچھ اس عہد نامے میں درج ہے اس پر خدا اور رسول اور خلیفہ اور تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے بشرطیکہ اھل ایلیاء مقررہ جزیہ ادا کرنے سے انکار نہ کریں ۔" (مترجم)

عمرو بن العاص شہر کی فصیل توڑ کر اپنی فوج کے ساتھ اندر گھس آئے ہیں - چنانچہ اسلامی فوجوں کا اس پر ایسا رعب طاری ہؤا کہ ایک رات وہ خفیہ طور پر اپنے محل سے بھاگ نکلا اور قسطنطنیہ جا کر ہی دم لیا - جب صبح ہوئی اور شہر والوں کو معلوم ہؤا کہ ان کا سپہ سالار بزدلی دکھا کر بھاگ گیا ہے تو ان کی ہمتیں بھی پست ہو گئیں اور انہوں نے عمرو بن العاص سے صلح کی درخواست کی جو آپ نے قبول کرلی اور ۱۷ھ (مطابق ۶۳۹ء) میں اس شہر پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا -

شام اور فلسطین کی فتوحات کے بعد اب عمرو بن العاص نے اپنی توجہ مصر کی جانب منعطف کی -

مسلمانوں کی پے در پے فتوحات سے شام میں رومی سلطنت کو تو سخت ضعف پہنچا ہی تھا لیکن مسلمانوں کا نقصان بھی کچھ کم نہ ہؤا - انھیں ہر سال مہینوں اس علاقے کی شدید سردی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور یہ حالت ان کے لیے نا قابل برداشت تھی - جو مسلمان ان جنگوں میں شہید ہوئے ان کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی خصوصاً یرموک ، دمشق ، بیت المقدس اور حلب کی جنگوں میں تو مسلمانوں کو بھاری جانی نقصان سے دو چار ہونا پڑا - ایر فنچ لکھتا ہے کہ شامی جنگوں میں مسلمان مقتولوں کی تعداد پچیس ہزار سے کسی صورت بھی کم نہ تھی - شہداء کی اس کثرت نے اس سرزمین کو مسلمانوں کے لیے بے حد قیمتی بنا دیا تھا اور وہ اس سے کسی طرح دست برداری اختیار نہ کر سکتے تھے -

عمرو بن لعاص نے ان جنگوں میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ کھلی کتاب کی طرح سامنے ہیں - آپ نے ہرجنگ میں امکانی

تدبیر سے کام لیا کہ مسلمانوں کا کم سے کم نقصان ہونے پائے
اور دشمنوں کو زیادہ سے زیادہ زک پہنچائی جائے اور آپ اپنے
اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے ۔ آپ بیک وقت بہادر اور
دلیر سپہ سالار ، مشفق ، ناصح اور مدبر تھے ۔ آپ نے عقلمندی ،
دلیری اور بہادری میں وہ درجہ حاصل کر لیا تھا جو اس وقت کے
دوسرے مسلمان سپہ سالاروں میں سے بہت کم کو نصیب ہو سکا ۔

دوسرا حصّہ

فتح مصر

پہلا باب

اسلامی فتوحات سے قبل مصر کی حالت

مصر میں اسلامی فتوحات کا تذکرہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ظہور اسلام سے دو سو سال قبل تک کے اُن مذہبی اور سیاسی حالات پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے جن میں سے اہل مصر کو گزرنا پڑ رہا تھا ۔ ان حالات کے مطالعے سے معلوم ہو گا کہ اس دور میں مصریوں کو غیر ملکی حکمرانوں کے ہاتھوں کس قدر شدید تکالیف پہنچیں اور کتنے بدترین مظالم برداشت کرنے پڑے ۔ غیر ملکی حکمرانوں نے مصریوں کو نہ صرف اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا بلکہ ان میں داخلی اختلافات کو ہوا دے کر خانہ جنگی کی آگ بھڑکا دی ، یہاں تک کہ وہاں کے باشندے ظلم و تعدی کی اس لامتناہی زندگی سے تنگ آ کر اپنے لیے موت کی آرزو کرنے لگے ۔

۱ : مذہبی حالت

مصری ، قیصر آگسٹس رومی کے عہد تک بت پرست تھے ۔

حضرت عیسیٰ کی بعثت کے بعد یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کرنی شروع کی لیکن ان کے رومی آقا یہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے کہ ان کی ایک غلام قوم وہ مذہب اختیار کرے جس کی بیخ کنی کے لیے وہ ہر ممکن طریق سے کوشاں تھے۔ انھوں نے مصری عیسائیوں پر سختی شروع کی۔ بعض کو قتل کیا اور بعض کو جلا وطن۔ قیصر 'دقلدیانوس' کے برسراقتدار آنے پر ان سختیوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اس نے عیسائیوں کے تمام گرجے حکماً بند کر دیے اور انھیں بے دریغ قتل کرنا شروع کیا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا کہ رومی حاکموں کے ہاتھ بد قسمت مصری عیسائیوں کے خون سے رنگے نہ جاتے ہوں۔

دقلدیانوس کے عہد میں مصریوں پر اس قدر ظلم و ستم کے اسباب سیاسی بھی تھے اور مذہبی بھی۔ اسے برسراقتدار آئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ اسکندریہ میں اس کے خلاف بغاوت پھیل گئی۔ ایک رومی شخص 'لوسیوس دومتیانوس' نے مصریوں کو ساتھ ملا کر خود شہنشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنا لقب 'أفیلوس' رکھا۔ بغاوت کی یہ آگ اس شدت سے بھڑکی کہ اسے فرو کرنے کے لیے خود قیصر دقلدیانوس کو مصر آنا پڑا۔ اس نے آٹھ ماہ تک سختی سے اسکندریہ کا محاصرہ کیے رکھا۔ اس محاصرے میں شہر کی کئی عمارتیں برباد ہو گئیں۔ آخر کار جب شہر والے بھوک پیاس سے تنگ آ گئے تو انھوں نے مجبوراً شہر کے دروازے کھول دیے اور دقلدیانوس شہر پر قابض ہوگیا۔ اسکندریہ کی فتح کے بعد جس قدر مظالم وہ مصریوں پر ڈھا سکتا تھا اس نے ڈھائے اور کسی قسم کی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ واقعہ ۲۹۶ء کا ہے۔

یہ تو ایک عام بغاوت تھی جو دقلدیانوس کے خلاف اس کے عہد حکومت کے اوائل میں برپا ہوئی اور جس میں مسیحی و غیر مسیحی کا کوئی امتیاز نہ تھا ۔ لیکن اس کے بعد دقلدیانوس کے خلاف ایک زبردست شورش برپا ہوئی جو خالصتاً عیسائیوں کی طرف سے تھی ۔

نئی حکومت کا نظام شہنشاہ کی تقدیس اور اس کی مذہبی برتری پر بے حد زور دیتا تھا ۔ اس نظام میں شہنشاہ کی حیثیت ملکی فرمانروا کے علاوہ سب سے بڑے مذہبی رہنما کی بھی تھی ۔ تمام قربانیاں اس کے آگے گزاری جاتی تھیں اور اس کی پرستش اسی طرح کی جاتی تھی جس طرح دوسرے معبودوں کی ۔

نظام حکومت میں اس تبدیلی نے عیسائیوں میں سخت بے چینی پیدا کر دی ۔ وہ شہنشاہ کو اپنا مذہبی رہنما ماننے اور اس کے آگے سر خم کرنے کو کسی طرح تیار نہ تھے ۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ وہ اپنے مذہب کی حفاظت کے لیے حکومت کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے ۔ اس نظام حکومت اور سیاست کے خلاف جو جوش و خروش مصر میں تھا وہ رومیوں کے دوسرے مقبوضات میں نہ تھا ۔ وجہ یہ تھی کہ مصری حد درجہ قدامت پرست اور جنون کی حد تک اپنے مذہب سے شغف رکھنے والے تھے ۔ مذہب میں معمولی سی مداخلت بھی ان کی آتش غضب کو بھڑکا دینے کے لیے کافی تھی ۔ چنانچہ باوجودیکہ رومیوں نے شہنشاہ کی تقدیس منوانے کے لیے مصریوں پر ہر قسم کا جبر و تشدد کیا لیکن مصری شہنشاہ روم کو الوہیت کا درجہ دینے پر قطعاً آمادہ نہ ہوئے ۔ (ملن صفحہ ۸۷)

دقلدیانوس اور دوسرے رومی شہنشاہ مسیحیوں کو حکومت اور

مذہب کا باغی خیال کرتے تھے - ان کا واحد مقصد یہ تھا کہ ہر ممکن طریق سے مسیحیوں کو بت پرستی اختیار کرنے اورعام ملکی قوانین کے آگے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کیا جائے ، خواہ ایسا کرنے میں انھیں انتہائی جبروتشدد اور ظلم وستم سے کام لینا پڑے- اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے غریب عیسائیوں کے خون کی ندیاں بہائیں اور ان پر ایسے درد انگیز مظالم توڑے جن کی کیفیت پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں -

یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ دقلدیانوس نے اپنے عہد حکومت میں کس قدر مصریوں کا خون بہایا ، تاہم اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے - یہ ظلم و ستم مصریوں کے کسی خاص طبقے تک محدود نہ تھا بلکہ اس میں ملک کے تمام طبقے شامل تھے - ظلم و ستم کا یہ سلسلہ ۳۰۱ء سے شروع ہؤا اور ۳۱۳ء تک جاری رہا - اس دور میں دقلدیانوس نے جس شقاوت ، سنگدلی اور بہیمیت کا ثبوت دیا اس کی مثال ظلم و استبداد کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی - اب تک اہل مصر دقلدیانوس کے عہد حکومت کو ظلم و ستم کے لیے بطور مثال پیش کرتے ہیں -

دقلدیانوس کے بعد جب قسطنطین (۳۱۳ء تا ۳۳۷ء) تخت نشین ہؤا تو اس نے اپنا قدیمی مذہب ترک کر کے مسیحیت اختیار کر لی - اس وقت سے سلطنت کا سرکاری مذہب بھی دین عیسوی ہی قرار پایا لیکن مصریوں کو ظلم و ستم کے لامتناہی چکر سے نجات نہ مل سکی - اب تک مصر کے مسیحی ، بت پرست رومیوں کے ظلم و ستم کا شکار تھے - سلطنت کا سرکاری مذہب عیسائیت قرار پانے کے بعد بت پرست مصری رومی عسیائیوں کے مظالم کا نشانہ بننے لگے- جب رومی شہنشاہ، تھیوڈوسس (۳۷۸ء تا ۳۹۵ء)

نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اس نے حکم دے دیا کہ سلطنت میں جتنے باشندے ہیں انہیں جبراً عسیائی بنا لیا جائے اور قلمرو میں جتنے ہیکل اور بت خانے ہیں سب بند کر دیے جائیں - چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور بت پرستوں پر اسی شدت سے مظالم ڈھائے جانے لگے جیسے اس سے قبل عسیائیوں پر ڈھائے جاتے تھے (ملن ، صفحہ ۹٦)

اختلاف مذہب کا یہ سلسلہ اسی حد تک پہنچ کر ختم نہ ہؤا بلکہ اب اس نے ایک اور شکل اختیار کر لی یعنی کہ خود عسیائیوں میں مذہبی اختلافات پیدا ہو گئے جس کے باعث وہ دو بڑے بڑے گروہوں میں بٹ گئے - ان گروہوں کی باہمی دشمنی بت پرستوں اور عیسائیوں کی دشمنی سے کسی طرح کم نہ تھی - یہ دو فرقے یعقوبی اور ملکی تھے - ان کا اختلاف خدا اور حضرت عیسیٰؑ یا بہ‌الفاظ دیگر باپ اور بیٹے کے درمیانی علاقے کی کنہ کے متعلق تھا - اس اختلاف نے مذہبی اہمیت کی حد سے گزر کر سیاسی اہمیت اختیار کر لی اور مصر کی آئندہ سیاست پر اس کا گہرا اثر پڑا -

یعقوبیوں کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ کے اندر الوہیت اور بشریت دونوں جمع ہوگئی تھیں - پیدائش سے پہلے ان کی طبیعت صرف لاہوتی تھی ، انسانی جسم اختیار کرنے کے وقت بشری ہو گئی لیکن بعد میں پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ گئی - اس طرح الوہیت ، بشریت دونوں آپ میں مجتمع ہو گئیں لہذا آپ کو انسان کامل نہیں کہا جا سکتا -

اس کے برعکس ملکی کہتے تھے کہ بیٹا ازل سے باپ سے مولود ہے اور اس کا جوہر ، نور اور غیر مخلوق ہے - وہی اس

انسان کے ساتھ ، جو مریم کے شکم سے تھا ، متحد ہو کر ایک بن گیا جس کا نام مسیح رکھا گیا ۔

جب اس نزاع نے شدت اختیار کی تو قیصر 'مرقیانوس' (۴۵۰ء تا ۴۵۷ء) نے پاپائے روم کے مشورے سے 'خلقدونیہ' کے مقام پر پادریوں کی ایک کانفرنس طلب کی جس میں اس اختلاف پر غور کیا گیا ۔ اس کانفرنس نے خاصی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ کیا کہ اسکندریہ کا بطریق اور یعقوبی فرقے کا بانی 'دیوسقوروس' غلطی پر ہے اس لیے اسے اس منصب سے معزول کر دیا جائے اور تمام اختیارات چھین لیے جائیں ۔ ساتھ ہی بادشاہ نے ساری مملکت میں گورنروں کے نام یہ حکم بھی بھیج دیا کہ دیوسقوروس کا عقیدہ رکھنے والے ہر شخص کو قتل کر دیا جائے ۔

دیوسقوروس کی جگہ ایک 'ارثودکسی' کو اسکندریہ کا بطریق مقرر کیا گیا لیکن اہل مصر نے ، جو زیادہ تر یعقوبی فرقے سے تعلق رکھتے تھے ، اس حکم کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کھلم کھلا رومیوں کے مقرر کردہ بطریق کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوئے ۔ رومی یہ کیونکر برداشت کر سکتے تھے ؟ انھوں نے مصریوں پر سخت مظالم ڈھانے شروع کیے ۔ سیراپیس کی ہیکل کو ان بیش قیمت اشیاء کے ساتھ ، جو اس میں موجود تھیں ، آگ لگا دی گئی اور شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا گیا ۔ مصریوں کے تمام تہوار ممنوع قرار دے دیے گئے ، حمام بند کر دیے گئے اور یعقوبیوں کی حمایت یا ان سے اظہار ہمدردی کرنا سخت جرم قرار دے دیا گیا* ۔

* ملن ، صفحہ ۱۰۱ و ۱۰۲ ۔

یہ مذہبی اختلافات مصریوں کے لیے عذاب کا موجب بن گئے - اگر ملکی فرقے سے تعلق رکھنے والا کوئی قیصر تخت نشین ہوتا تو وہ یعقوبیوں کو ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا اور اگر کوئی یعقوبی قیصر اورنگ سلطنت پر متمکن ہوتا تو ملکی باشندوں کو مظالم کا نشانہ بننا پڑتا -

اس بہیمیت کا ہولناک ترین دور وہ تھا جب قیصر 'جوسٹینس' (۵۱۸ء تا ۵۲۷ء) نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی - اس نے ایک ملکی بطریق کو اسکندریہ بھیجا - مصریوں نے حسب معمول اس کے خلاف مظاہرے کیے یہاں تک کہ ایک فوجی معرکہ پیش آیا جس سے شہر کی گلیاں وہاں کے اصلی باشندوں اور رومیوں کی لاشوں سے اٹ گئیں اور دارالحکومت تیسری بار آگ کی لپیٹ میں آ گیا -

بالآخر اہل شہر نے ملکی بطریق کو نکال باہر کیا اور ایک یعقوبی کو بطریق کی کرسی پر لا بٹھایا - رومی شہنشاہ اس وقت تو کچھ نہ کر سکا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ملکی بطریقوں سے مصریوں کا بغض انتہا کو پہنچ چکا ہے اور وہ آسانی سے رومی بطریق کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تو اس نے بھی تہیہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو وہ رومی بطریق کو مقرر کر کے ہی دم لے گا ، خواہ ایسا کرنے میں کتنی ہی جانیں ضائع ہو جائیں -

اس غرض کے لیے اس نے ایک شخص ' اپولیناریس ' کو مقرر کیا - وہ ایک فوجی کا بھیس بدل کر اسکندریہ میں داخل ہؤا - شہر کی گلیوں اور بازاروں میں اس نے جا بجا مسلح سپاہی متعین کر دیے - اسی طرح کلیسا کے چاروں طرف بھی سپاہیوں نے گھیرا ڈال لیا - کچھ سپاہیوں کو اس نے اپنی حفاظت کے

لیے ساتھ لیا اورگرجے میں داخل ہو کر منبر پر کھڑا ہو گیا ۔ جب گرجا لوگوں سے بھر چکا تو اس نے فوجی وردی اتار دی ۔ لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ اس کے جسم پر اسکندریہ کے بطریق کا لباس ہے ۔ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن حاضرین نے گالیوں اور پتھروں سے اس کا استقبال کیا ۔ وہ کچھ دیر تک کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا ، پھر یکایک اس نے اشارہ کیا اور پلک جھپکنے میں فوج مقامی باشندوں پر ٹوٹ کر انتہائی وحشیانہ طور پر انھیں قتل کرنے لگی ۔ گبن لکھتا ہے کہ اس روز رومی سپاہ کے ہاتھوں کم از کم دو لاکھ مصری مارے گئے ۔

اس واقعے سے مصر میں کلیسا کی تمام املاک حاکم اسکندریہ کے قبضے میں چلی گئیں ۔ قیصر روم نے فساد کی جڑ کاٹنے کے لیے بطریق کو حاکم مصر کا درجہ دے کر خراج کی وصولی اور فوجی تیاریوں کا کام بھی اسی کے سپرد کر دیا تاکہ اس کے پاس فوجی طاقت ہونے کی وجہ سے آئندہ اس کے خلاف کوئی شورش برپا نہ ہو سکے ۔

اس کے بعد رومی حکام نے مصریوں کو سخت ایذائیں پہنچانی شروع کر دیں جس کے باعث مصریوں کے دلوں میں رومیوں کی طرف سے نفرت و حقارت کے جذبات بھڑکنے لگے ۔ انھوں نے ان کی زبان ، رسم و رواج ، لباس غرض ہر چیز کو چھوڑ دیا ۔ ملکی فرقے سے تعلق رکھنے والا ہر شخص ، خواہ وہ ان کا ہم وطن ہی کیوں نہ ہوتا ، ان کی نظروں میں دشمن اور سخت نفرت کے قابل تھا ۔ اگر کوئی مصری رومیوں کا کوئی عہدہ قبول کر لیتا تھا تو وہ اپنے ہم وطنوں میں سخت حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا ۔ یہ جرم اتنا شدید ہوتا تھا کہ معافی کی کوئی صورت نہ تھی ۔ رومی شہنشاہ کی ظاہری اطاعت

وہ محض اس لیے کرتے تھے کہ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھے ، اگر اُن کے پاس ذرا بھی طاقت ہوتی تو وہ غلامی کا یہ جؤا گردن سے اُتار پھینکتے -

اگر مصری تھوڑی سی کوشش ، ہمت اور جرأت سے کام لیتے اور درست راستہ اختیار کرتے تو وہ مذہبی اور سیاسی آزادی حاصل کر سکتے تھے - مصر کے چھ سو گرجاؤں کے پادری ، لوگوں کے جذبات بھڑکا کر، اُنھیں دیوانہ وار ہزاروں کی تعداد میں رومیوں کے مقابل میدان جنگ میں لا سکتے تھے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے- مذہب سے بے انتہا شغف رکھنے والے یہ مصری ہر قسم کے ظلم و ستم برداشت کر سکتے تھے ، نت نئی سزائیں قبول کر سکتے تھے لیکن مسلح دشمن کا مقابلہ کرنا ان کے لیے موت قبول کرنے کے مترادف تھا - ان کے نزدیک ظلم و ستم کے اس لامتناہی سلسلے سے نجات کی واحد صورت یہ تھی کہ مصر پر کسی بیرونی طاقت کا قبضہ ہو جائے - چنانچہ جب ۶۱۵ء میں مصر پر ایرانی شہنشاہ خسرو کا تسلط ہؤا تو اُس نے مصری یعقوبیوں کو رومیوں کے ظلم و ستم سے نجات دلائی - لیکن یہ صورت حالات زیادہ عرصے تک قائم نہ رہی اور ۶۲۷ء میں ہرقل کا دوبارہ مصر پر قبضہ ہونے سے ظلم و ستم کا سلسلہ پہلے سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ جاری ہو گیا - مصریوں کا محبوب بطریق بنیامین صحرا کی طرف بھاگ گیا لیکن اللہ نے چاہا کہ مصری زیادہ دیر تک دردناک عذاب میں مبتلا نہ رہیں ، چنانچہ دس سال نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک اور اجنبی طاقت مصریوں کو ظالم رومیوں کے پنجے سے چھڑانے کے لیے روانہ ہوئی اور وہ تھی عربی طاقت -

یہ ہے مجمل سا خاکہ چھٹی اور ساتویں صدی میں مصریوں کی مذہبی حالت کا - یہ دور مصر کے عیسائیوں کے لیے تاریک

ترین دور تھا ۔ اس زمانے میں انھوں نے مسیحی قیصروں کے ہاتھوں وہ تکالیف برداشت کیں جو بت پرست قیصروں کے زمانے میں بھی برداشت نہ کی تھیں ۔ اسی جور و ستم کے باعث مصریوں کو رومیوں سے بے انتہا نفرت ہو گئی تھی اور وہ بڑی بے تابی سے ان کے دور حکومت کے خاتمے کا انتظار کر رہے تھے ۔ اسی لیے جب مسلمانوں نے مصر پر حملہ کیا تو مصریوں نے ان کا مقابلہ کرنے کے بجائے اپنے محبوب اور ہردلعزیز پیشوا بنیامین کی ھدایات کے مطابق ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں مصر پر قبضہ کرنے میں ہرممکن سہولت بہم پہنچائی ۔

ب : سیاسی حالت

مصر کی مذھبی حالت کا تذکرہ کرنے کے بعد اب ہم سیاسی نقطۂ نظر سے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔

رومی ۳۰ قبل مسیح میں مصر پر قابض ہوئے تھے ۔ ان کے عہد میں اگر کسی شعبے کی طرف توجہ کی گئی تو وہ زراعت کا شعبہ تھا ۔ ساری رومی سلطنت کی غذائی ضروریات مصر ھی سے پوری کی جاتی تھیں ۔ دوسرے شعبوں کی طرف سے کامل بے توجہی کے نتیجے میں جلد ھی علم اور تہذیب و تمدن کے وہ پرانے آثار مٹ گئے جن کے لیے مصر دنیا بھر میں مشہور تھا ۔

ابتدا میں رومی بت پرست تھے ۔ رومی حکومت کے عہد ھی میں دین مسیحی نے مصر میں راہ پائی اور جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ھیں مصری عیسائیوں کو بت پرست رومی بادشاھوں کے ہاتھوں سخت مظالم برداشت کرنے پڑے ۔ عظیم رومی سلطنت کا خاتمہ ۳۹۵ء میں شہنشاہ ' طیوروسیس ' کی وفات پر ہوا اور

اس کے بعد یہ سلطنت اس کے بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی* -

اس وقت سے اس سلطنت میں مذہبی فتنے پھوٹنے شروع ہوئے - بلحاظ ان فتنوں کے سب سے خوفناک صدی ہجرت سے قبل کی تھی - اسی صدی میں ملکی اور یعقوبی عیسائیوں کے درمیان وہ ہولناک تصادم شروع ہؤا جس نے بالآخر رومی سلطنت کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں -

ان فتنوں کی سب سے بڑی وجہ معاشی بدحالی تھی - قیصر نیرون نے برسراقتدار آ کر مصر کے خراج میں اضافہ کر دیا - مصر کے باشندے یہ بارگراں برداشت نہ کر سکتے تھے - انہیں یہ اضافہ سخت ناگوار گزرا - ملک میں جابجا فسادات کے شعلے بھڑکنے لگے - آتشزدگی کی وارداتیں کثرت سے ہونے لگیں - ڈاکہ زنی عام ہو گئی اور ملک کا امن و امان تباہ و برباد ہو گیا -

ابتدا میں مصری ان تمام حقوق و مراعات سے محروم تھے جو سلطنت روما میں رہنے والے دوسرے لوگوں کو حاصل تھیں - قیصر آگسٹس نے حکومت کا نظم و نسق چلانے کے لیے اہل اسکندریہ کو مجلس نمائندگان قائم کرنے سے روک دیا تھا -

* شہنشاہ قسطنطین نے ۳۳۰ء میں اپنا دارالسلطنت روم کے بجائے بیزنطینہ مقرر کیا تھا ، اس وقت سے اس شہر کا نام قسطنطین اکبر کے نام کی مناسبت سے قسطنطنیہ پڑ گیا - قسطنطین کی وفات کے بعد سلطنت اس کے تین بیٹوں کے درمیان تقسیم ہو گئی لیکن پھر متحد ہو گئی - ۳۹۵ء میں اس کی آخری تقسیم عمل میں آئی ، یعنی مغربی رومی سلطنت، جس کا دارالسلطنت رومۃالکبریٰ تھا اور مشرقی رومی سلطنت جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ ہی رہا -

مصریوں پر تمام اعلیٰ ملکی عہدوں کے دروازے بھی قطعاً بند تھے۔ البتہ سیپٹم سیفر (۱۹۲ء تا ۲۱۱ء) کے زمانے میں اسکندریہ میں مجلس نمائندگان قائم کرنے کی اجازت مل گئی ۔ اس مجلس میں ملک کے ہر حصے کے نمائندے شامل ہوتے تھے جو ملکی اور انتظامی معاملات پر غور کر کے ان کے متعلق فیصلے صادر کرتے تھے ۔ شہنشاہ سیپٹم سیفر نے بعض اور شہروں میں بھی بلدیاتی مجالس (میونسپل کمیٹیاں) قائم کیں ۔ صرف یہی نہیں بلکہ مصریوں کو رومۃالکبریٰ کی مجلس نمائندگان میں بھی نیابت دی گئی ۔ اس طرح اصولاً مصری بھی وہ اعلیٰ مناصب پانے کے حقدار ہوگئے جو اس سے قبل ان کے لیے کلیۃً ممنوع تھے ۔ ان تمام باتوں کے باوجود مصریوں کو نہ تو مرکزی مجلس نمائندگان میں کوئی اہم حیثیت حاصل تھی اور نہ انہیں اعلیٰ عہدوں ھی پر سرفراز کیا جاتا تھا اس لیے کہ ان کی حیثیت محض غلاموں کی سی تھی ۔ مجلس نمائندگان میں ان کے آقا ان کی باتوں پر کیونکر دھیان دے سکتے تھے اور اپنے ہم وطنوں سے اعلیٰ عہدے چھین کر غلام مصریوں کے حوالے کس طرح کر سکتے تھے ؟ نتیجہ یہ ھؤا کہ مصریوں میں احساس کمتری پیدا ھو گیا اور رومیوں سے ان کی رنجش میں مطلق کمی نہ آئی ۔

اس رنجش میں اضافہ اس وقت ھؤا جب رومیوں کو بعض وہ ٹیکس معاف کر دیے گئے جو مصری بھی ادا کرتے تھے لیکن مصریوں پر ٹیکس کا بار اور زیادہ کر دیا گیا ۔

رومیوں کے عہد میں مصریوں پر ٹیکس کا اضافہ انتہا کو پہنچ گیا تھا ، کوئی چیز ایسی نہ تھی جس پر ٹیکس نہ لیا جاتا ھو ۔ ان ٹیکسوں نے باشندوں کی کمریں دھری کر دی تھیں ۔ ملن لکھتا ھے کہ ٹیکس سے کوئی شخص اور کوئی چیز مستثنیٰ

نہ تھی ۔ ہرقسم کی مصنوعات، چوپایوں ، زمینوں اور اثاث البیت
پر ٹیکس عائد تھا ۔ یہ ٹیکس سامان کی بعض اقسام ہی تک
محدود نہ تھا بلکہ ہر رہگیر پر ، خواہ وہ مرد ہو یا عورت ،
تاجر ہو یا عام مسافر ، واجب تھا ۔ رہگیر کے پاس جو چیزیں
ہوتی تھیں ان پر بھی ٹیکس لگتا تھا ۔ کشتیاں بنانے والے اور
لشکر کے سپاہیوں کی بیویاں تک ٹیکس سے مستثنٰی نہ تھیں ،
حتیٰ کہ صحرا سے گزرنے والے جنازوں پر بھی ٹیکس لیا جاتا تھا ۔
یہ ٹیکس ادا کرنے کی خاطر باشندوں کو کئی کئی وقت کے
فاقے کرنے پڑتے تھے ۔ معاملہ صرف ٹیکس ادا کرنے ہی تک
محدود نہ تھا بلکہ اس کے علاوہ اور بھی بے شمار تکالیف تھیں جن
کا مصریوں کو سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ ان پر واجب تھا کہ جب
ملکی فرقے کے لوگ اور فوجی کسی گاؤں میں جائیں تو ان کی ہر
طرح کی خاطرداری کی جائے ، ان کی تمام ضرورتیں پوری کی جائیں
اور سفر کی سہولتوں کا انتظام کیا جائے تاکہ وہ بآسانی سفر پورا
کرسکیں ۔ بیزنطینی حکومت کے آخری دنوں میں تو مصریوں کے
لیے یہ بھی لازم تھا کہ وہ اپنے علاقے سے گزرنے والی فوجوں کے
لیے رسد کا بھی انتظام کریں ۔ ان لامتناہی ٹیکسوں نے غریب عوام
کا کچومر نکال دیا تھا اور وہ جان تک سے بیزار ہوگئے تھے *۔

مصر کے مسیحی کلیسا میں عقائد کا جو اختلاف رونما ہو چکا
تھا مذہبی اہمیت سے قطع نظر اس کی زبردست سیاسی اہمیت
بھی تھی ۔ یہ مذہبی اختلافات ان کثیر اختلافات کا پیش خیمہ
تھے جو بالآخر روسی کلیسا کی قسطنطینی کلیسا سے علحدگی
کا باعث بنے ۔ اس اختلاف کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی اور
نظم و نسق کے امور ایک ہی شخص 'اپولیناریس' کے سپرد کردیے

* سلن صفحہ ۱۱۵-۱۲۵ (بہ اختصار)

گئے (اس کا ذکر پہلے آ چکا ہے)۔ یہی مذہبی اختلافات تھے جنھوں نے پہلے ایرانیوں اور بعد ازآں مسلمانوں کے لیے راستہ صاف کیا اور رومیوں کو ہمیشہ کے لیے مصر سے خارج ہونا پڑا* ۔

ج : ایرانیوں کے عہد میں مصر کی حالت

چھٹی صدی عیسوی رومیوں کے لیے مصیبت کا پیغام لائی ۔ اس پوری مدت میں ایرانی اپنے جرار لشکروں کے ساتھ رومی سرحدوں پر پے در پے حملے کرتے رہے ۔ ایرانیوں کو رومی مقبوضات پر حملے کرنے کی زیادہ جرأت ہرقل (۶۱۰ء تا ۶۴۱ء) کی غفلت اور عیش کوشی کو دیکھ کر ہوئی ۔ سب سے پہلے ایرانیوں نے شام اور فلسطین کی طرف توجہ کی ۔ وہاں کے باشندے لاکھوں کی تعداد میں بھاگ بھاگ کر مصر پہنچنے لگے ۔ لیکن جب دشمن شام اور فلسطین کی فتوحات سے فارغ ہو کر مصر کی طرف بڑھا تو ان تارکین وطن نے اسکندریہ کا رخ کیا اور شہر کی گلیاں ان غریب‌الوطن لوگوں سے بھر گئیں ۔ ان لوگوں کے لیے خوراک حاصل کرنا آسان نہ تھا ۔ جہاں تک اہل شہر ان کی امداد کر سکتے تھے انھوں نے کوتاہی نہ کی لیکن بعد میں انھیں بھی اس قدر کثیر تعداد کے لیے خوراک مہیا کرنا غیرممکن ہو گیا ۔ قحط کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا ۔ محصول میں بے حد کمی ہو گئی ۔ یہ صورت حال دیکھ کر رومی جرنیل ' نیکتیاس ' کے لیے اس

* ان تمام مصائب اور آلام کا دائرہ مصریوں ہی تک محدود نہ تھا بلکہ اس نے سلطنت کے تمام حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا ۔ ظلم و ستم کا یہ سلسلہ بھی منجملہ ان اسباب کے تھا جن کے باعث عربوں کی فتوحات کے لیے راستہ صاف ہؤا ۔

کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ مصر کو ایرانیوں کے حوالے کر کے خود وہاں سے رخصت ہو جائے چنانچہ ۶۱۵ء میں مصر ایرانیوں کی عمل داری میں شامل ہو گیا ۔ (ملن)

ملن لکھتا ہے کہ مصریوں نے حکومت میں اس نئی تبدیلی کا پرتپاک خیر مقدم کیا ۔ وہ ایک عرصے سے رومیوں کے ظلم و ستم کی چکی میں بری طرح پس رہے تھے۔ نت نئے ٹیکسوں اور آئے دن کے محصولوں نے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا ۔ انھیں امید تھی کہ ایرانیوں کے عہد میں اطمینان کا سانس لینا نصیب ہوگا ۔

ایرانیوں نے ان کے مذہبی احساسات اور جذبات کا پاس کیا۔ رومیوں کی طرح ان احساسات میں دست اندازی نہ کی بلکہ انھیں آزاد چھوڑ دیا کہ جو چاہیں عقیدہ رکھیں ، عقیدے کی بنا پر ان سے کسی قسم کی باز پرس نہ ہوگی ۔ مصریوں کی مزید دلداری کی خاطر ایرانیوں نے ان کے ہر دل عزیز پیشوا بنیامین کو بلا کر بطریق مصر کا عہدہ اس کے حوالے کر دیا ۔ ایرانیوں کے اس اقدام نے ملک بھر میں مسرت و شادمانی کی لہر دوڑا دی اور مصریوں نے بہ طیب خاطر ایرانیوں کی اطاعت قبول کر لی ۔ ایرانیوں کا پورا دور خوش‌حالی اور امن و امان کا دور تھا ۔ ملک کے کسی بھی حصے میں کوئی گڑبڑ اور بدامنی پیدا نہ ہوئی ۔

لیکن ایرانیوں کی حکومت دس سال سے زیادہ نہ رہی کیونکہ اسلام نے آ کر ایرانی سلطنت کو اس کے بہترین لشکروں سے محروم کر دیا تھا ۔ رومیوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنے مشرقی مقبوضات ایرانیوں سے بزور واپس لے لیے ۔ ہرقل شام سے گزرتا ہوا مصر پہنچا اور ایرانیوں کو وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا ۔ رومیوں کے دوبارہ آ جانے سے مصریوں کی تمام امیدیں جو

انھوں نے اپنے خوش آئند مستقبل سے وابستہ کر رکھی تھیں خاک میں مل گئیں ۔ انھیں نظر آنے لگا کہ مصائب و آلام کا دور پوری شدت سے پھر شروع ہونے والا ہے ۔ بطریق بنیامین نے تمام پادریوں اور راھبوں کی ایک مجلس منعقد کی اور انھیں صبر و استقلال سے کام لینے اور موقع ملنے پر پہاڑوں کی طرف راہ فرار اختیار کرنے کا مشورہ دے کر خود بھی راتوں رات وادئ نطرون کی طرف بھاگ گیا ۔ (بٹلر ، ملن)

رومیوں کے دوبارہ مصر پر قابض ھوجانے سے مذھبی اختلافات پھر ابھر آئے ۔ ھرقل نے ان اختلافات کو انتقام کی وہ آگ بھڑکانے کے لیے استعمال کیا جو اس کے دل میں مصریوں کی طرف سے ایرانیوں کی حکومت صدق دل سے قبول کرلینے کے باعث سلگ رھی تھی*۔

* ڈاکٹر بٹلر دوسرے مستشرقین، شارپ اور ملن، کے بیان کردہ ان واقعات کو قبول نہیں کرتے کہ مصریوں نے صدق دل سے ایرانیوں کے آگے سرتسلیم خم کر دیا تھا ۔ وہ لکھتے ھیں کہ مصریوں نے ایرانیوں کی حکومت کا خیرمقدم ھرگز نہیں کیا تھا ، اس کے برعکس انھیں اس عھد میں سخت تکالیف اور مظالم برداشت کرنے پڑے ۔ ایرانیوں نے ھزاروں رومی باشندوں کو فتوحات کے دوران میں قتل کیا ۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں وہ کہتے ھیں کہ مصریوں کے ایک سربرآوردہ شخص ' انباشنودہ ' نے پہلے سے اپنے ھم وطنوں کو خبر دے دی تھی کہ وہ ایرانیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننے کے لیے تیار رھیں اور اس کی یہ پیشگوئی پوری ھوئی ۔ راھب ' بیزنطیوس ' ایرانیوں کے ظلم و ستم کی خبریں سن کر بھاگ گیا اور اس ظلم و تشدد کے خلاف جو ایرانی اس کی قوم پر ڈھا رہے تھے

باقی صفحہ ۹۸ پر

اس نے مصریوں کو حکم دیا کہ وہ خلقدونی مذہب قبول کرلیں ۔ جو شخص انکار کرتا تھا اسے سخت ایذائیں دی جاتی تھیں اور کوڑوں سے پٹوایا جاتا تھا یہاں تک کہ اس بد نصیب کا خاتمہ ہو جاتا تھا ۔

بنیامین کے بھائی ' مینا ' کے ساتھ بھی یہی ہؤا ۔ جب وہ رومیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تو انھوں نے اُسے مجبور کیا کہ وہ خلقدونی فیصلہ مان کر ملکی مذہب اختیار کر لے لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا ۔ اس پر شعلوں سے اُس کا چہرہ جلا دیا گیا یہاں تک کہ اُس کی پیشانی سے زمین پر چربی ٹپکنے لگی ۔ لیکن اس شدید سزا کے باوجود وہ اپنے قول پر قائم رہا اور خلقدونی مذہب اختیار کرنے سے انکار کر دیا ۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے اس کے دانت اکھاڑے گئے اور اُسے ریت کے تھیلے میں ڈال کر ساحل پر لے گئے ۔ وہاں تین بار اس سے کہا گیا کہ اگر وہ خلقدونی مذہب قبول کر لے تو اُس کی جان بخشی کر دی جائے گی لیکن اُس نے دوبارہ وہ پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا ۔ آخرکار اسے سمندر میں غرق کر دیا گیا ۔

اس ظلم و ستم کے باعث ، جو لگاتار دس سال تک جاری رہا، فریقین کے درمیان صلح اور تصفیے کی ہر اُمید محال ہو گئی ۔

بقیہ حاشیہ ۹۷

شدید صدائے احتجاج بلند کی ۔ لیکن ہم بٹلر کے اس بیان کو صحیح تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں اس لیے کہ تاریخ شاھد ھے ، ایرانیوں نے مصریوں کے مذہب سے قطعاً تعرض نہ کیا ۔ اس کے برعکس ان کے مذہبی پیشوا بنیامین کو بطریق کی کرسی پر بٹھا دیا اور عقائد کی بنیاد پر ظلم و ستم کا سلسلہ یکسر موقوف کر دیا ۔

مصریوں کو معلوم تھا کہ عرب سے ایک طاقت اٹھی ہے جو آندھی کی طرح شام اور مصر کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہے۔ انھوں نے اسی طاقت کو اپنی امیدوں کا سہارا بنایا۔ انھیں یقین تھا کہ مصر کی جانب مسلمانوں کی پیش قدمی در اصل ایک عذاب ہے جو اللہ ان کے ظالم حاکموں پر ان کے مظالم اور بد اعمالیوں کی پاداش میں نازل کرنا چاہتا ہے۔ رومیوں نے اب بھی عبرت حاصل نہ کی اور ظلم و ستم کا سلسلہ برابر جاری رکھا۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ جب اسلامی فوجیں مصر کی حدود میں داخل ہو گئیں تو قبطی رؤساء نے جابجا مسلمانوں کا ساتھ دیا اور انھیں ہر ممکن مدد بہم پہنچائی ورنہ عمرو بن العاص چار ہزار کی قلیل ترین سپاہ کے ساتھ سارے مصر پر قابض ہونے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں سیاسی شخصیتوں کا فقدان تھا۔ اپنی ذات پر سے ان کا اعتماد اٹھ چکا تھا۔ ان کی نظریں ہمیشہ بیرونی طاقتوں اور اجنبی حکومتوں پر لگی رہتی تھیں کہ وہ آئیں اور ظالم رومیوں کو ان کے ملک سے نکال کر خود ان کی جگہ قابض ہو جائیں تا کہ انھیں ظلم و ستم سے نجات مل سکے۔

غرض رومیوں کی سنگ دلی، شقاوت، مصریوں کے ساتھ ان کا وحشیانہ سلوک اور مصر کی کمزوری و پست ہمتی وہ اہم اسباب تھے جن کی بنا پر عمرو بن العاص نے نہایت آسانی سے پورے مصر پر قبضہ کر لیا۔

دوسرا باب

فتح مصر

۱ : آغاز سفر

(۱) مصر فتح کرنے کا خیال : ۱۸ھ* مطابق ۶۳۹ء میں جب حضرت عمر بن الخطاب جابیه تشریف لائے تو عمرو بن العاص آپ سے ملنے آئے ۔ ایک دن علیحدگی میں انھوں نے آپ کے سامنے مصر کی تسخیر کا ذکر چھیڑا اور کہا که اگر مصر فتح ہوگیا تو مسلمانوں کی قوت و طاقت میں بے پناہ اضافه هوجائے گا ۔ مصر کی سرزمین خزانے اگلنے والی هے اور وهاں کے باشندے مرفه‌الحال هونے اور چین سے زندگی بسر کرنے کے باعث اس قدر آرام طلب هو چکے هیں که وه همارے مقابلے کی تاب نهیں لا سکتے ۔ حضرت عمر نے یه خیال کر کے که اس قدر دور دراز کا سفر کرنے کی وجه سے مسلمانوں کو ناقابل برداشت تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی ، عمرو بن العاص کی اس تجویز کو ناپسند کیا

* ابن اثیر (جلد۲، صفحه۲۷۷) اور ابن خلدون (جلد۲، صفحه ۱۱۳) لکھتے هیں که مصر کی جانب عمرو بن العاص کی روانگی بیت‌المقدس کی فتح کے بعد ۲۰ھ یا ۲۲ھ یا ۲۵ھ میں عمل پزیر هوئی لیکن یه صحیح نهیں ۔ (مولف)

لیکن عمرو بن العاص بھی اپنی دھن کے پکے تھے آنھوں نے اصرار کر کے حضرت عمر کی رضامندی اور اجازت حاصل کر ھی لی ۔ حضرت عمر نے قبیلہ عک * کے چار ہزار آدمی ان کے ساتھ کر دیے اور فرمایا :

" اللہ پر توکل کر کے کوچ کر دو ۔ میں تمھاری اس مہم کے بارے میں استخارہ کروں گا اور اس کے نتائج سے تمھیں جلد ھی اطلاع دوں گا ۔ اگر میرے خط میں تمھیں لوٹنے کا حکم دیا جائے اور وہ خط تمھیں مصر کی سرزمین میں داخل ھونے سے قبل مل جائے تو تم لوٹ آنا لیکن اگر مصر کی حدود میں داخل ھونے کے بعد ملے تو اللہ سے مدد اور نصرت چاھتے ھوئے آگے بڑھتے چلے جانا ۔"

چنانچہ عمرو بن العاص فوج لے کر رات کے اندھیرے میں چپکے سے روانہ ھو گئے ۔ ان کے اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ اور کسی کو اس مہم کا علم نہ تھا ۔ ادھر جب حضرت عمر نے اس امر پر مزید غور کیا تو آنھیں یہ پیش‌قدمی مناسب معلوم نہ ھوئی جس پر آپ نے عمرو بن العاص کو واپس ھونے کا حکم دیا ۔ جب قاصد آپ کا خط لے کر عمرو بن العاص کے پاس پہنچا ، تو آپ مقام رفح پر تھے ۔

ھمیں یہ امر بعید از امکان معلوم ھوتا ھے کہ جس روز عمرو بن العاص کو حضرت عمر سے مہم مصر پر جانے کی اجازت ملی اسی روز آپ نے کوچ کر دیا کیونکہ عمرو بن العاص کی روانگیٔ مصر قیساریہ کی فتح اور قسطنطین کی شکست سے پہلے نہیں ھوئی اور یہ واقع بیت‌المقدس کی فتح کے تقریباً ایک سال بعد

* یمن کا ایک شہر اور قبیلہ ۔

رونما ہؤا ۔

ابن عبدالحکم اور مقریزی نے لکھا ہے کہ " عمرو بن العاص حضرت عمر کی اجازت کے بغیر راتوں رات فلسطین سے مصر روانہ ہو گئے تھے ۔ صبح اٹھ کر جب دوسرے سرداروں نے آپ کو نہ پایا تو انھیں بڑا تعجب ہؤا ۔ تحقیق و تلاش سے پتا چلا کہ آپ مصر روانہ ہو چکے ہیں ۔ سرداروں نے حضرت عمر سے شکایت کی کہ عمرو بن العاص انھیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں ۔ ایک دن جب حضرت عثمان حضرت عمر کے پاس گئے تو حضرت عمر نے کہا ، میں نے عمرو بن العاص کو لکھا ہے کہ وہ مصر سے فارغ ہو کر شام چلے جائیں ۔ حضرت عثمان نے عرض کی "یا امیرالمومنین! عمرو بن العاص امارت کے خواهشمند اور پیش قدمی اور جرأت و بہادری میں نہایت بے باک ہیں ۔ لیکن مجھے ڈر ہے ، چونکہ ان کے پاس زیادہ فوج نہیں اس لیے وہ کہیں مسلمانوں کو ہلاکت میں نہ ڈال دیں ۔ حضرت عمر مسلمانوں کی سلامتی کو بے حد عزیز رکھتے تھے ، حضرت عثمان کی یہ باتیں سن کر آپ کو بھی فکر پیدا ہوئی اور آپ نے عمرو بن العاص کو لکھا کہ اگر مصر میں داخل ہونے سے پہلے انھیں یہ خط مل جائے تو واپس آجائیں لیکن اگر مصر کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد ملے تو اللہ پر توکل کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جائیں ۔

جہاں تک مندرجہ بالا روایت کے اس حصے کا تعلق ہے جس میں حضرت عمر کی اجازت کے بغیر عمرو بن العاص کے مصر جانے کا ذکر ہے وہ بالکل غلط ہے ۔ عمرو بن العاص یقیناً حضرت عمر کی اجازت لے کر مصر گئے تھے ۔ البتہ جب بعد میں حضرت عثمان نے انھیں اس مہم کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور بتایا کہ اس مہم میں مسلمانوں کی جانوں کو کس قدر خطرات

لاحق ہیں تو حضرت عمر کو خیال ہؤا کہ واقعی آنھوں نے
عمرو بن العاص کو روانگیٔ مصر کی اجازت دے کر غلطی کی ہے ۔

عمرو بن العاص اتنے ناتجربہ کار نہ تھے کہ آنھیں ان
نتائج و عواقب کا علم نہ ہوتا جو امیرالمومنین کی مرضی کے
خلاف کام کرنے کی صورت میں پیدا ہوتے ۔ یہ کیونکر ممکن تھا
کہ وہ مسلمانوں کے ایک لشکر کو اتنے دور دراز اور کٹھن سفر
پر بغیر خلیفہ کی اجازت کے لے جاتے ۔ پھر جب فوج کو معلوم
تھا کہ ان کا امیر خلیفہ سے اجازت لیے بغیر آسے اس قدر دشوار
اور کٹھن کام کے لیے لے جا رہا ہے تو آس کے لیے کیا امر مانع
تھا کہ وہ اس کے احکام ماننے سے انکار کر دیتی ۔ اگر
عمرو بن العاص ایسا کرتے تو وہ حضرت عمر کے عتاب سے
کسی طرح بچ نہ سکتے تھے ۔ اس صورت میں حضرت عمر بھی
انھیں قرار واقعی سزا دیے بغیر نہ چھوڑتے ۔ لیکن ہمیں کسی
تاریخ میں کوئی اشارہ ایسا نہیں ملتا کہ حضرت عمر نے
عمرو بن العاص کو ان کی ' خودسری ' کی وجہ سے کوئی
سزا دی ہو یا ان پر غصے کا اظہار کیا ہو ۔ اس مختصر اظہار
رائے کے بعد اب ہم دوبارہ فتح مصر کی کیفیت بیان کرنی شروع
کرتے ہیں ۔ جب حضرت عمر کا خط عمرو بن العاص کو مقام
' رفح ' میں ملا تو انھیں اندیشہ ہؤا کہ اگر آنھوں نے قاصد
کے ہاتھ سے خط لیا اور اس میں واپس چلے آنے کا حکم ہؤا توان
کے تمام منصوبوں پر پانی پھر جائے گا ۔ اس خدشے کے پیش نظر
آنھوں نے قاصد سے خط نہ لیا اور اسے ٹال دیا ۔ جب رفح اور
العریش کے درمیان واقع ایک بستی کے قریب پہنچے تو پوچھا کہ
یہ کون سی بستی ہے ۔ لوگوں نے جواب دیا " یہ مصر کی ایک
بستی ہے ۔" اس پر آپ نے قاصد کو بلایا اور اس سے خط لے کر

پڑھا ۔ اس کے بعد آپ نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور ان سے کہا
" تم جانتے ہو کہ جس زمین میں ہم مقیم ہیں وہ مصر کی
سرزمین ہے ؟" لوگوں نے جواب دیا " بیشک ۔" آپ نے کہا
" مجھے امیرالمومنین نے حکم دیا تھا کہ اگر مصر کی سرزمین میں
داخل ہونے سے پہلے ان کا خط واپس ہونے کے متعلق مجھے مل
جائے تو میں واپس چلا آؤں ، لیکن اگر مصر کی سرزمین میں داخل
ہونے کے بعد ملے تو آگے بڑھوں ۔ امیرالمومنین کا یہ مکتوب مجھے ملا
ہے جس میں واپس آ جانے کا حکم دیا گیا ہے لیکن ہم چونکہ
مصر کی سرزمین میں داخل ہو چکے ہیں اس لیے اللہ کی برکت
اور اس کی مدد چاہتے ہوئے آگے بڑھیں گے ۔"

اس موقع پر ہر قاری کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ
عمرو بن العاص نے چار ہزار کی نہایت مختصر فوج کے ساتھ جرار
روسی لشکروں کے مقابلے کے لیے مصر جانے کی جرأت کیونکر
کی ؟ اس کا آسان جواب یہ ہے کہ عمرو بن العاص امارت کے
خواہش مند تھے ۔ قدرت نے آپ میں بے نظیر صلاحیتیں ودیعت
کی تھیں ۔ آپ کے پیش نظر ہمیشہ بلند مہمات ہی رہتی تھیں ،
خواہ ان کے راستے میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ حائل ہوں ۔
ہمارے اس دعوے کا ثبوت حضرت عثمان کے وہ الفاظ ہیں جو آپ
نے حضرت عمر سے عمرو بن العاص کی شکایت کرتے ہوئے
کہے تھے :

" عمرو بن العاص امارت کے خواہش مند اور پیش قدمی
اور جرأت و بہادری میں نہایت بے باک ہیں ۔"

آپ میں امارت کی خواہش کا اندازہ اس واقعے سے کیا جا سکتا
کہ جب حضرت ابوبکر صدیق نے ابوعبیدہ کو شام کی طرف

بھیجے جانے والے لشکروں کا سالار بنایا تو عمرو بن العاص نے حضرت عمر سے درخواست کی کہ وہ حضرت ابوبکر صدیق سے کہ کر ابوعبیدہ کی بجائے انھیں سپہ سالار مقرر کرا دیں - یہ واقعہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں انھیں ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق ، حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ پر امیر مقرر فرمایا تھا -

' اشہر مشاہیر الاسلام ' کے مؤلف رفیق بک العظم لکھتے ہیں:

" عمرو بن العاص کے سوانح کی چھان بین اور ان کے کارناموں کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ وہ پورے عالم اسلام میں منفرد حیثیت کے مالک تھے - ماؤں نے ایسے بچے بہت کم جنے ہیں جن میں عمرو بن العاص کی سی صلاحیتیں اور خاصیتیں پائی جاتی ہوں - یہ درست ہے کہ امارت حاصل کرنے کی خواہش باربار ان کے دل میں چٹکیاں لیتی رہتی تھی لیکن ان سے کبھی کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہوا جسے چھچھور پن کہا جاسکے - ان کی نظریں ہمیشہ بلند ، عظیم الشان اور خطرناک کاموں کی طرف ہی اٹھتی رہیں جنھیں انجام دینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی - دنیا کے پردے پر کون سا ایسا جرنیل ہے جس نے چار ہزار سے بھی کم فوج کے ہمراہ فراعنہ کی اس سرزمین کو فتح کرنے کی کوشش کی ہو جہاں اس کی راہ میں حائل ہونے کے لیے ایک کروڑ باشندے اور مقابلہ کرنے کے لیے کئی لاکھ رومی موجود تھے - "

عمرو بن العاص کو مصر فتح کرنے کا شوق اس لیے بھی پیدا ہوا کہ آپ زمانۂ جاہلیت میں یہاں آ کر یہاں کی خوش حالی، ثروت اور زرخیزی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے - آپ کو یقین تھا کہ رومی حکومت کے آخری دن آ چکے ہیں ، فوجوں میں کمزوری اور مایوسی سرایت کر چکی ہے اور مصر کے قبطی

روسی حکومت کے ظلم و جور سے تنگ آ کر اجنبی حکومت سے بیزار ہو چکے ہیں - ان تمام اسباب نے مل کر عمرو بن العاص کے دل میں مصر کو فتح کرنے کا ولولہ پیدا کر دیا - چونکہ آپ شجاعت میں یکتا اور شہامت میں فرد تھے ، طریق ہائے جنگ سے آپ کو پوری واقفیت تھی اس لیے آپ جانتے تھے کہ اللہ کی مدد اس عظیم الشان کام میں آپ کے ساتھ ہوگی اور آپ مصر کی تاریخی سرزمین کو فتح کرنے کا اعزاز حاصل کر سکیں گے -

شیخ عبدالوہاب نجار لکھتے ہیں : عمرو بن العاص دیکھ چکے تھے کہ جس وقت حضرت ابوبکر صدیق نے رومیوں سے لڑنے کے لیے شام میں فوجیں روانہ فرمائیں تو ان کی تعداد بہت تھوڑی تھی لیکن جب انھیں رومیوں کے عظیم الشان لشکروں سے مقابلہ کرنا پڑا تو حضرت عمر نے ان کی مدد کے لیے پے در پے فوجیں روانہ کرنی شروع کیں اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک مسلمانوں کو مکمل کامیابی حاصل نہ ہوگئی - چنانچہ انھوں نے ضروری نہ سمجھا کہ شروع ہی میں ایک کثیر فوج کا مطالبہ کر کے حضرت عمر کو مشکل میں ڈال دیں اور اس طرح انھیں پس و پیش کرنے اور ان کے مطالبے کو نامنظور کرنے کا موقع دیں کیونکہ انھیں یقین تھا کہ جب مصر میں رومی فوجیں ان کے بالمقابل آئیں گی اور انھیں مزید فوجوں کی ضرورت پڑے گی تو حضرت عمر لا محالہ ہزار دقتیں اور تکلیفیں اٹھا کر بھی انھیں امداد روانہ کریں گے اور اس وقت حضرت عمر کے لیے یہ ناممکن ہوگا کہ وہ انھیں منجدھار میں چھوڑ دیں -

(۲) فتوحات کی ابتدا : العریش : عمرو بن العاص اپنی فوج کے ہمراہ صحرائے سینا کو قطع کرتے سرزمین مصر میں داخل

ہوئے اور سب سے پہلے ' العریش * ' پہنچ کر اسے فتح کیا ۔ وہ روز عیدالضحیٰ کا تھا ۔ (۱۰ ذی الحجہ ۱۸ھ مطابق ۱۲ دسمبر ۶۳۹ء) یہیں آپ نے اپنے رفیقوں کے ساتھ ایک ایک مینڈھے کی قربانی کی ۔

العریش پر آپ بآسانی اس لیے قابض ہوگئے کہ اول تو قلعے اور فصیلیں لمبے عرصے کی عدم نگہداشت کے باعث شکستہ ہوچکی تھیں دوسرے وہاں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی فوج بھی نہ تھی ۔ مقابلہ کرنے والی فوجیں دوسرے مقامات مثلاً فرما ، بلبیس ، ام دنین ، بابلیون وغیرہ پر تھیں اور انھیں مقامات پر مسلمانوں سے ان کا سخت مقابلہ ہؤا ۔

ابن عبدالحکم نے لکھا ہے کہ قبطیوں کا بطریق اس زمانے میں اسکندریہ میں تھا اور اس کا نام ' ابوسیامین ' تھا لیکن یہ درست نہیں کیونکہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ بنیامین رومیوں کے مصر پر دوبارہ قابض ہونے کے بعد بھاگ کر ایک گرجے میں جا چھپا تھا ، رومیوں نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ اسے گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے ، البتہ اس کے بھائی مینا پر ان کا قابو چل گیا اور انھوں نے یعقوبی عیسائیوں سے سخت عداوت کی بنا پر اسے نہایت بے دردی سے قتل کر دیا ۔

* مسٹر بٹلر ' کتاب البلدان' یعقوبی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جو مسافر فلسطین سے مصر آتا ہے وہ سب سے پہلے شجرتین پہنچتا ہے جو عین مصر کی سرحد پر واقع ہے ، وہاں سے العریش آتا ہے ، العریش سے وہ بقارہ اور ورادہ کی بستیوں سے گزرتا ہؤا فرما پہنچتا ہے جو فلسطین کی جانب مصر کا پہلا بڑا شہر ہے ۔ فرما سے خسطاط پہنچنے کے لیے اسے جریر اور جیقہ سے گزرنا پڑتا ہے ۔

(۳) فرما : العریش کے نخلستان سے نکل کر اور ساحل سے ردو ہٹ کر عمرو بن العاص نے مغرب کی جانب رخ کیا۔ اب آپ کے سامنے ایک مہیب اور لق و دق صحرا تھا جس میں کہیں کہیں بستیاں اور نخلستان بھی پائے جاتے تھے - صدیوں سے یہی راستہ مصر کے بڑے بڑے شہروں تک پہنچانے کے لیے مستعمل ہوتا تھا - اسی راستے سے حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف جیسے جلیل القدر پیغمبر اور قمبیز اور سکندر جیسے فاتح گزرے تھے - تاجر ، سیاح اور حجاج بھی اسی راستے گزرتے تھے - ان قافلوں کا راستہ بھی جو ایشیا سے افریقہ اور افریقہ سے ایشیا آتے جاتے تھے یہی تھا - عمرو بن العاص کو راستے میں کہیں بھی رومیوں سے مقابلہ پیش نہ آیا حتیٰ کہ آپ فرما (پیلو زیمہ) پہنچ گئے - یہ ایک پرانا شہر تھا جو دریائے نیل کے کنارے آباد تھا - یہاں کئی مضبوط قلعے اور سنگین فصیلیں تھیں - گرجوں اور کلیساؤں کی بلند و بالا اور شاندار عمارات بنی ہوئی تھیں - ساحل بحر پر اس کی ایک بندرگاہ بھی تھی جہاں تک پہنچنے کے لیے دریائے نیل سے ایک نہر نکالی گئی تھی - فرما کو مصر کی کنجی سمجھا جاتا تھا اور اس زمانے میں اس کی بڑی اہمیت تھی -

ایک مہینے تک عمرو بن العاص نے اس شہر کا محاصرہ جاری رکھا* - آخرکار مسلمان شہر کے ایک دروازے پر قبضہ کرنے

---

* یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ لڑائی دو ماہ تک جاری رہی لیکن مقریزی ، ابن عبدالحکم ، سیوطی اور ابن اثیر وغیرہم بالاتفاق لڑائی کا ایک ماہ جاری رہنا بیان کرتے ہیں -

میں کامیاب ہو گئے ۔ رومیوں نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے اور شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا ۔ اگر اسلامی لشکر کی تعداد کم نہ ہوتی اور رومی ان قلعوں اور فصیلوں کی از سرنو مرمت کر کے انھیں مضبوط نہ کر لیتے ، جنھیں ایرانیوں نے یلغار کے دوران میں بالکل تباہ و برباد کر دیا تھا تو عمرو بن العاص کے لیے ایک مہینے سے بھی کم عرصے میں فرما کو فتح کر لینا مشکل نہ ہوتا ۔

بٹلر کے بیان کے مطابق فرما پر مسلمانوں کا قبضہ جنوری ۶۴۰ء کے وسط میں ہؤا تھا لیکن عرب مؤرخین کے نزدیک یکم محرم الحرام ۱۹ھ مطابق ۲ جنوری ۶۴۰ء کو ۔

ڈاکٹر بٹلر لکھتے ہیں کہ مقریزی اور ابوالمحاسن کے نزدیک فرما پر مسلمانوں کے قبضے کی وجہ یہ ہوئی کہ محاصرے کے دوران میں قبطی باشندوں نے مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کی لیکن یہ صحیح نہیں ۔ وہ نقیوس کے اسقف 'یوحنا' کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ قبطیوں نے فیوم پر قبضے سے قبل مسلمانوں کی طرف دست تعاون دراز نہ کیا اور یہ تعاون بھی جزوی اور محدود ہی تھا ۔

فرما سے فراغت پا کر عمرو بن العاص آگے بڑھے اور بلبیس پہنچے جو شہر 'مصر' سے تیس میل کے فاصلے پر واقع ہے ۔ راستے میں چند معمولی جھڑپوں کے سوا کوئی بڑی جنگ نہیں ہوئی ۔ بلبیس کو فتح کرنے میں بھی ایک مہینا صرف ہؤا ۔

اس موقع پر اس راستے کے متعلق کچھ بیان کرنا ضروری ہے جسے طے کر کے عمرو بن العاص فرما سے بلبیس پہنچے ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا آپ نے وہی راستہ اختیار کیا جو ان سے

پہلے فاتحین نے اختیار کیا تھا یا وہ راستہ اس معروف راستے سے علحدہ تھا اور راستے میں آپ نے کن کن شہروں سے گزر کر انھیں فتح کیا ؟

مسٹر بٹلر نے ہماری یہ مشکل آسان کر دی ہے ۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ " فرما کے نخلستان سے نکل کر عمرو بن العاص ایک پتھریلی سرزمین سے گزرے جہاں سفید سنگریزے کثرت سے ملتے ہیں ۔ یہ پتھریلی سرزمین ایک ریگستان تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے ۔ ریگستان کو قطع کرکے آپ ' مجدل '* پہنچے ۔ وہاں سے آپ نے نہر سویز کے اس مقام کا رخ کیا جسے اب ' القنطرہ ' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جہاں ریگستانی سرزمین کی سطح پر سخت کنکریوں کی ایک تہ بچھی ہوئی ہے ۔ ریگستان کے ایک حصے میں کئی نخلستان واقع ہیں ، کھاری پانی کی بعض ندیاں بھی ہیں جن کے کناروں پر سرکنڈے اور نرسل وغیرہ آگے ہوئے ہیں ۔ القنطرہ سے آپ صالحیہ اور قصاصین کی سمت بڑھے ، وہاں سے جنوب کی طرف وادئ طمیلات کے ٹیلوں سے گزرتے ہوئے بلبیس کے قریب پہنچے ۔"

عمرو بن العاص سے پہلے حملہ آوروں اور فاتحوں نے اس راستے سے علحدہ دوسرے راستے اختیار کیے تھے ۔ مثلاً قمبیز نے فرما سے نکل کر ' سنہور ' اور ' تنیس ' (صان) کا رخ کیا تھا اور وہاں سے بلبیس پہنچا تھا ۔ لیکن اسلامی یلغار کے وقت بحیرہ منزلہ کے اردگرد کئی چھوٹی چھوٹی ندیاں پیدا ہو گئی

* مجدل ایک پرانا شہر ہے جو فرما کے متصل صحرا میں ساحل بحر کے قریب واقع ہے ۔

تھیں اس لیے عمرو بن العاص کے لیے — جن کے پاس دریاؤں اور نہروں کو عبور کرنے کا ساز و سامان بالکل نہ تھا — یہ راستہ اختیار کرنا بہت مشکل اور دشوار تھا ۔

اگر عمرو بن العاص مذکورہ بالا راستہ اختیار کرتے تو یقیناً ان کی قوت قلعۂ بابلیون تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جاتی جو ان کا اصل مقصود تھا کیونکہ اس طرح نہ صرف انھیں دریاؤں کو عبور کرنے کی نا قابل برداشت تکالیف اٹھانی پڑتیں بلکہ کئی شہروں میں رومیوں سے سخت مقابلہ بھی کرنا پڑتا اور اپنی پشت کی حفاظت کے لیے ہر مفتوحہ شہر میں کچھ فوج چھوڑنی پڑتی ۔

بلبیس میں رومی فوج کا قائد وہی ارطبون تھا جو بیت المقدس کے محاصرے کے وقت رومی فوج کا سپہ سالار رہ چکا تھا اور وہاں سے بھاگ کر یہاں آ گیا تھا ۔ مسلمانوں کے مقابلے کے لیے اس نے ہر قسم کا ساز و سامان مہیا کر رکھا تھا اور اپنے لشکر کو پوری طرح جنگ کے لیے تیار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی ۔ اس نے چاہا کہ فریب اور دھوکے سے مسلمانوں پر حملہ کر کے انھیں مغلوب کر لے ۔ چنانچہ ایک رات اس نے اچانک اسلامی کیمپ پر حملہ کر دیا ، لیکن مسلمان بھی غافل نہ تھے ، انھوں نے اس حملے کو بری طرح پسپا کر دیا ۔ ایک مہینے تک جنگ جاری رہی جس میں مسلمانوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑا لیکن رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے نقصان کی کوئی حقیقت نہ تھی ۔ اس دوران میں رومیوں کے ایک ہزار آدمی قتل ہوئے اور تین ہزار آدمی قیدی بنا لیے گئے ۔ بلبیس پر مسلمانوں کا قبضہ ۱۹ھ مطابق ۶۴۰ء میں ہوا اور وہ ڈیلٹا کے سرے سے صرف ایک دن کی مسافت پر رہ گئے ۔

(٤) ام دنین* : بلبیس پرقبضہ کرنے کےبعد عمروبن العاص ام دنین کی طرف بڑھے جو بابلیون کے شمال میں دریائے نیل کے کنارے پرایک قصبہ تھا ۔ بندرگاہ ہونے کی وجہ سے اسے زبردست اہمیت حاصل تھی لہٰذا رومیوں نے اس کی حفاظت کے لیے بھاری انتظامات کر رکھے تھے ۔ رومیوں کا ایک لشکر جرار مسلمانوں کے مقابلے کے لیے یہاں موجود تھا ۔ ہفتوں تک فریقین کے درمیان لڑائی کا سلسلہ جاری رہا اور عمرو بن العاص ان پر فتح حاصل نہ کر سکے ۔ آخر انھوں نے حضرت عمر کو مدد بھیجنے کے لیے لکھا۔ حضرت عمر نے ان کی درخواست پر چار ہزار آدمی روانہ کیے جن میں زبیر بن عوام ، عبادہ بن صامت ، مقداد بن اسود اور مسلمہ بن مخلد جیسے جلیل القدر صحابہ بھی شامل تھے† ۔

---

* ام دنین کی بستی موجودہ شہر قاہرہ اور دریائے نیل کے درمیان واقع تھی ۔ جب قاہرہ کی بنیاد ڈالی گئی اور شہر نے پھیلنا شروع کیا تو اس نے ام دنین کو بھی لپیٹ میں لے لیا ۔ فتح سے پہلے اس کا نام 'تندونیاس' تھا ۔ موجودہ نام اسے عربوں نے دیا ۔ بٹلر نے یہ رومی نام یوحنا ، اسقف نقیوس کے حوالے سے لکھا ہے ۔

† حضرت عمر کے قول کے مطابق ان چاروں اصحاب میں سے ہر شخص ایک ہزار آدمی کے برابر تھا ۔ ان کے علاوہ جو صحابہ مصر کی جنگوں میں عمرو بن العاص کے ساتھ رہے ان میں خارجہ بن حذافہ ، عبداللہ بن عمر بن الخطاب ، قیس بن ابی العاص السہمی ، عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ، شرحبیل بن حسنہ اور ان

باقی صفحہ ۱۱۳ پر

ام دنین کا محاصرہ مسلمانوں کو بہت مہنگا پڑا ۔ ان کی تعداد پہلے ہی بہت کم تھی ، روزانہ لڑائیوں میں کئی مسلمانوں کو جام شہادت نوش کرنا پڑتا تھا ۔ اس میں شبہ نہیں کہ رومیوں کا نقصان مسلمانوں کی نسبت زیادہ ہوتا تھا لیکن مسلمانوں کو اپنا تھوڑا نقصان قلت تعداد کی وجہ سے بہت زیادہ اور رومیوں کو اپنا زیادہ نقصان کثرت تعداد کی وجہ سے بہت کم معلوم ہوتا تھا اسی لیے مسلمانوں پر ناامیدی اور یاس نے غلبہ پانا شروع کیا ۔ یہ حالت دیکھ کر ایک طرف تو عمرو بن العاص نے حضرت عمر کو لکھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو امداد روانہ کی جائے اور دوسری طرف وہ سوچنے لگے کہ فی الحال ام دنین کا محاصرہ چھوڑ کر کسی اور شہر کا قصد کیا جائے ۔ بٹلر نے لکھا ہے کہ عمرو بن العاص کا ارادہ ام دنین کا محاصرہ چھوڑ کر فیوم جانے اور اسے فتح کرنے کا تھا لیکن پھر انھوں نے سوچا کہ ایسا کرنا ان کے لیے مہلک ثابت ہو گا اور اس سے رومیوں کے حوصلے بلند ہو جائیں گے ۔ اس لیے انھوں نے اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھائی اور ایک دن پورے زور شور سے قلعے پر حملہ کردیا اور اس وقت تک نہایت بے جگری سے لڑتے رہے جب تک قلعے پر ان کا پوری طرح قبضہ نہ ہوگیا ۔ دریا میں رومیوں کی جو بے شمار کشتیاں تھیں وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گئیں ۔ ان کشتیوں نے آگے چل کر مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچایا ۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۲

کے دونوں بیٹے عبدالرحمن اور ربیعہ ، عمرو بن العاص کے غلام وردان ، محمد بن مسلمہ انصاری ، ابوالدرداء ، عبداللہ بن عمرو بن عاص ، رسول اللہ کے آزاد کردہ غلام ابو رافع وغیرہم شامل تھے ۔

(۵) فتح فیوم و عین شمس : مصر کی فتوحات کی ترتیب کے بارے میں بھی مؤرخین میں اتنا ھی اختلاف پایا جاتا ھے جتنا فتوحات شام کے بارے میں ۔ چند مؤرخین نے تو بعض اھم واقعات کا ذکر بھی چھوڑ دیا ھے ۔ بعض نے ذکر تو کیا ھے لیکن ان کا بیان نہایت تشنہ ھے جس سے اصل حقیقت تک پہنچنا بہت مشکل اور یہ معلوم کرنا بہت دشوار ھو جاتا ھے کہ کس مؤرخ کا بیان حقیت الامر کے مطابق ھے اور کس کا نہیں ۔ یہ اختلاف صرف مؤرخین عرب ھی میں نہیں بلکہ یورپی مؤرخین میں بھی ھے ، اگرچہ مؤرخین عرب سے کم ۔ ذیل میں ھم اس اختلاف کی تفصیل درج کرتے ھیں ۔ اس کے بعد ھم بتائیں گے کہ ھمارے نزدیک کون سی ترتیب زیادہ صحیح ھے اور اس کے وجوہ کیا ھیں ۔ ھم اس بحث کو صرف غزوہ فیوم اور واقعۂ عین شمس ھی تک محدود رکھیں گے کیونکہ اختلاف کی بنیاد یہی دو لڑائیاں ھیں ۔

ابن عبدالحکم ، مقریزی اور سیوطی نے وقائع مصر کی ترتیب اس طرح بیان کی ھے ۔ العریش ، فرما ، بلبیس ، ام دنین ، بابلیون ۔ معلوم ھوتا ھے کہ ان مؤرخین نے اپنے بیان کی بنیاد ابن عبدالحکم پر رکھی ھے جو مصر کا سب سے قدیم مؤرخ ھے کیونکہ ان تمام مؤرخین کی عبارت یکساں ھے، ایک لفظ تک کا اختلاف نہیں ۔ بٹلر نے یہی ترتیب برقرار رکھتے ھوئے اس میں یہ اضافہ کیا ھے کہ اس نے جنگ فیوم اور واقعۂ عین الشمس (ھلیو پولیس) کو محاصرہ بابلیون یا قصر الشمع سے پہلے رکھا ھے ۔

واقدی اور رفیق بک العظم نے بھی واقعات کو سابقہ ترتیب

سے بیان کیا ھے ، البتہ ان دونوں نے واقعۂ امدنین اور واقعۂ عین الشمس کا ذکر اپنی کتابوں میں نہیں کیا ۔

طبری اور ابن خلدون نے واقعات کی ترتیب یہ رکھی ھے : عین شمس ، فرما ، بلبیس ۔ ان دونوں نے لکھا ھے کہ عمروبن العاص نے پہلے عین شمس پر قبضہ کیا جہاں رومی بھاری تعداد میں جمع تھے ۔ (غالباً ان کا مقصد بابلیون کی لڑائی کا ذکر ھے جسے انھوں نے غلطی سے عین شمش کا نام دے دیا) ۔ وھاں سے انھوں نے بیک وقت ابرھہ بن صباح کو فرما کی طرف اور عوف بن مالک کو اسکندریہ کی طرف بھیجا ۔ لیکن طبری اور ابن خلدون کا یہ بیان غلط ھے کیونکہ عمرو بن العاص نے بابلیون کے محاصرے کے بعد بطورخود اسکندریہ کی طرف پیش قدمی کی ۔ یہ البتہ ھو سکتا ہے کہ آپ نے اپنے بعض دستوں کو اسکندریہ کے قرب و جوار میں اس غرض سے بھیجا ھو کہ وہ اس جانب رومیوں سے چھیڑچھاڑ جاری رکھیں اور بابلیون کی طرف رومیوں کی کوئی کمک نہ پہنچنے دیں ۔ لیکن تاریخ سے ھمیں کوئی ایسا ثبوت نہیں ملتا جس سے ھمارے اس خیال کی تائید ھوتی ھو ۔

ایرفنج اور میور نے فرما اور بابلیون کی لڑائیوں کا ذکر کیا ھے ، عین شمس کا نہیں ۔ لیکن انھوں نے بھی طبری اور ابن خلدون کی طرح عین شمس کی لڑائی کا اطلاق بابلیون پر کر دیا ھے ۔

تمام مؤرخین کے بیان کردہ واقعات پر نظر ڈالنے کے بعد ھماری رائے میں لڑائیوں کی ترتیب اس طرح ھے ۔ العریش ، فرما ، بلبیس ، امدنین ، فیوم ، عین شمس (ھلیو پولیس) ۔ بابلیون (قصر شمع)۔

اب ھم مختصر طور پر ان واقعات کا ذکر کریں گے جو بٹلر

نے جنگ فیوم اور جنگ عین شمس کے متعلق بیان کیے ہیں۔
اسی ضمن میں ہم یہ بھی بتائیں گے کہ ہم نے جو ترتیب قائم
کی ہے اس کے کیا وجوہ ہیں -

جنگ فیوم*

ڈاکٹر بٹلر لکھتے ہیں کہ امدنین فتح ہونے کے بعد عمرو بن العاص
کے قبضے میں بے شمار کشتیاں بھی آ گئیں - آپ چاہتے تھے کہ
اب قلعہ بابلیون کی طرف بڑھیں لیکن آپ کے پاس اتنے آدمی نہ
تھے جو رومیوں سے مقابلے کے لیے کافی ہوتے - حضرت عمر نے
جو کمک بھیجی تھی وہ ابھی تک نہ پہنچی تھی - کمک پہنچنے
تک آپ نے اپنی فوج کو بیکار رکھنا نہ چاہا - آپ اسے کشتیوں
میں سوار کر کے 'منف' لے گئے جو دریائے نیل کے مغربی کنارے
پر قلعۂ بابلیون کے بالمقابل واقع تھا - اس پر قبضہ کرنے کے

---

* بٹلر نے یوحنا ، اسقف نقیوس کے حوالے سے (جسے وہ فتح
مصر کے واقعات کے بیان میں سب سے مستند ذریعہ سمجھتے ہیں)
لکھا ہے ، " مجھے پورا وثوق ہے کہ مصر کی جنگوں کی جو
ترتیب میں نے بیان کی ہے وہی صحیح ہے - یہ ترتیب مؤرخین
عرب میں سے کسی نے بیان نہیں کی - " بٹلر کا یہ بیان صحیح
نہیں اور ہم پہلے اس اختلاف کی تفصیل بیان کر چکے ہیں -
سیوطی کا بیان بھی بٹلر کے خلاف ہے - وہ لکھتے ہیں کہ مصر پر
عمرو بن العاص کی چڑھائی کے ایک سال بعد تک فیوم کی تسخیر
نہ ہو سکی - (تاریخ الخلفاء ، جلد اول ، صفحہ ۶۲) علامہ بلاذری
بھی فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ " فیوم ، بابلیون کے قلعے
پر عربوں کے قبضے کے بعد فتح ہؤا - "

بعد آپ ' فیوم ' کی جانب بڑھے اور دس میل آگے جا کر شہر ' لاھون ' کے متصل ' بہنساء ' مقام کو فتح کر لیا ۔ اس جگہ ایک رومی امیر یوحنا نے پچاس سواروں کے ایک دستے کے ساتھ اسلامی لشکر کی حرکات و سکنات کا سراغ لگانا چاھا لیکن جلد ھی اسے معلوم ھو گیا کہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنا تو درکنار خود اسے اور اس کی فوج کو سخت خطرہ ھے ۔ اس پر اس نے ایک قریبی رومی چھاؤنی ' ابواط ' پہنچنا چاھا ۔ لیکن عمرو بن العاص کو بر وقت اس کی اطلاع ھو گئی جس پر آپ نے اس کے دستے کو گھیر کر قتل کر ڈالا اور مع یوحنا کوئی بھی شخص زندہ واپس نہ جا سکا ۔

ڈاکٹر بٹلر لکھتے ھیں کہ عمرو بن العاص مفتوحہ شہروں سے قبضہ اٹھا کر فیوم اور بہنساء کی طرف گئے تھے لیکن یہ بات بالکل خلاف واقعہ ھے ۔ یہ کیونکر ھو سکتا تھا کہ عمرو بن العاص جیسے زیرک سپہ‌سالار العریش ، فرما ، بلبیس اور ام دنین جیسے اھم شہروں پر اچھی طرح تسلط جمانے کے بعد یک لخت ان پر سے اپنا قبضہ اٹھا لیتے ۔ اگر ان سے ایسی عدم مآل‌اندیشی وقوع میں آئی بھی تھی تو رومیوں کے لیے کیا مشکل تھا کہ وہ ان علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر کے اپنی پوزیشن مستحکم کر لیتے اور اس کمک کو ، جو عمرو بن العاص کی مدد کے لیے آ رھی تھی ، راستے ھی میں روک لیتے؟ اس طرح عمرو بن العاص کے لیے کوئی راہ فرار باقی نہ رھتی اور انھیں ان کے قلیل ھمراھیوں کے ساتھ چاروں طرف سے گھیر کر آسانی سے ختم کر دیا جاتا ۔ ڈاکٹر بٹلر نے اپنی کتاب میں بہنساء اور بالائی مصر کے دیگر معرکوں کی جو تفصیلات بیان کی ھیں وہ اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتیں ۔ ھمارا غالب گمان یہ ھے کہ بٹلر نے بعض فرضی

قصوں کو صحیح سمجھ کر درج کر دیا ہے ۔ غلطی کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس نے بہنساء کے ان قبطی لوگوں کو جو رومی عہد میں رومیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور جنھیں مسلمان بھی شہداء کہنے لگے تھے ، مسلمان شہید سمجھا اور اسی بنا پر یہ خیال کر لیا کہ عمرو بنؓ العاص اپنے لشکر کو ساتھ لے کر فیوم کی جانب گئے تھے ۔

جب رومی سپہ سالار تھیوڈورس نے سنا کہ ' ام دنین ' کے مقام پر روسی لشکر کو سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اور وہاں کی تمام کشتیاں مسلمانوں کے قبضے میں آ گئیں تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ اس نے مصر کے اطراف و جوانب سے رومی فوجیں اکٹھی کرنی شروع کیں تا کہ قلعۂ بابلیون پر مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کی جائے ۔ عمرو بن العاص بھی یہ خبر سن کر شہر فیوم پر قبضہ کیے بغیر بہنساء سے اپنے فوجی مستقر ' عین شمس ' پہنچ گئے ۔ اس عرصے میں رومیوں سے ان کی کئی چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوئیں جن سے اور کوئی فائدہ ہؤا یا نہ ہؤا مگر یہ ضرور ہؤا کہ رومیوں پر مسلمانوں کا رعب چھا گیا ۔ اسی دوران میں عمرو بن العاص کو یہ خبر ملی کہ حضرت عمر کی بھیجی ہوئی کمک ، جو چار ہزار سپاہ پر مشتمل تھی ، زبیر بن عوام کی قیادت میں عین شمس کے قریب پہنچ گئی ہے*۔

* مؤرخین میں اس فوج کی تعداد کے بارے میں بھی اختلاف ہے ۔ ابن عبدالحکم لکھتے ہیں کہ فوج کی تعداد چار ہزار تھی ۔ ابن عبدالحکم ہی کی ایک روایت میں یہ تعداد بارہ ہزار بیان ہوئی ہے ۔ سیوطی اور مقریزی نے لکھا ہے کہ یہ فوج چار ہزار تھی اور اس کی سرکردگی چار آدمی کر رہے تھے جن

باقی صفحہ ۱۱۹ پر

بٹلر کے بیان کے مطابق فیوم کی جنگوں کی ابتداء مئی ۶۴۰ء میں ہوئی اور یہ جنگیں چند ہفتے جاری رہیں - ان سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا - اسلامی کمک ۶ جون کو ہلیو پولیس (عین شمس) پہنچ گئی -

جنگ عین شمس

تھیوڈورس کے پاس اطراف و جوانب سے بیس ہزار رومی سپاہ کا عظیم الشان لشکر جمع ہوگیا تھا - پہلے اس کا خیال قلعہ بابلیون کے باہر مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا تھا لیکن بعد ازاں اس کی رائے بدل گئی اور اس نے ارادہ کیا کہ پہلے وہ ہلیو پولیس (عین شمس) سے مسلمانوں کو ہٹا دے ، اس کے بعد زور شور سے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۸

میں سے ہر شخص ایک ہزار آدمیوں کے برابر تھا - بلاذری نے یہ تعداد دس اور بارہ ہزار کے درمیان بتائی ہے - یاقوت حموی نے لکھا ہے کہ کہا جاتا ہے یہ کمک بارہ ہزار اشخاص پر مشتمل تھی - کندی اور سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ کمک پہنچنے کے بعد عمرو بن العاص کے لشکر کی کل تعداد ساڑھے پندرہ ہزار ہو گئی تھی -، یوحنا اسقف نقیوس نے چار ہزار کی تعداد بیان کی ہے -

ان مختلف روایات کی موجودگی میں ہمارے لیے کوئی قطعی رائے قائم کرنا ممکن نہیں - ہمارا گمان ہے کہ یہ کمک چار ہزار سپاہ سے زائد نہ ہو گی ، یہ بات سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ عمرو بن العاص چار ہزار سپاہ لے کر مصر روانہ ہوئے تھے لیکن حضرت عمر نے جو کمک بھیجی وہ اصل فوج سے کئی گنا بڑھ کر تھی - بارہ ہزار کی تعداد غالباً رفتہ رفتہ ہو گئی ہو گی -

مسلمانوں کے خلاف اپنی جنگی کارروائیوں کا آغاز کرے۔ تھیوڈورس کا یہ فیصلہ عمرو بن العاص کے حق میں بہت مفید ثابت ہؤا۔ آپ دل سے چاہتے تھے کہ رومیوں سے مقابلہ کھلے میدان میں ہو کیونکہ قلعہ بابلیون جیسے محفوظ اور مضبوط قلعوں کا محاصرہ کرنے کی نسبتؑ کھلے میدان میں رومیوں سے لڑنا زیادہ آسان تھا۔

ارادے کے مطابق تھیوڈورس اپنا لشکر عین شمس لے آیا۔ عمرو بن العاص نے فوج کے تین حصے کیے۔ ایک حصے کو عباسیہ کے مشرق میں جبل احمر کے درمیان خفیہ جگہوں میں اور دوسرے حصے کو دریائے نیل کی گزرگاہ میں ام دنین کے قریب کمین گاہوں میں چھپا دیا، تیسرے حصے کو اپنے ساتھ لے کر تھیوڈورس کے مقابلے کو نکلے۔ جہاں آج کل عباسیہ آباد ہے وہاں لڑائی کا بازار گرم ہؤا۔ فریقین کو بخوبی علم تھا کہ اسی لڑائی پر مصر کی آئندہ قسمت کا انحصار ہے۔ عین اس وقت جب لڑائی کی آگ پورے زور شور سے بھڑک رہی تھی، خارجہ بن حذافہ اپنا دستہ لے کر پہاڑ سے نکلے اور بجلی کی طرح رومیوں کے ساقہ پر ٹوٹ پڑے۔ اس اچانک حملے سے رومیوں کا نظام درہم برہم ہوگیا اور وہ بدحواس ہو کر بجانب غرب، ام دنین کی طرف بھاگے۔ یہاں پہلے سے ان کے مقابلے کے لیے وہ لشکرموجود تھا جو عمرو بن العاص نے دریائے نیل کی گزرگاہ میں چھپا رکھا تھا۔ اس طرح رومی تین فوجوں کے درمیان گھر گئے جنھوں نے انھیں بری طرح پیس کر رکھ دیا۔ بیس ہزار کے عظیم الشان لشکر میں سے بہت ھی قلیل تعداد جانیں بچا کر لے جا سکی۔ فرار ہونے والے رومیوں میں سے کچھ تو دریائے نیل میں غرق ہوگئے اور کچھ بابلیون کی طرف بھاگ گئے۔ (سٹینلے لین پول اور بٹلر)

" تاریخ مصر الی فتح الاسلامی" کے مصنف نے لکھا ہے کہ عین شمس کی تاریخی لڑائی میں عرب لشکر کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد صرف تین سو رومی جانیں بچا کر بھاگ سکے ، مصنف مذکور کا یہ بیان بٹلر کی کتاب سے ماخوذ ہے جس میں لکھا ہے کہ فاتح عرب ' ام دنین ' پر دوبارہ قابض ہو گئے ، اس قلعے کی حفاظت کرنے والی رومی فوج ساری کی ساری میدان جنگ میں کام آئی ، صرف تین سو خوش قسمت ایسے تھے جو زندہ بچ سکے ۔ لین پول بھی بٹلر کی تائید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ تندونیاس (ام دنین) پر مسلمان قابض ہو گئے اور تین سو خوش قسمت انسانوں کے سوا باقی ساری رومی فوج میدان جنگ میں کام آئی ۔

جنگ فیوم اور جنگ عین شمس کے متعلق بٹلر نے یوحنا اسقف نقیوس کی کتاب پر اعتماد کیا ہے اور تمام عرب مؤرخین کے مقابلے میں جنھوں نے اپنی تاریخوں میں جنگ فیوم کا ذکر نہیں کیا اس مؤرخ کے بیان کردہ واقعات کو ترجیح دی ہے ۔ سیوطی کو چھوڑ کر باقی تمام عرب مؤرخین نے لکھا ہے کہ فیوم کی فتح ان واقعات کے ایک سال بعد ، یعنی قلعہ بابلیون کی فتح کے بعد وقوع میں آئی ۔

بٹلر نے اپنے اس دعوے کے ثبوت میں کہ جنگ فیوم قلعہ بابلیون کی فتح سے پہلے واقع ہوئی تھی یہ دلیل پیش کی ہے ، عمرو بن العاص کو یقین تھا کہ وہ اپنی قلیل فوج سے یہ قلعہ کبھی فتح نہ کر سکیں گے اس لیے آنھوں نے چاہا کہ کمک پہنچنے تک لشکر کو فیوم جیسے کم خطرے والے مقام پر مشغول رکھیں تاکہ جزوی جنگوں میں ان کی فتوحات سے دشمن کے دل پر رعب قائم ہو سکے ۔ لیکن مسٹر بٹلر یہ بات فراموش کر

گئے کہ ایسا کرنے سے تو عمرو بن العاص نے اپنی فوج کو مزید مشکلات میں مبتلا کر کے اپنے لیے نازک صورت حال پیدا کر لی تھی - وہ یہ بات نظرانداز نہ کر سکتے تھے کہ جونہی انھوں نے اپنی فوج کو العریش ، فرما ، بلبیس ، ام دنین وغیرہ مفتوحہ شہروں سے ہٹایا ، رومی فوراً آ کر ان پر قبضہ کر لیں گے - اس طرح نہ صرف ان کے ہاتھوں سے ان کے مفتوحہ شہر ہی نکل جائیں گے بلکہ رومی ان کی واپسی کا راستہ بھی منقطع کر کے ان کے لیے زندگی کی تمام راہیں بند کر دیں گے - یہ بات بھی قابل غور ہے کہ فیوم تک پہنچنے کے لیے عمرو بن العاص کو دریائے نیل عبور کرنا پڑتا تھا - دریا کے کنارے پر قلعۂ بابلیون واقع تھا - اگر عمرو بن العاص نے واقعی فیوم کی جانب کوچ کیا ہوتا تو رومی اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھاتے اور دریا کو عبور کرنے کے دوران ہی میں وہ مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا دیتے - اگر عمرو بن العاص نے مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ دیا ہوتا تو آپ حضرت عمر کی بھیجی ہوئی کمک کے ساتھ سب سے پہلے ان شہروں کو فتح کرتے جو ایک مرتبہ آپ کے ہاتھ سے نکل چکے تھے - لیکن کسی بھی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ اس امدادی فوج کو ھلیوپولیس (عین شمس) پہنچنے سے پہلے کسی اور جگہ مقابلہ پیش آیا ہو -

ظاہر ہے کہ بٹلر نے یوحنا اسقف نقیوس کی کتاب میں بہنساء کی جنگ کا حال پڑھا تھا - اس کے علاوہ اس نے تاریخ کی بعض دوسری کتابوں میں ' شہداء بہنساء ' کے متعلق بھی کچھ حالات مطالعہ کیے تھے - اس بناء پر اس نے یہ خیال کر لیا کہ ھلیو پولیس (عین شمس) کی جنگ سے پہلے فیوم کی جنگ ہوئی تھی جس میں بہت سے مسلمان مارے گئے تھے حالانکہ یہ

' شہداء ' وہ یعقوبی لوگ تھے جو رومیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے -

ب : قلعہ بابلیون کا محاصرہ

قبل اس کے کہ ہم اصل موضوع کے متعلق کچھ لکھیں ، مقوقس کے متعلق کچھ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں -

(۱) مقوقس : مؤرخین اس امر پر متفق ہیں کہ فتح مصر کے وقت جس شخص کا لقب مقوقس تھا وہ رومیوں کے نزدیک بہت قابل احترام حاکم تھا اور اسی شخص نے عربوں سے صلح کی تھی - لیکن جہاں تک اس کے نام ، اس کی قومیت ، اس کے فرائض اور مقوقس کے لقب کے معنی کا تعلق ہے ان میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے -

جن مؤرخین نے مقوقس کے متعلق تفصیلی بحث کی ہے وہ دو ہیں ، ایک ڈاکٹر بٹلر ، جنھوں نے اپنی کتاب The Arab Conquest of Egypt میں ایک پورا باب مقوقس کے متعلق وقف کیا ہے ، اور دوسرے موسیو اسیلینو جنھوں نے نومبر ۱۸۸۸ء میں ایک رسالے میں بیس صفحے سے زائد ایک مقالہ مقوقس پر سپرد قلم کیا تھا -

یہ دو مؤرخ اس امر پر متفق ہیں کہ مقوقس رومیوں کی جانب سے مصر کا والی تھا اور والی ہونے کے ساتھ وہ ملکی فرقے کا بطریق بھی تھا - یہ امر قابل ذکر ہے کہ مصریوں کی اکثریت یعقوبی فرقے سے تعلق رکھتی تھی ، اس لحاظ سے مقوقس کا مذہب مصریوں کے سواد اعظم کے مذہب سے مختلف تھا - اس سلسلے

میں بٹلر اور موسیو امیلینو کے علاوہ ہم چند اور یورپی مؤرخین کے اقوال بھی یہاں درج کرتے ہیں :

مسٹر فون رانکی لکھتے کہ مقوقس مصر کا والی تھا اور مصر کے اصلی باشندوں یعنی قبطیوں سے تعلق رکھتا تھا ۔ دی غویہ لکھتا ہے ، معلوم یہ ہوتا ہے کہ مؤرخین عرب نے مقوقس اور اسکندریہ کے بطریق ' فیرس ' دونوں کو ایک ہی شخص سمجھا ہے حالانکہ یہ دونوں مختلف شخصیتیں تھیں اور دونوں کے فرائض بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے ۔ مسٹر ملن اپنی کتاب A History of Egypt Under Roman Rule کے صفحہ ۲۲۴ پر لکھتے ہیں کہ یوحنا اسقف نقیوس کے بیان کے مطابق مقوقس کا نام جریج بن مینا تھا ، وہ ' آثریب ' کا والی تھا اور اسی نے مصر کی کنجیاں عربوں کے حوالے کی تھیں ۔ مسٹر سٹینلے لین پول مقوقس کے نام کے بارے میں مسٹر ملن سے متفق ہیں لیکن جہاں مسٹر ملن نے اسے ایک محدود علاقے کا حاکم بتایا ہے مسٹر لین پول اسے پورے مصر کا حاکم بیان کرتے ہیں ۔ وہ عربوں کے اس بیان سے متفق ہیں کہ وہ قبطیوں میں سے تھا ۔ پروفیسر میری اپنی کتاب History of the Later Roman Empire میں لکھتے ہیں کہ مقوقس سارے مصر کا والی اور قبطیوں سے تعلق رکھتا تھا ۔ مسٹر گبن اپنی کتاب History of the Decline and Fall of the Romrn Empire کی جلد ۹ ، صفحہ ۲٦۸ پر لکھتے ہیں کہ مقوقس مصری النسل ، بہت مالدار اور شریف الطبع شخص تھا ۔ مسٹر ایرفنج لکھتے ہیں کہ مقوقس رومیوں کی جانب سے مصر کا والی تھا اور قبطی نسل سے تعلق رکھتا تھا ، وہ بہت بڑا منافق تھا اور یعقوبی مذہب کا پیرو تھا ۔

مؤرخین عرب بھی مقوقس کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکے -

مقوقس کے متعلق ان کی بیان کردہ روایات پر ایک نظر ڈالنے سے اس اختلاف کا علم ہو جاتا ہے جو اس کے نام ، کام، قومیت اور مذہب کے متعلق شدت سے ان میں پایا جاتا ہے تاہم عربی تواریخ سے اس امر کا پتا چلتا ہے کہ مصر میں اس زمانے میں تین سربرآوردہ اشخاص ضرور موجود تھے یعنی اعرج، ابومریم اور مقوقس۔

اعرج یا اعیرج

یاقوت حموی نے اسے منذفور کا لقب دیا ہے - معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں نے ' منذ طور ' سے بگاڑ کر منذفور بنا لیا - منذفور کے لفظی معنی امیر کے ہیں - ابوالمحاسن نے یاقوت کی پیروی میں اسے ' منذفور ' ہی لکھا ہے لیکن سیوطی نے اسے بدل کر ' منذفول ' بنا دیا ہے - بٹلر کی رائے یہ ہے کہ قلعے کے امیر کا اصلی نام جریج یا جارج تھا - عربوں نے اسے بدل کر اعرج اور اعیرج کر لیا - لین پول لکھتا ہے کہ اعرج یا اعیرج کے الفاظ ' ارطبون ' کے لفظ کے مشابہ ہیں - ہو سکتا ہے کہ مشہور رومی قائد ارطبون ہی کے سپرد اس قلعے کی حفاظت کا کام کیا گیا ہو -

ابو مریم

لین پول لکھتا ہے کہ ابو مریم مصر کا جاثلیق تھا - جاثلیق کے معنی بطریق کے ہیں - طبری لکھتے ہیں کہ وہ عیسائیوں کا بطریق اعظم تھا اور اس کی کنیت ابو مریم تھی - یہ بات ظاہر

ہے کہ اسلامی فتوحات کے وقت مصر میں صرف دو بڑے بطریق تھے ، ایک قیرس دوسرا بنیامین - قیرس کے لفظ سے تبدیل کر کے ابن مریم بنا دینا تو کسی طرح صحیح نہیں سمجھا جا سکتا ، غالباً بنیامین سے محرف کر کے ابن مریم بنا دیا گیا ہو تو تعجب نہیں - ناموں میں زیادہ تحریف ابن اثیر کے زمانے میں ہوئی ہے - سیوطی نے بنیامین کے لفظ میں تحریف کر کے اسے ابامیامین لکھا - اثیر کے زمانے تک ابامیامین ابومریم بن گیا -

مقوقس

قدیم مؤرخین ، مثلاً بلاذری ، طبری ، ساویرس اسقف اشمونین اور ابن اثیر وغیرہ ، مقوقس کی کوئی کنیت بیان نہیں کرتے - سب سے پہلے اس کی کنیت بیان کرنے والے ابو صالح ارمنی ہیں جنھوں نے اس کے لیے ' ابن مینا ' کنیت بیان کی ہے - یاقوت کے قول کے بموجب اس کی کنیت ابن قرقب یونانی ہے -

بٹلر نے طبری کے اس قول کو غلط بتایا ہے کہ مقوقس قبطیوں کا بڑا سردار تھا اور قلعہ بابلیون کی فتح کے وقت قلعے میں موجود تھا - بہ الفاظ دیگر وہ یعقوبی نہ تھا اور عربوں کی فتح کے وقت قلعے میں موجود نہ تھا - اسی طرح اس نے ملکی فرقے سے تعلق رکھنے والے ایک مؤرخ ' اوطیخا ' کے اس قول کی بھی تردید کی ہے کہ مقوقس یعقوبی تھا۔ بٹلر کے قول کے بموجب ' اوطیخا ' نے اسے محض اس لیے یعقوبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ملکی فرقے کو ان واقعات کی ذمہ داری سے بری ٹھہرا سکے جو مقوقس کے عہد میں رونما ہوئے -

بٹلر لکھتا ہے " ساویرس اسقف اشمونین کے سوا اور کسی

مؤرخ نے مقوقس کے حالات سے پردہ نہیں اٹھایا ۔ ساویرس نے اپنی کتاب ان متعدد کتابوں کی مدد سے لکھی ہے جو دیرسقاریوس کے کتب خانے میں موجود تھیں ۔ جو معلومات اس نے اپنی کتاب میں درج کی ہیں وہ اس قدر قیمتی اور ٹھوس ہیں جن کی نظیر قدیم مؤلفات میں ، جو میری نظر سے گزریں ، کسی ایک میں بھی نہیں پائی جاتی ۔ ساویرس لکھتا کہ مصر کو ایرانیوں کے پنجے سے چھڑانے کے بعد ہرقل نے قیرس کو مصر کا والی اور اسکندریہ کا بطریق مقرر کیا ۔ وہ دس سال تک اپنے عہدے پر برقرار رہا ۔ اس عرصے میں اس نے قبطی کلیسا کو شدید مظالم کا تختۂ مشق بنایا ۔ اس مدت کو بنیامین ان الفاظ میں بیان کرتا ہے " ظلم و ستم کے یہ دس سال وہ ہیں جن میں ہرقل اور مقوقس مصر پر مسلط رہے ۔" بنیامین نے قیرس کا لقب کافر رکھا تھا جو رومیوں کی جانب سے مصر کا والی اور اسکندریہ کا بطریق تھا ۔ ظلم و ستم کے اس دور کے متعلق بنیامین کہتا ہے "مقوقس نے آ کر مجھے میرے عہدے سے علحدہ کر دیا اور مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا ۔" ساویرس کے اس بیان سے بہ وضاحت ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کے نزدیک قیرس ہی مقوقس تھا جس کا وجود بنیامین سے بالکل علحدہ تھا ۔"

اس کے بعد بٹلر وہ دلائل بیان کرتا ہے جن کی رو سے اسے ساویرس کا بیان حقیقت کے عین مطابق دکھائی دیتا ہے اور عرب مؤرخین کے بیانات ناقابل اعتبار معلوم ہوتے ہیں ۔

جہاں تک عرب مؤرخین کا تعلق ہے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ مقوقس ہرقل کی جانب سے مصر کا والی اور اسکندریہ کا بطریق تھا اور اسی نے عربوں سے صلح کی تھی ، البتہ اس کے نام پر اتفاق نہیں ۔ کوئی کچھ بتاتا ہے کوئی کچھ ۔ یہ بات صرف

عرب مؤرخین ہی سے خاص نہیں ، یورپی مؤرخین کا بھی یہی حال ہے ۔

اسیلینو کہتا ہے کہ قیرس نامی شخص لامحالہ ۶۳۹ء میں مصر سے چلا گیا تھا اور اس بات کا قوی احتمال ہے کہ مقوقس کو قیرس کی جگہ چنا گیا ہو ۔ اسیلینو کے خیال میں مقوقس قیرس کا دشمن تھا ۔ گویا مسٹر اسیلینو مقوقس اور قیرس کو ایک وجود نہیں بلکہ علحدہ علحدہ وجود مانتے ہیں ۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ مقوقس یعقوبی فرقے سے نہیں بلکہ ملکی فرقے سے تعلق رکھتا تھا ۔

اسیلینو نے مقوقس کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا لب لباب یہ ہے :

(۱) مقوقس کا نام جورج بن مینا یا جورج بن قرقب تھا ۔

(۲) مقوقس کا والد یا والدہ کسی ایک جہت سے ضرور قبطی نژاد تھی ، گو دونوں جہتوں سے نہ ہو ۔ وہ کافی عرصے تک شہنشاہ ہرقل کی خدمت میں حاضر رہا ۔ مذہب کے لحاظ سے وہ ملکی تھا ۔

(۳) وہ ملکی فرقے کا بطریق تھا ۔

(۴) یہ تمام باتیں یقین اور وثوق سے نہیں کہی جا سکتیں بلکہ محض ظن اور قیاس کی بنا پر کہی جا رہی ہیں ۔

(۵) مقوقس کا لفظ کنیت ہے جو یونانی لفظ ' کوکیون ' سے مشتق ہے ۔ ' کوکیون ' سکہ کی ایک قسم ہے ۔

اسیلینو کے علاوہ 'پیریرا' نے بھی مقوقس کا لفظ ' کوکیون ' سے مشتق بتایا ہے ۔ لیکن بٹلر اس رائے کو صحیح نہیں مانتا ۔ وہ کہتا ہے کہ ہرقل نے قیرس کو بلاد قوقاز سے مصر بھیجا

تھا ۔ قوقاز کی مناسبت سے مصر میں اس کا لقب ' قوقاسی' (یونانی زبان میں ' اوقوقاسیوس ' اور قبطی زبان میں ' کوخیس') پڑ گیا۔ یہی لفظ عربی زبان میں محرف ہو کر ' مقوقس' بن گیا ۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قوقاسی کے شروع میں میم نسبت کے طور پر لگا دیا گیا ہو ، اس طرح وہ مقوقس بن گیا ہو ۔

مقوقس کے نام اور اس کے حسب و نسب کی بحث کے بعد اب ہم اس کے مذہب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ۔ اس ضمن میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آیا وہ ملکی مذہب کا پیرو تھا یا یعقوبی مذہب کا ماننے والا ؟ اور اگر وہ ملکی یعنی ہرقل کے مذہب پر تھا تو اس نے عربوں سے صلح کر کے ان کی مدد کیوں کی ؟ بٹلر اس بات کو بڑے زور شور سے ثابت کرنا چاہتا ہے کہ مقوقس ملکی مذہب کا پیرو تھا ۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں ، بٹلر کے تمام نظریات کی بنیاد ساویرس اسقف اشمونین کی بیان کردہ روایات پر ہے ۔ ساویرس کی روایات کے مقابلے میں وہ تمام مؤرخین عرب اور خود یورپی مؤرخین کی روایات کو پر کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا ۔ لیکن قارئین یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ بٹلر کو اس شدت سے مداح ساویرس ہونے کے باوجود اپنی کتاب میں یہ اقرار کرنا پڑا ہے کہ ساویرس کی کتاب کا سمجھنا نہایت مشکل ہے کیونکہ اس میں واقعات کو بہت زیادہ خلط ملط کر دیا گیا ہے ۔ جب خود بٹلر ہی ساویرس کی کتاب کو مہمل مانتا ہے تو پھر اس کی صحت پر اقرار کیا معنی ؟

بٹلر لکھتا ہے کہ اوطیخا مؤرخ نے ، جو ملکی فرقے سے تعلق رکھتا تھا ، مقوقس کو اس لیے یعقوبی لکھ دیا کہ وہ ملکیوں کو ان تمام افعال سے بری الذمہ قرار دے سکے جو مقوقس کے عہد حکومت میں ظہور پذیر ہوئے ۔ اگر بٹلر کی یہ دلیل

درست سمجھ لی جائے تو کیا اس کے مقابلے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ساویرس نے ، جو یعقوبی مذہب کا پیرو تھا ، مقوقس کو ملکی فرقے کا پیرو اس لیے لکھ دیا کہ اپنی قوم پر سے اس خیانت کا دھبہ دور کر سکے جس کا ارتکاب اس نے عربوں سے صلح کی صورت میں کیا تھا ۔ ساویرس ھی پر موقوف نہیں ، دیگر متعدد مؤرخین نے بھی ، جن میں بٹلر بھی شامل ھے ، مقوقس کے اس فعل کو غداری قرار دیا ھے ۔

سوال پیدا ھوتا ھے کہ اگر مقوقس حقیقت میں رومی، اور ملکی فرقے کا پیرو تھا تو قبطیوں نے کیوں دل و جان سے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی اور جب اس نے عربوں سے صلح کی تھی تو کیوں انھوں نے بھی صلح کی شرائط تسلیم کر لی تھیں ، حالانکہ یعقوبی فرقے کے لوگ ملکی لوگوں کے ساتھ اشتراک عمل کو ایسی غداری سمجھتے تھے جس کی تلافی کسی طرح ممکن نہ تھی ۔

علاوہ بریں اگر مقوقس ملکی مذھب کا پیرو ھوتا تو اسے کیا ضرورت تھی کہ رومی ھوتے ھوئے شہنشاہ ھرقل کے احکام کی نافرمانی کرتا اور ھرقل کو مطلع کیے بغیر اور اس کی مرضی کے صریح خلاف عربوں سے صلح کر لیتا ۔

انھیں وجوہ کی بنا پر ھم بٹلر اور ان مؤرخین سے ، جن کی رائے میں مقوقس ملکی المذھب تھا ، متفق نہیں ۔ ھماری رائے یہ ھے کہ مقوقس قبطی الژاد اور دل سے یعقوبی مذھب کا پیرو تھا ۔ قیصر نے اس کی تربیت خود کی تھی اور وہ مدت تک قسطنطنیہ میں رھا تھا ۔ چونکہ وہ بہت عقل مند اور بالغ نظر تھا ، اپنے اچھے اخلاق اور نیک صفات کی وجہ سے مشہور تھا

اور قبطی اسے بہت احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اس لیے قیصر نے اسے مصر کا والی مقرر کر دیا تھا۔ مگر دل سے یعقوبی مذہب کا پیرو ہونے کے باوجود اس نے اپنے آپ کو ملکی اس لیے ظاہر کر رکھا تھا کہ کہیں ہرقل اس سے ناراض نہ ہو جائے اور اس کے غیظ و غضب کی آگ اس پر نہ بھڑکنے لگے۔ اگر اس واقع کو صحیح بھی مان لیا جائے کہ جب بطریق بنیامین نے مقوقس کے حاکم ہونے کی خبر سنی تو وہ اسکندریہ سے بھاگ گیا، پھر بھی یہ بات بعید نہیں کہ مقوقس نے خود بنیامین کو بھاگ جانے کا مشورہ دیا ہو تاکہ وہ کسی گرجے میں چھپ کر اپنے آپ کو رومیوں کے ان مظالم سے بچا سکے جو آئندہ دس سال تک انھوں نے مصر کے مقامی باشندوں پر توڑے۔

ظاہر ہے کہ مقوقس بذات خود ایک مجبور محض انسان تھا۔ وہ رومیوں کو ان مظالم سے نہ روک سکتا تھا جو وہ قبطیوں پر ڈھا رہے تھے، اسے ڈر تھا کہ اگر ہرقل کو علم ہوگیا کہ وہ قبطیوں کا حامی اور مددگار ہے اور ان کے لیے ہمدردی کے جذبات اپنے اندر رکھتا ہے تو کہیں وہ اسے غداری کا الزام لگا کر اس کے عہدے سے علحدہ نہ کر دے۔ یہ ڈر اسے اس لیے پیدا ہوا کہ رومیوں نے ملک میں جاسوسی کا ایک وسیع جال پھیلا رکھا تھا اور وہ ہر اس شخص کی ٹوہ میں رہتے تھے جو خلقدونی مذہب کا مخالف ہو اور یعقوبی قبطیوں سے میل جول رکھتا ہو جو اس مذہب کے شدید دشمن تھے۔

یہ امر بھی بعید نہیں کہ قیرس اور مقوقس دو مختلف شخصیتیں ہوں۔ چنانچہ دی غویہ کا خیال بھی یہی ہے۔ قیرس رومی افواج کا امیر اور سخت متعصب ملکی تھا، اسی نے سارے مصر میں جور و ستم کا وہ بازار گرم کر رکھا تھا جس کا ذکر پہلے

آ چکا ہے ۔ مقوقس اگرچہ مصر کا والی تھا لیکن فوجی طاقت ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے اس میں باوجود قبطی نژاد اور یعقوبی مذہب کا پیرو ہونے کے اتنی ہمت ، طاقت اور جرأت نہ تھی کہ وہ ان مظالم کا لامتناہی سلسلہ روک سکتا جو رومی غریب قبطیوں پر ڈھا رہے تھے ۔ جب اس نے دیکھا کہ عرب مصر کے قلب تک پہنچ چکے ہیں اور رومیوں کا زوال اور ان کی مصر سے پسپائی کوئی دن کی بات ہے تو اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور عربوں سے صلح کر لی تاکہ وہ اور اس کی قوم رومیوں کے مظالم سے چھٹکارا پا جائے ۔ قبطیوں نے بھی رومی سلطنت کا جؤا گردن سے آتار پھینکنے کے لیے مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی ۔

تاہم یہ تمام نظریات مفروضہ ہیں اور ہم تاریخی شواہد میں اختلاف کی وجہ سے کوئی قطعی بات نہیں کہہ سکتے ۔

(۲) صلح کی درخواست : عین شمس کی جنگ میں رومیوں پر فتح پانے کے بعد اوائل ستمبر ۶۴۰ء مطابق ۲۰ھ میں مسلمان قلعۂ بابلیون (قصر شمع) کے محاصرے کے لیے روانہ ہوئے ۔ قلعے کی دیواریں خوب مضبوط تھیں اور ان کے آونچے آونچے برجوں کے نیچے دریائے نیل لہریں لے رہا تھا ۔ دریا اس زمانے میں طغیانی پر تھا اور اس کا پانی اس قدر بلند ہو چکا تھا کہ قلعے کے ارد گرد بنائی ہوئی خندق دریا کے پانی سے پر ہو چکی تھی ۔ عربوں کے پاس محاصرے کو توڑنے کے لیے قلعہ شکن ہتھیار نہ تھے اور اگر ہوتے بھی تو ان ہتھیاروں کو استعمال کرنے کا طریقہ انہیں نہ آتا تھا ۔ ان وجوہ کی بنا پر محاصرہ سات ماہ تک لمبا ہو گیا ۔

قلعۂ بابلیون کے محاصرے کے وقت مصر کا حاکم مقوقس قلعے میں موجود تھا ۔ فوج کا سردار ' اعرج ' نامی ایک شخص تھا ۔ بٹلر کے بیان کے مطابق اس وقت قلعے میں پانچ چھ ہزار فوج سے زیادہ نہ تھی لیکن ہمارے خیال میں اس تعداد سے کہیں زیادہ فوج اس قلعے میں موجود تھی کیونکہ قبل ازیں جو رومی فوجیں مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کے بعد شکست کھا کر فرار ہوئی تھیں وہ سب اسی قلعے میں آ کر جمع ہوئی تھیں ۔

آخر عمرو بن العاص نے کہیں سے منجنیق مہیا کیا اور اسے شہر کے بڑے دروازے کے سامنے نصب کرا دیا ۔ رومیوں نے مسلمانوں کو شہر میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے لوہے کے گوکھرو کثیر تعداد میں شہر کے دروازوں کے باہر بچھا رکھے تھے ۔ مسلمانوں کو محاصرہ کیے ہوئے ایک لمبا عرصہ ہو گیا لیکن انھوں نے پیچھے ہٹنے اور واپس جانے کا نام تک نہ لیا ۔ جب مقوقس کو یقین ہو گیا کہ مسلمان کسی طرح بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں اور ایک نہ ایک دن وہ ضرور قلعے پر بھرپور حملہ کر کے اس پر قابض ہو جائیں گے تو وہ قلعے کے پچھلے دروازے سے نکل کر دریائے نیل کے ایک جزیرے میں چلا گیا اور وہاں سے عمرو بن العاص کو یہ پیغام بھیجا :

" تم لوگ ہمارے ملک میں گھس آئے ہو اور ہم سے جنگ کرنا چاہتے ہو ۔ تمھاری جو حیثیت ہے اس سے تم خود بھی اچھی طرح واقف ہو ۔ تمھارے مقابلے کے لیے جو رومی لشکر تیار ہو رہا ہے وہ ہر طرح کے ساز و سامان اور جنگی اسلحہ سے لیس ہے ۔ دریائے نیل نے تمھیں گھیر رکھا ہے ، اب تم ہمارے قیدی ہو ، تمھارے لیے اب یہ بہتر ہے کہ تم اپنا ایک آدمی گفت و شنید کے لیے ہمارے پاس بھیجو تاکہ ہم تمھارے مقاصد اور ارادوں

سے مطلع ہوسکیں ۔ ممکن ہے کہ ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی ایسی بات طے پا جائے جو ہمارے لیے بھی مفید ہو اور تمہارے لیے بھی ، اور قبل اس کے کہ رومیوں کا عظیم الشان لشکر تمہیں گھیرے میں لے کر بری طرح پیس ڈالے ، ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی مصالحت ہو جائے ۔ یاد رکھو اگر رومی فوجیں تمہارے مقابلے میں آ گئیں تو تمہارا جان بچا کر واپس جانا بے حد مشکل ہوگا اور اس وقت بات چیت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا ۔ اس لیے تم اپنے آدمیوں میں سے کسی کو ہمارے پاس روانہ کرو تاکہ ہم کسی ایسے سمجھوتے پر پہنچ سکیں جو ہمارے لیے قابل قبول ہو اور تمہارے لیے عافیت کا موجب ہو ۔"

جب مقوقس کے ایلچی عمرو بن العاص کے پاس پہنچے تو آپ نے انھیں دو روز تک اپنے کیمپ میں روکے رکھا ۔ مقوقس بے حد فکر مند ہؤا اور اس نے ساتھیوں سے پوچھا ، کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ لوگ سفیروں کو قتل کر دیتے ہوں اور ان کے مذہب میں یہ بات جائز ہو ۔ لیکن اسے حقیقت حال کا علم نہ تھا ، در اصل عمرو بن العاص نے سفیروں کو اس لیے روک رکھا تھا کہ وہ لشکر میں رہ کر مسلمانوں کی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر لیں ۔ دو روز کے بعد آپ نے ان کے ہاتھ مقوقس کو کہلا بھیجا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان صرف ان تین شرائط پر سمجھوتا ہو سکتا ہے :

(۱) یا تو تم اسلام لے آؤ ۔ اس طرح تم ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور ہمارے تمہارے درمیان کوئی فرق نہ رہے گا ۔ جو حقوق ہمیں حاصل ہیں وہی تمہیں بھی حاصل ہوں گے اور جو فرائض ہم پر عائد ہیں وہی تم پر بھی عائد ہوں گے ۔

(۲) اگر تم اسلام نہیں لا سکتے تو جزیہ ادا کرنے کا اقرار

کرو ۔ اس صورت میں تمھیں ذمیوں کے حقوق حاصل ہوں گے اور ہم ہر طرح تمھاری حفاظت ، اعانت اور امداد کریں گے ۔

(٣) اگر ان دونوں باتوں میں سے تمھیں کوئی صورت منظور نہ ہوتو پھر آخری چارۂکار جنگ ہے ۔ ہم نہایت صبر و استقلال سے لڑیں گے ، یہاں تک کہ ہمارے اور تمھارے درمیان اللہ فیصلہ کر دے ۔

عمرو بن العاص کا یہ جواب لے کر مقوقس کے ایلچی اس کے پاس واپس پہنچے اور اس نے ان سے مسلمانوں کا حال دریافت کیا تو انھوں نے کہا :

" ہم نے ایک ایسی قوم دیکھی ہے جو موت کو زندگی سے زیادہ پسند کرتی ہے ۔ انکسار اور فروتنی انھیں شان و شوکت سے زیادہ عزیز ہے ۔ ان میں سے کسی شخص کو بھی دنیا اور اس کے ساز و سامان سے رغبت اور لگاؤ نہیں ۔ وہ زمین پر بیٹھتے اور اپنی سواریوں کی پیٹھوں پر کھانا کھاتے ہیں ۔ ان کا امیر ان سے کسی قسم کا امتیاز نہیں رکھتا ۔ وہ انھیں میں سے ایک فرد دکھائی دیتا ہے ۔ ان کے غریب و امیر اور آقا و غلام میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا ۔ جب نماز کا وقت آتا ہے تو کوئی بھی شخص پیچھے نہیں رہتا ۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں پانی سے دھوتے ہیں اور نمازیں انتہائی سوز و گداز سے ادا کرتے ہیں ۔ "

یہ سن کر مقوقس کے دل پر خوف طاری ہو گیا ۔ اس نے دل میں کہا کہ جس قوم کی حالت یہ ہو وہ ضرور فتح یاب ہوگی اور ہم اس کے مقابلے میں کامیاب نہ ہوسکیں گے ۔ یہ سوچ کر اس نے اپنی قوم سے کہا کہ مسلمانوں کی فتح میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ، اس لیے قبل اس کے کہ موقع ہاتھ سے

جاتا رہے ، ہمیں ان سے صلح کی طرح ڈالنی چاہیے ۔ ساری قوم نے مقوقس کے مشورے پر صاد کر دیا ۔ چنانچہ اس نے عمرو بن العاص سے کہلا بھیجا کہ وہ اپنے کسی آدمی کو ہمارے پاس روانہ کریں تاکہ ہمارے درمیان کوئی ایسی بات طے پا جائے جس میں فریقین کا فائدہ ہو ۔

عمروبن العاص نے عبادہ بن صامت کی سرکردگی میں دس آدمی مقوقس کے پاس بھجوائے ۔ عبادہ کو آپ نے ہدایت کی کہ وہ خود مقوقس سے بات کریں اور ان تین شرطوں کے سوا جو اس کے قاصدوں کے ذریعے سے اسے بھجوا دی گئی ہیں اور کوئی شرط قبول نہ کریں ۔

جب عبادہ بن صامت مقوقس کے دربار میں پہنچے تو وہ ان کے سیاہ رنگ اور غیر معمولی طول قد دیکھ کر بہت گھبرایا ۔ اسے خیال گزرا کہ عمرو بن العاص نے اس کی تحقیر و تذلیل کے خیال سے عبادہ جیسے حبشی کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا ہے ۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ کسی اور شخص کو آگے کریں جس سے وہ باتیں کر سکے لیکن مسلمانوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا "یہی سیاہ شخص ہم میں علم و فضل اور پختگیٔ خیال کے لحاظ سے افضل ہے ، یہی ہمارا سردار ہے اور درجے اور رتبے کے لحاظ سے بھی یہی ہم سب پر برتری رکھتا ہے ۔ ہمارے امیر نے اسی کو ہماری طرف سے بولنے کا اختیار دیا ہے اور ہم اس کی رائے اور اس کی باتیں قبول کرتے ہیں ۔"

اس پر مقوقس کو مجبوراً عبادہ سے بات چیت کرنی پڑی ۔ بات چیت کی ابتداء عبادہ کی جانب سے ہوئی ۔ آپ نے فرمایا :

" دشمنان دین سے ہماری جنگ دنیوی جاہ و جلال اور

مال و منال حاصل کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ ہماری تمام تر کوشش و ہمت کا محور صرف جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاء کلمۃالحق ہے ۔ اللہ نے ہم پر جہاد کو فرض کیا ہے اور اس میں جو غنیمتیں حاصل ہوں انہیں ہمارے لئے جائز رکھا ہے ۔ ہمارے پاس خواہ سیم و زر اور لعل و گوہر کے ڈھیر ہوں یا ایک درہم بھی نہ ہو ، ہمیں مطلق پروا نہیں ہوتی کیونکہ روٹی کا ایک ٹکڑا جو بھوک دور کر سکے اور کپڑے کا ایک ٹکڑا جو ہماری ستر پوشی کر سکے ہمارے لیے بہت کافی ہے ۔ ہمارے پاس اگر ڈھیروں بھی سونا ہو تو بھی ہم اسے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اس کے راستے میں خرچ کر دیتے ہیں ۔ دنیوی آسائش و آرام کا ہمیں کوئی لالچ نہیں ۔ ہمارے پیش نظر آخرت کی آسودگی و راحت ہے ۔ ہمارے اللہ اور ہمارے رسول نے ہمیں اسی بات کی تعلیم دی ہے اور اسی کا ہم سے عہد لیا ہے ۔ ہماری تمام تر کوششیں اللہ کی رضا کے حصول اور جہاد و اعلاء کلمۃالحق کے لیے وقف ہیں ۔"

اگرچہ عبادہ کی باتوں سے مقوقس بہت متاثر ہوا پھر بھی اس نے نصیحت آمیز پیرائے میں انہیں دھمکیاں دینی شروع کیں اور کہا :

" اے شخص! بے شک جو تم کہتے ہو ٹھیک ہو گا لیکن اب تمہارے مقابلے کے لیے رومیوں کا لشکر جرار آ رہا ہے جس کی تعداد کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ لشکر بہادری ، شجاعت اور دلیری میں مشہور ہے اور وہ اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ وہ کس سے لڑتا ہے اور کون اس کا مد مقابل ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ تم کمزوری اور قلت تعداد کی وجہ سے ہرگز اس سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ تم ایک مہینے سے یہاں پڑے مصیبتیں جھیل

رہے ہو اور تکالیف برداشت کر رہے ہو - تمھاری حالت پر ترس کھا کر ہم یہ پیش کش کرتے ہیں کہ اگر تم یہاں سے اپنے وطن واپس چلے جاؤ تو ہم تمھارے ہر سپاہی کو دو دو دینار، تمھارے امیر کو ایک سو دینار اور تمھارے خلیفہ کو ایک ہزار دینار دے دیں گے - لیکن یہ پیش کش اس وقت تک کے لیے ہے جب تک وہ لشکر نہ آ جائے جس سے مقابلہ کرنے کی تم میں طاقت نہیں - اس لشکر کے پہنچ جانے کے بعد تمھارے لیے کوئی جائے فرار باقی نہ رہے گی -"

عبادہ نے فرمایا :

" تم اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو اس دھوکے میں نہ ڈالو کہ تم جو ہمیں رومیوں کی قوت و طاقت اور کثرت سے ڈرا رہے ہو تو ہم اس ڈراوے میں آ کر جی چھوڑ بیٹھیں گے - ان دھمکیوں سے ہمارے عزائم میں مطلق فرق نہ آئے گا - اگر ہم سب کے سب راہ خدا میں قتل بھی ہو گئے تو کوئی پروا نہیں کیونکہ اس طرح ہمیں اللہ کی رضا اور اس کی جنت حاصل ہو جائے گی اور ہم سے بڑھ کر اور کوئی خوش نصیب نہ ہو گا - اللہ عزوجل اپنی کتاب میں فرماتا ہے، کم من فئة قليلة غلبت فئة كثيرة باذن الله والله مع الصابرين (کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو اپنے سے کہیں بڑے گروہوں پر اللہ کے حکم سے غالب آ جاتے ہیں - یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)- ہم میں سے ہر شخص صبح و شام اپنے رب سے دعا مانگتا ہے کہ وہ اسے شہادت کی سعادت سے بہرہ ور فرمائے - کوئی بھی شخص ایسا نہ ہو گا جو لوٹ کر اپنے گھر اور اہل و عیال کے پاس جانے کا خواہش مند ہو - تم ان باتوں پر اچھی طرح غور و خوض کر لو اور فضول باتیں چھوڑ کر اپنے فائدے کے لیے ان تین شرائط میں سے، جو ہمارے

امیر نے تمھیں لکھ بھیجی ھیں ، کوئی شرط قبول کر لو ۔"

اس پر مقوقس نے اصرار کیا کہ ان تین شرطوں کے سوا وہ کوئی اور شرط پیش کریں لیکن عبادہ نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ۔ آپ نے ھاتھ اٹھائے اور فرمایا :

" اس آسمان اور زمین کے رب اور ھر چیز کے پروردگار کی قسم ! ان تین شرائط کے سوا اور کوئی شرط نہیں ھو سکتی ۔ تمھیں انھیں میں سے کسی ایک کو قبول کرنا ھوگا ۔"

یہ سن کر مقوقس نے ساتھیوں سے کہا :

" تم بتاؤ اب کیا کرنا چاھیے ؟ اگر میری رائے مانو تو اسلام یا جزیہ دونوں میں سے کوئی بات منظور کر لو کیونکہ تم ان سے مقابلے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ اگر آج تم مسلمانوں کی پیش کردہ شرائط قبول نہ کرو گے تو یاد رکھو کل کو مجبوراً ان سے بھی بدتر شرائط قبول کرنی پڑیں گی ۔" (ابن عبدالحکم اور مقریزی)

اس بات چیت کے بعد عبادہ اپنے کیمپ میں چلے آئے اور مقوقس قلعے میں چلا گیا ۔ وھاں اس نے لوگوں کو اکٹھا کر کے پھر صحیح صورت حال ان کے سامنے رکھی اور انھیں مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے کا مشورہ دیا ۔ لیکن لوگوں نے اس کی بات نہ مانی اور مسلمانوں سے جنگ کرنے ھی پر اصرار کیا ۔

یہاں پہنچ کر مؤرخین میں اختلاف پیدا ھو جاتا ھے ۔ اس اختلاف کے باعث ھم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ مقوقس کے عمرو بن العاص سے صلح کرنے اور اس صلح کی اطلاع ھرقل کو دینے سے پہلے مسلمانوں اور رومیوں کے درمیان کیا واقعات پیش آئے ۔ اختلاف کی تفصیل حسب ذیل ھے :

(۱) ابن عبدالحکم اور مقریزی لکھتے ھیں :

” مقوقس کے ساتھیوں نے مسلمانوں کی پیش کردہ شرائط قبول کرنے سے انکار کردیا اور مسلمانوں کے لیے جنگ کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا ۔ چنانچہ جنگ شروع ہوئی جس میں بے شمار اہل قلعہ مارے گئے ۔ یہ دیکھ کر محصورین نے مجبوراً اداء جزیہ کا اقرار کیا اور جنگ بند ہو گئی* ۔“

(۲) سیوطی لکھتے ہیں :

” عبادہ بن صامت کی واپسی کے بعد مقوقس نے ساتھیوں سے کہا ”مناسب یہ ہے کہ ہم عبادہ کی بات مان لیں اور اداء جزیہ کا اقرار کرلیں ۔ اس طرح ہم سلامت رہیں گے ورنہ عرب سارے شہر کو تباہ کرکے رکھ دیں گے ۔“ اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور وہ جزیہ ادا کرنے پر رضامند ہو گئے ۔ مقوقس

* مؤرخین عرب کا بیان ہے کہ جب مقوقس نے اپنی اور قبطیوں کی طرف سے عمرو بن العاص کی پیش کردہ شرائط کی توثیق کر دی تو محاصرہ ختم ہو گیا اور مسلمان قلعے پر قابض ہوگئے ۔ لیکن مسٹر بٹلر لکھتے ہیں کہ جب ہرقل کو مقوقس کی اس کارروائی کا پتا چلا تو اس نے اسے قسطنطنیہ طلب کیا اور وہاں اسے سخت سست کہنے کے بعد کسی جزیرے میں جلا وطن کر دیا ۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں کیونکہ مقوقس صلح کرنے کے بعد مسلمانوں کی پناہ میں آ چکا تھا اور ہرقل کا ظالم ہاتھ اب اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا ۔ شرائط صلح کے مطابق مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اسے ہر قسم کی تکالیف سے بچاتے ۔ مقوقس نے بھی اس وقت تک رومیوں سے علحدگی اور مسلمانوں سے صلح نہ کی ہو گی جب تک اسے اس بات کا پکا یقین نہ ہو گیا ہوگا کہ صلح ہوجانے کے بعد مسلمان ہر قیمت پر اس کی مدد کریں گے ۔

نے عمرو بن العاص کو لکھا کہ ایک ملاقات کا انتظام کیا جائے جس میں فریقین کے سربرآوردہ اشخاص شریک ہوں - چنانچہ یہ ملاقات ہوئی - مقوقس نے صلح پر آمادگی ظاہر کی لیکن یہ شرط پیش کی کہ اس صلح کے لیے ہرقل کی اجازت لینی ضروری ہو گی - اگر ہرقل نے توثیق کر دی تو معاہدہ نافذالعمل ہو گا ورنہ نہیں - عمرو بن العاص اس پر رضامند ہو گئے - مقوقس نے ہرقل کو صلح کی شرائط لکھیں جنھیں اس نے قبول نہ کیا - تاہم مقوقس انھیں شرائط پر کاربند رہا اور عہد نامہ فسخ نہ کیا -"

(۳) ابوالمحاسن لکھتے ہیں کہ پہلے تو مقوقس نے اپنی اور تمام قبطیوں کی طرف سے عہدنامہ تحریر کر دیا لیکن جب وہ قلعے میں پہنچا تو اس کے ساتھیوں نے اس صلح کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دوبارہ مسلمانوں کے مقابلے پر ڈٹ گئے - اس پر مسلمانوں نے قلعے پر زور شور سے حملہ کر دیا اور اسے فتح کر کے اور اہل قلعہ کو اداء جزیہ پر مجبور کر کے دم لیا -

(۴) یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں کہ مقوقس اور عبادہ کی ملاقات قلعے پر عربوں کے تسلط حاصل کرنے کے بعد ہوئی تھی -

روایات میں اس تناقض اور اختلاف کے باوجود چار امور بصراحت ثابت ہوتے ہیں :

(۱) دونوں سرداروں کی ملاقات اکتوبر کے مہینے میں دریائے نیل کی طغیانی کے وقت ہوئی تھی -

(۲) قبطیوں نے ابتداء میں صلح کرنے سے انکار کر دیا تھا جس کے باعث لڑائی کا سلسلہ بدستور جاری رہا -

(۳) جب لڑائی شروع ہو جانے کے بعد رومیوں کو اس میں اپنی ہلاکت نظر آئی تو وہ مجبوراً صلح کی طرف مائل ہوئے۔

(۴) معاہدۂ صلح کا نفاذ اس شرط سے مشروط تھا کہ ہرقل کی توثیق کے بعد اسے نافذالعمل سمجھا جائے۔

عبدالحکم، مقریزی اور ابوالمحاسن نے لکھا ہے کہ قلعۂ بابلیون کی فتح رومیوں کے شرائط صلح تسلیم کرنے سے انکار کے معاً بعد وقوع میں آئی، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اس وقت تک محاصرے کو صرف ایک مہینہ گزرا تھا اور تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ قلعے کا محاصرہ سات مہینے تک جاری رہا۔

(۳) معاہدۂ صلح: ذیل میں وہ معاہدہ درج کیا جاتا ہے جو عمرو بن العاص اور مقوقس کے درمیان طے پایا تھا اور جسے مقریزی نے اپنی کتاب (جلد اول، صفحہ ۲۹۲) میں یوں بیان کیا ہے:

"عمرو بن العاص اور مقوقس باہم اس بات پر صلح کرتے ہیں کہ مسلمان زیرین اور بالائی مصر کے ہر قبطی سے جو بالغ ہو، خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، دو دو دینار سالانہ جزیہ لینے کے حق دار ہوں گے۔ لب گور تک پہنچے ہوئے بوڑھے، بچے جو ابھی بلوغت کی عمر تک نہیں پہنچے، اور عورتیں اداء جزیہ سے مستثنیٰ ہوں گی۔ قبطیوں کے لیے یہ بھی ضروری ہوگا کہ اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت سفر کرتی ہوئی ان کے علاقے میں قیام پذیر ہو تو اس کے لیے رسد مہیا کریں۔ اکا دکا مسافر کی صورت میں تین دن تک اس کی ضیافت کریں۔ اہل مصر کی اراضی، اموال اور ان کے مذہبی امور میں مسلمانوں کی طرف سے کوئی تعرض نہ کیا

جائے گا ۔ ان کی اراضی اور اموال انہیں کے ہاتھ میں رہیں گے ۔
مردم شماری کرنے پر معلوم ہؤا کہ ساٹھ لاکھ قبطی ایسے ہیں جن پر جزیہ فرض ہے ، اس حساب سے ایک کروڑ بیس لاکھ دینار سالانہ جزیہ شمار ہؤا* ۔"

جہاں تک مقریزی کے اس قول کا تعلق ہے کہ ساٹھ لاکھ قبطیوں پر جزیہ شمار کیا گیا ، بہت دور از قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر عاقل و بالغ قبطیوں کی یہ تعداد کل قبطی باشندوں کا چوتھائی بھی فرض کر لی جائے ، تو کل تعداد دو کروڑ چالیس لاکھ بنتی ہے جو اس زمانے کے لحاظ سے محال ہے ۔

اگر مقریزی کا بیان صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک کروڑ بیس لاکھ دینار کی رقم خراج اور جزیہ دونوں کو ملا کر بنتی تھی نہ کہ صرف جزیے کی ۔ اس بات کی تائید علامہ بلاذری بھی کرتے ہیں ۔ وہ اپنی کتاب فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ عمرو بن العاص نے مصر کے خراج اور جزیے کے طور پر کل رقم دو کروڑ دینار وصول کی ۔ حضرت عثمان کی خلافت کے دوران میں جب عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مصر کے والی ہوئے تو یہ رقم چار کروڑ تک جا پہنچی ۔ حضرت عثمان نے عمرو بن العاص سے فرمایا " دیکھو تمھارے بعد مصر کی اونٹنی

---

* ابوالمحاسن نے لکھا ہے کہ پورے مصر میں صرف چھ ہزار قبطی ایسے پائے گئے جن پر اداء جزیہ فرض تھا ۔ اس لحاظ سے جزیے کی کل رقم بارہ ہزار دینار سالانہ شمار ہوئی (تاریخ ابوالمحاسن جلد اول ، صفحہ ۱۹)۔ لیکن یہ قول صریحاً خلاف واقعہ ہے کیونکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں مصر کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ قبطی باشندوں پر مشتمل تھا ۔

نے کتنا دودھ دیا ؟" عمرو بن العاص نے جواب دیا " یہ درست ہے لیکن بچہ بھوکا رہا ۔"

(٤) ھرقل کی جانب سے جنگ کا اجراء : عمروبن العاص اور مقوقس کے درمیان معاہدہ طے پا جانے کے بعد مقوقس نے رومیوں سے کہا کہ یا تو وہ بھی اس معاہدے کو تسلیم کر کے مصر میں سکونت اختیار کر لیں یا مصر سے نکل کر رومی مملکت میں چلے جائیں ۔ ساتھ ھی اس نے ھرقل کو بھی صلح کا سارا حال لکھ بھیجا ۔ ھرقل مقوقس کا خط پڑھ کر بہت طیش میں آیا اور اس نے اسے شدید ناراضی کا خط لکھا ۔ من جملہ اور باتوں کے خط میں یہ بھی لکھا کہ حیف ہے تم پر کہ مٹھی بھر مسلمانوں سے خوف کھا کر تم نے ان کی غلامی قبول کر لی ۔ اسی قسم کے خطوط اس نے مصر میں رومی فوج کے سرداروں کے نام بھی لکھے ۔ رومی سرداروں نے ھرقل کے خطوط پڑھ کر معاہدۂ صلح کو پس پشت ڈالتے ہوئے مسلمانوں سے دوبارہ جنگ چھیڑ دی ۔ مقوقس نے ھرقل کے احکام کی پروا نہ کی ۔ وہ عمرو بن العاص کے پاس آیا اور آپ کو بتایا کہ گو رومی سرداروں نے عہد شکنی کی ہے لیکن وہ بد ستور اپنے عہد پر قائم ہے ، تمام قبطی بھی اسی کے ساتھ ھیں اور وہ عہد شکنی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے ۔

عمرو بن العاص نے اس کی یقین دھانی قبول کر لی اور فرمایا "قبطیوں کو چاھیے کہ وہ فسطاط اور اسکندریہ کے درمیان ھمارے لیے دو پل بنائیں ، جہاں اسلامی فوج اترے وھاں بازار لگائیں اور سامان خوراک بہم پہنچائیں ۔" قبطی اس پر بخوشی رضامند ہوگئے ۔ (ابن عبدالحکم صفحہ ٦٣)

یورپی مؤرخین نے مقوقس کے اس فعل کو غداری اور خیانت قرار دیا ہے لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقوقس کے لیے ایسا کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا ۔ ایک طرف تو رومی لشکر اس قدر کمزوری کی حالت کو پہنچ چکا تھا کہ وہ عربوں کے نہایت قلیل لشکر پر بھی قابو نہ پا سکا اور اُسے ہر میدان میں شکست ہی ہوئی ، دوسری طرف مصری ، رومیوں کے ظلم و ستم سے سخت تنگ آئے ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد وہ اپنی گردنیں رومیوں کے جوئے سے آزاد کرائیں ۔ اس کے لیے وہ موقع کے منتظر تھے ۔ چنانچہ جب اُنھوں نے سنا کہ مسلمان مفتوحہ ممالک کے باشندوں سے حسن سلوک کرتے ہیں اور ان کی حریت فکر اور دینی آزادی میں مطلق دست اندازی نہیں کرتے تو اُنھوں نے رومیوں کی حکومت کے تحت زندگی بسر کرنے کے بجائے مسلمانوں کے زیر سایہ رہنا زیادہ پسند کیا ۔

عمرو بن العاص اور مقوقس کے درمیان جو معاہدہ ہؤا تھا اُس پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقوقس نے اس معاہدے میں سارے مصر کے قبطیوں کو شامل کر لیا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعد میں بھی عمرو بن العاص کو خونریز جنگیں لڑنی پڑیں ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا کیا سبب تھا ؟ کیا قبطیوں ۔ عہد شکنی کی تھی یا رومیوں کی حامی فوجوں نے جو کسی صورت میں بھی مصر پر مسلمانوں کا تسلط برداشت نہ کر سکتی تھیں ؟ ہمارے نزدیک موخرالذکر وجہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے ۔ یہ درست ہے کہ بعض قبطیوں نے ان جنگوں میں شرکت کی لیکن اس میں ان کی اپنی مرضی کو کوئی دخل نہ تھا ، وہ محض مجبوراً ان جنگوں میں مسلمانوں

کے خلاف شریک ہوئے۔

(۵) قلعے پر حملہ : دریائے نیل قلعۂ بابلیون پر حملہ کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا - عمرو بن العاص کے پاس ایسا سامان نہ تھا جس کی مدد سے آپ طغیانی کے موسم میں قلعے پر حملہ کر سکتے۔ اب آپ کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ طغیانی کا موسم گزرنے اور دریا کا پانی اترنے کا انتظار کریں - ادھر شہر کے اندر محصورین کی حالت بے حد پتلی تھی، وہ محاصرے کی سختیوں سے سخت تنگ آئے ہوئے تھے - شہر سے نکلنے اور جان بچانے کا کوئی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا، تاہم وہ بڑی بہادری سے مسلمانوں کے مقابلے پر ڈٹے رہے اور شہر کا دروازہ کھولنے کا نام نہ لیا۔

مارچ ۶۴۱ء (۲۰ھ) میں ایک روز انھوں نے مسلمانوں کے کیمپ سے خوشی کے نعروں کی آوازیں سنیں - معلوم ہؤا کہ ان کے شہنشاہ، ہرقل روم کا انتقال ہوگیا * - یہ سن کر ان پر گویا بجلی گر پڑی - اس حادثے نے ان کی شجاعت اور حوصلوں کو یکسر پست کر دیا۔

* سیوطی (جلد اول، صفحہ ۵۲) اور ابن عبدالحکم (صفحہ ۹۶) نے لکھا ہے کہ ہرقل کی وفات ۱۶ھ میں ہوئی لیکن انھیں دونوں نے لیث بن سعد کے حوالے سے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ اس کا سنہ وفات ۲۰ھ ہے اور اس کے مرنے سے اللہ نے رومیوں کی شوکت و سطوت کو پارہ پارہ کر دیا - اس روایت کا آخری حصہ درست نہیں کیونکہ ہرقل کی وفات ۱۱ فروری ۶۴۱ء (۲۰ھ) کو ہوئی تھی اور اس وقت تک عربوں نے اسکندریہ کا محاصرہ شروع بھی نہ کیا تھا۔

اب عربوں نے قلعے پر پرزور حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔ حملے میں پہل کرنے کی سعادت زبیر بن عوام کے حصے میں آئی ۔ جب انھوں نے دیکھا کہ قلعہ فتح ہونے میں دیر ہوتی چلی جا رہی ہے تو ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور انھوں نے (ابن عبدالحکم کی روایت کے بموجب) فرمایا :

" میں اپنی جان اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ اللہ اس کے بدلے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائے گا ۔"

ساتھ ہی آپ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جب وہ قلعے کی دیوار پر سے تکبیر کہیں تو تمام لوگ پورے جوش و خروش سے تکبیر کا جواب دیں ۔ یہ کہ کر آپ نے ' سوق حمام * ' کی جانب سے فصیل پر سیڑھی لگائی اور تلوار ہاتھ میں لے کر چشم زدن میں

---

* ابن عبدالحکم، مقریزی، ابوالمحاسن، سیوطی، یاقوت وغیرہ اکثر مؤرخین نے لکھا ہے کہ زبیر نے قلعے پر اس جگہ سے حملہ کیا تھا جو بعد میں ' سوق حمام ' کے نام سے موسوم ہوئی ۔ لیکن اس جگہ کی تعیین جہاں زبیر نے سیڑھی جائی تھی آسان نہیں ۔ بٹلر، اوتیخوس کے حوالے سے لکھتا ہے کہ 'سوق حمام' قلعے کی جنوبی جانب تھا ۔ بلاذری نے یہی لکھا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اضافہ کیا ہے کہ زبیر شمال سے اپنی مقابل کی سمت یعنی جنوبی طرف آئے تھے ۔ بٹلر کی یہ رائے ہے کہ زبیر کا حملہ قلعے کی جنوب مشرقی جانب سے ہؤا تھا جہاں ابھی تک دیوار قائم ہے ۔ یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ یہ سیڑھی 'سوق وردان ' میں ایک مکان کے اندر محفوظ تھی لیکن ۳۹۰ھ (۱۰۰۰ء) میں مکان کو آگ لگ جانے کے بعد یہ سیڑھی بھی جل کر خاکستر ہو گئی ۔ ابن عبدالحکم لکھتے ہیں کہ شتراحیل بن جحیہ مرادی نے اس سیڑھی کی جگہ ' زمامرہ ' کی جانب ایک اور سیڑھی نصب کرا دی تھی ۔

دیوار پر چڑھ گئے - آپ کے پیچھے اور لوگوں نے بھی چڑھنا شروع کر دیا لیکن آپ نے سیڑھی ٹوٹ جانے کے خوف سے مزید آدمیوں کو چڑھنے سے منع کر دیا - فصیل پر چڑھ کر آپ نے بلند آواز سے تکبیر کہی جس کا جواب باھر سے مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش اور پوری طاقت سے دیا - اتنے قریب سے تکبیروں کی آوازیں سن کر اھل قلعہ نے سمجھا کہ عربوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا ھے ، وہ بدحواس ھو کر بھاگے اور ادھر ادھر چھپنے لگے - زبیر نے فصیل شہر پر سے نیچے اتر کر اپنے ساتھیوں کے ھمراہ قلعے کے دروازے کا رخ کیا اور وھاں پہنچ کر اسے کھول دیا - مسلمان فوج باھر منتظر کھڑی ھی تھی ، دروازہ کھلتے ھی اندر گھس آئی - رومی سپہ سالار کو جب موت سامنے نظر آنے لگی تو اس نے عمرو بن العاص سے صلح کی درخواست کی جو آپ نے قبول کر لی اور اس طرح سات مہینے کے طویل محاصرے کے بعد قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ھو گیا -

بٹلر کے بیان کے مطابق قلعۂ بابلیون کے محاصرے کا خاتمہ اور اس پر مسلمانوں کا تسلط اپریل ۶۴۱ء (۲۰ھ) میں ھؤا - مؤرخین عرب ذکر کرتے ھیں کہ سات مہینے کے محاصرے کے بعد اس موقع پر جس شخص سے معاھدۂ صلح کیا گیا وہ مقوقس تھا - لیکن یہ درست نہیں - مقوقس قلعۂ بابلیون کے محاصرے کے ایک مہینے بعد ھی مسلمانوں سے صلح کر کے شہر سے باھر آ چکا تھا - اغلب گمان یہ ھے کہ صلح نامہ رومی فوج کے سپہ سالار سے کیا گیا - بٹلر کا یہی خیال ھے -

بٹلر کہتا ھے کہ مسلمانوں نے قلعے پر تسلط بٹھا لینے کے بعد بارہ ھزار تین سو رومیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا - لیکن یہ روایت قطعاً بے بنیاد ھے اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں - تاریخ

سے یہ بات کامل طور پر عیاں ہے کہ عمرو بن العاص نے مفتوح قوموں سے جو بھی معاہدے کیے انھیں پوری طرح لباس عمل پہنایا - پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس موقع پر آپ اپنے عہد و پیمان کو بالائے طاق رکھ کر باشندوں کا خون بہاتے اور انھیں بے دریغ نذر تیغ کر دیتے -

ج : اسکندریہ

(۱) کوم شریک ، سلطیس اور کریون : عربوں کے حملوں کے وقت اسکندریہ مصر کا دارالحکومت اور قسطنطنیہ کے بعد مشرق رومی سلطنت کا سب سے بڑا سیاسی فوجی مرکز تھا - شہنشاہ روم کو یقین تھا کہ اس شہر پر عربوں کے قبضے کا مطلب مصر سے رومی اثر و نفوذ اور میری حکومت کا مکمل خاتمہ ہوگا - چنانچہ اس نے اس شہر کی حفاظت کے لیے جرار رومی لشکر روانہ کیے - رومیوں نے قلعے کی حفاظت کا ہر ممکن سامان کیا اور شہر کے دروازے بند کر کے مسلمانوں کی آمد کا انتظار کرنے لگے -

قلعۂ بابلیون پر قبضہ کرنے کے بعد عمرو بن العاص اپنے لشکر کے ہمراہ اسکندریہ کی جانب روانہ ہوئے - قبطی رؤساء اور سردار آپ کے ساتھ تھے - قبطیوں نے وعدے کے مطابق راستے درست کیے ، پل بنائے اور اسلامی فوج کے لیے جابجا بازار لگائے - غرض رومیوں سے لڑنے کے لیے انھوں نے مسلمانوں کی ہر ممکن مدد کی - 'طرنوط *' تک کسی لشکر سے مسلمانوں کی مٹ بھیڑ

* مرحوم علی مبارک پاشا اپنی کتاب 'الخطط التوفیقیہ' میں اس شہر کے متعلق لکھتے ہیں : " شہر 'طرانہ' کا ذکر قبطی

باقی صفحہ ۱۵۰ پر

نہ ہوئی - طرنوط پر رومیوں کا ایک چھوٹا سا لشکر مقابلے میں آیا لیکن مختصر سی جنگ کے بعد پسپا ہو گیا - بٹلر کہتا ہے :

" طرنوط کے بعد ' نقیوس * ' کے مقام پر رومیوں کو عربوں کے ہاتھوں انتہائی حسرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا - یوحنا اسقف نقیوس نے رومیوں کے اس حسرت ناک انجام کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ جب نقیوس میں مقیم رومی سپہ سالار کو مسلمانوں کے قریب آنے کی خبر ملی تو اُس کے خوف کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ ، اسی حالت خوف میں ، فوج کو چھوڑ کر اسکندریہ بھاگ گیا - جب اسلامی فوج قریب پہنچی اور رومی فوج نے اپنے آپ میں اس کے مقابلے کی طاقت نہ دیکھی تو اُس نے ہتھیار تو میدان میں چھوڑے اور خود دریا میں چھلانگیں لگا دیں - افراتفری کا یہ عالم تھا کہ بہت کم لوگ کشتیوں تک پہنچ سکے - ملاحوں نے جب اسلامی فوج کو قریب آتے اور خطرے کو سر پرمنڈلاتے دیکھا تو اُنھیں اپنی جانیں بچانے کی پڑ گئی اور وہ رومی فوج کو کشتیوں میں سوار کیے بغیر جلد جلد کشتیاں کھیتے ہوئے دوسرے

بقیہ حاشیہ ۱۴۹ :

کتابوں میں کثرت سے آتا ہے - کتب قدیم میں اسے طرنوطیس کے نام سے ذکر کیا گیا ہے - ابن حوقل ، ادریسی اور اسکندریہ کے بطریق مؤرخ اسے طرنوط کے نام سے یاد کرتے ہیں - یہ دریائے رشید کے مغربی کنارے پر قاہرہ سے چالیس میل دور ، اسکندریہ سے پانچ دن کی مسافت پر واقع ہے -

* بٹلر لکھتا ہے کہ نقیوس کا شہر منوف کے مغرب میں واقع تھا - بعد میں اس کے کھنڈروں پر شبشیر کا قصبہ آباد ہوا - (صفحہ ۲۸۲ و ۲۸۳)

کنارے پر لے گئے ۔ اسی اثناء میں مسلمان رومیوں پر ٹوٹ پڑے اور خشکی و تری دونوں جگہ زبردست تلوار چلی ۔ اس طرح مسلمان شہر میں بلا مقابلہ داخل ہو گئے ۔ رومی لشکر کے جس سپاہی پر اُن کی نظر پڑ گئی اُسے قتل کیے بغیر نہ چھوڑا ، شہر کے گرجوں ، مکانوں اور گلیوں میں بھی اُنھوں نے جس مرد ، عورت اور بچے کو دیکھا زندہ نہ جانے دیا* ۔"

بٹلر کا یہ سارا بیان محض افتراء ہے اور اس کی کچھ حقیقت نہیں ۔ تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ عرب مفتوحہ شہروں کے ان باشندوں سے قطعاً کوئی تعرض نہ کرتے تھے جنھوں نے ان کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے ہوں اور وہ لڑنے کے قابل نہ ہوں ۔ اُنھوں نے ہمیشہ کوشش کی کہ مفتوحہ شہروں میں کامل امن و امان قائم ہو ، باشندے آزادی اور بے فکری سے کاروبار میں مشغول ہو سکیں اور جنگ کے دوران میں شہر کے نظم و نسق میں جو خلل واقع ہو چکا ہے وہ دور ہو سکے ۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لیے وہ شہریوں کو خاص مراعات سے نوازتے تھے اور ان کے اموال و جائداد اور اہل و عیال پر قطعاً دست اندازی نہ کرتے تھے ۔

مقریزی نے لکھا ہے کہ بابلیوں کے بعد سب سے پہلے جس مقام

* بٹلر کا بیان ہے کہ " مؤرخین عرب میں سے کسی نے اس واقعے کا ذکر نہیں کیا اور وہ واحد ذریعہ جہاں سے میں نے بہ تفصیل یہ واقع لیا ہے یوحنا اسقف نقیوس کی کتاب ہے ۔" ہم نے یوحنا کی اس کتاب کی تلاش میں ' مکتبہ سلطانیہ' ' مکتبہ جامعہ مصریہ' اور دیگر مشہور لائبریریوں کی الماریاں چھان ماریں مگر ہمیں کہیں اس کتاب کا سراغ نہ مل سکا ۔

پر رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان لڑائی ہوئی وہ مریوط تھا (جلد اول ، صفحہ ۱۶۷) حالانکہ مریوط اور طرنوط کے درمیان کافی فاصلہ ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مقریزی سے یہ غلطی مصر کے جغرافیے کا پوری طرح علم نہ ہونے کی وجہ سے ہوئی ۔

نقیوس میں رومی اشکر کا قلع قمع کرنے کے بعد عمرو بن العاص نے شریک بن سمی کو بقیۃالسیف ہزیمت خوردہ لشکر کا تعاقب کرنے کے لیے بھیجا ۔ 'کوم شریک*' میں دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہؤا ۔ رومیوں نے شریک کے لشکر کو گھیرے میں لے لیا ۔ شریک نے یہ دیکھ کر ابو ناعمہ مالک بن ناعمہ صدفی کو عمرو بن العاص کے پاس بھیجا ۔ رومیوں نے ان کا پیچھا کرنا چاہا لیکن وہ ہاتھ نہ آسکے ۔ عمرو بن العاص کے پاس پہنچ کر آپ نے سارا ماجرا عرض کیا ۔ آپ نے یہ سن کر فوراً لشکر کو کوچ کرنے کا حکم دیا ۔ جب رومیوں نے آپ کی آمد کی خبر سنی تو محاصرہ چھوڑ کر تتر بتر ہو گئے ۔ ابن عبدالحکم کی روایت کے مطابق شریک اور رومیوں کے درمیان تین دن تک لڑائی جاری رہی ۔ کوم شریک سے آگے بڑھ کر عمرو بن العاص 'سلطیس†' پہنچے ۔ یہاں بھی رومی فوج سے آپ کا مقابلہ ہؤا جس میں رومیوں کو شکست اٹھانی پڑی ۔ سلطیس سے روانہ ہو کر آپ نے 'کریون‡' کا قصد کیا ۔ یہ شہر بابلیون اور اسکندریہ

* یہ شہر طرنوط سے سولہ میل بجانب شمال واقع ہے ۔

† سلطیس کا شہر دمنہور کے جنوب میں چھ میل کے فاصلے پر کوم شریک اور کریون کے عین درمیان واقع ہے ۔

‡ علی مبارک پاشا لکھتے ہیں کہ کریون پہلا مقام تھا جہاں اسکندریہ سے روانگی کے بعد سیاح آکر اترتے تھے ۔ دونوں شہروں کے درمیان بہت کم فاصلہ تھا ۔

کے درمیان قلعوں کے مسلسل سلسلے کی آخری کڑی تھا۔

رومی سپہ سالار 'تھیوڈورس' نے اس مضبوط قلعے کی دیواروں کے پیچھے پڑاؤ ڈالا اور مسلمانوں سے جنگ چھیڑ دی۔ بہت دنوں تک شدید جنگ جاری رہی۔ آخر تائید خداوندی سے مسلمانوں کو یہاں بھی فتح نصیب ہوئی۔ اب مسلمان اسکندریہ کی فصیلوں کے سامنے کھڑے تھے۔

عمرو بن العاص کے بیٹے عبداللہ مقدمۃالجیش پر مقرر تھے۔ آپ کے غلام وردان علم‌بردار تھے۔ فصیل پر سے تیروں کی بارش کے باعث عبداللہ کو کئی زخم پہنچے۔ انھوں نے وردان سے کہا، اگر ہم کچھ پیچھے ہٹ جائیں تو ہمیں اس مصیبت سے نجات مل جائے گی اور کچھ آرام حاصل ہو سکے گا۔ وردان نے جواب دیا، آرام پیچھے ہٹنے میں نہیں، آگے بڑھنے میں ہے۔ یہ سن کر عبداللہ کا حوصلہ بھی بڑھا اور وہ بجائے پیچھے ہٹنے کے آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ اسکندریہ کا یہ محاصرہ گبن کی روایت کے مطابق بائیس روز جاری رہا۔

(۲) فتح اسکندریہ: جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، اسکندریہ مشرقی رومی سلطنت کا دوسرا بڑا سیاسی اور فوجی مرکز اور بہت بھاری تجارتی شہر تھا۔ انھیں وجوہ کی بنا پر رومیوں اور بطالسہ نے اس کی حفاظت اور دفاع کے لیے زبردست انتظامات کر رکھے تھے۔ بحیرۂ روم پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں لحہ بہ لحہ شہنشاہ روم کی طرف سے سامان جنگ اور کمک پہنچتی رہتی تھی۔ عمرو بن العاص کے پاس کشتیاں نہ تھیں جن کی مدد سے آپ اس کمک کو رومیوں کے پاس پہنچنے سے روک سکتے۔ شہر کی محافظ فوج کی تعداد پچاس ہزار سے کسی

صورت بھی کم نہ تھی ۔ سامان رسد اور سامان جنگ کی بھی آس کے پاس کمی نہ تھی ۔ ادھر عربوں کے پاس نہ صرف سامان جنگ کی کمی تھی بلکہ انھیں فصیل شکن ھتھیار استعمال کرنے کی بھی پوری مہارت نہ تھی ۔ اس لیے آنھوں نے تمام حالات کا جائزہ لے کر طے کیا کھ انھیں قلعے پر حملہ کرنے میں جلدی نہ کرنی چاھیے بلکہ دشمن کو آس وقت تک ڈھیل دینی چاھیے جب تک اللہ اپنے فضل سے ان کی مدد و نصرت کے سامان پیدا نہ کر دے ۔

مؤرخین نے عمرو بن العاص کے لشکر کی تعداد جو محاصرہ اسکندریہ کے وقت ان کے ھمراہ تھا ، بارہ ھزار لکھی ھے ۔ لیکن ھمارے نزدیک آپ کے لشکر کی تعداد اس سے بہت زیادہ تھی کیونکہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ھے قبطی ان جنگوں میں عربوں کے بہت بڑے مددگار ثابت ھوئے تھے اور آن کی بہت بڑی تعداد عمرو بن العاص کے جھنڈے تلے موجود تھی ۔ قبطی رؤساء اسلامی لشکر کے لیے سامان رسد اور ان کے گھوڑوں کے لیے چارے وغیرہ کا انتظام بھی کرتے تھے ۔

مسلمانوں نے اسکندریہ کا محاصرہ اوائل جون میں شروع کیا تھا* اور اسکندریہ آ کے رومیوں سے ان کی جھڑپوں کا آغاز ھو

* اس جگہ کی تعیین کرنا جہاں مسلمانوں نے اپنا پڑاؤ ڈالا تھا بہت مشکل ھے ۔ بٹلر کا خیال ھے کہ مسلمان قلعے کے مشرق یا جنوب مشرق میں آ کر آترے تھے کیونکہ شمال کی طرف سے بحر احمر نے ، جنوب کی طرف سے بحر مریوط نے اور مغرب کی طرف سے دریائے دراغون نے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا ۔
باقی صفحہ ۱۵۵ پر

گیا تھا ۔ ان جھڑپوں کا سلسلہ دو مہینے تک جاری رہا ۔ ابن عبدالحکم نے لیث بن سعد کے حوالے سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ایک روز قلعے کے دروازے سے نکل کر کچھ رومیوں نے مسلمانوں پر حملہ کیا اور قبیلہ مہرہ کے ایک شخص کا سر کاٹ کر ساتھ لے گئے ۔ مہریوں نے اپنے آدمی کی لاش کو بغیر سر کے دفن کرنے سے انکار کر دیا ۔ عمرو بن العاص نے فرمایا " رومیوں کو تمھارے غصے کی کیا پروا ؟ اب تو یہی صورت ہے کہ جس طرح انھوں نے تمھارے آدمی کا سر کاٹ لیا ہے تم بھی ان کے کسی آدمی کا سر کاٹ لو ۔ جب وہ دوبارہ قلعے سے باہر نکلیں تو ان کے کسی آدمی کا سر کاٹ کر ان کی طرف پھینک دو ، وہ بھی تمھارے آدمی کا سر تمھاری طرف پھینک دیں گے ۔" چنانچہ جب رومی دوبارہ قلعے کے باہر نکلے تو مسلمانوں نے ان کے ایک بطریق کا سر کاٹ لیا اور اسے ان کی جانب پھینک دیا ۔ یہ دیکھ کر رومیوں نے بھی مقتول مہری کا سر مسلمانوں کی طرف پھینک دیا ۔ عمرو بن العاص نے فرمایا " لو ، تمھارے ساتھی کا سر تمھارے پاس آ گیا ہے ، اب تم اسے دفن کر دو ۔"

یہ واقعہ باوجود اپنی سادگی کے عمرو بن العاص کی بے نظیر عقل مندی پر دال ہے کہ آپ نے اپنے ساتھیوں کو تسلی دینے اور ان کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کیسی عمدہ تدبیر سے کام لیا ۔

بقیہ حاشیہ ۱۰۴

عمرو بن العاص نے فوجوں کو شہر کی فصیلوں سے کافی فاصلے پر پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا تھا تاکہ وہ رومیوں کے تیروں کی بوچھاڑ سے بچے رہیں ۔ سیوطی نے لکھا ہے کہ آپ کی فوج حلوہ اور قصر فارس کے درمیان خیمہ زن ہوئی تھی ۔

گبن لکھتا ہے ''مصر کے مقامی باشندے اپنے رومی حاکموں کے جور و ستم سے اس قدر تنگ آئے ہوئے تھے کہ انھوں نے رومیوں کو تباہ و برباد کرنے اور انھیں مصر سے دھکیلنے کے لیے ایک اور اجنبی طاقت کا معاون و مددگار بننا خوشی سے منظور کر لیا۔'' عمرو بنؓ العاص کو جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی تھی قبطی بلا تامل بہم پہنچا دیتے تھے۔

جہاں تک عربوں کی شجاعت کا تعلق ہے اس کے متعلق بطریق اوتیخوس اپنے مشاہدات کے ذیل میں لکھتا ہے کہ عرب اسکندریہ کی جنگ میں شجاعت کے لحاظ سے شیر کی مانند تھے۔ انھوں نے نہ صرف رومیوں کے متواتر اور پرزور حملوں کو روکا بلکہ خود ان پر اتنے ہی زور شور سے حملے کیے۔ شہر کی اونچی اونچی فصیلیں اور برج ان کی راہ میں حائل نہ ہو سکے۔ ان حملوں میں عمرو بن العاص کی تلوار سب سے آگے چمکتی رہتی تھی اور آپ کا پھریرا بڑی شان سے لہراتا رہتا تھا۔

ایک روز مسلمانوں نے قلعے پر بڑی شدت سے حملہ کر دیا اور رومیوں کو پسپا کرتے ہوئے قلعے کے اندر گھس گئے۔ رومیوں نے ایک بار پھر جرأت دکھائی اور جوابی حملہ کر کے مسلمانوں کو قلعے سے باہر نکال دیا البتہ مسلمانوں کے چار آدمی اندر ہی رہ گئے جن میں عمرو بن العاص اور مسلمہ بن مخلد بھی تھے۔ یہ چاروں ایک حمام میں گھس گئے اور اسے اندر سے بند کر کر لیا۔ رومیوں نے ایک آدمی کو جو عربی جانتا تھا ان سے بات چیت کے لیے بھیجا۔ اس نے ان سے کہا '' اب تم ہمارے ہاتھوں میں قیدی بن چکے ہو اس لیے اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو اور خواہ مخواہ اپنی جانوں کے دشمن نہ بنو۔'' لیکن ان لوگوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ رومی مترجم نے دوبارہ

کہا کہ تم اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو ، تم لوگوں کے پاس ہمارے بھی کچھ قیدی ہیں ، ہم اپنے آدمیوں سے تمہارا تبادلہ کر لیں گے اور تمہیں قتل نہ کریں گے ۔ اس پر بھی ان لوگوں نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا ۔ آخر رومیوں نے کہا ، اب صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے وہ یہ کہ ہم اپنا ایک آدمی تمہارے مقابلے کے لیے تیار کرتے ہیں ، اگر تم ہمارے آدمی پر غالب آ گئے تو ہم تمہیں آزاد کر دیں گے لیکن اگر ہمارا آدمی تم پر غالب آ گیا تو تمہیں ہمارے ہاتھوں میں قیدی بننا پڑے گا ۔

یہ لوگ اس شرط پر رضامند ہو گئے اور حمام سے باہر نکل آئے ۔ رومیوں نے ایک گرانڈیل اور قوی ہیکل شخص کو ، جو اپنی بہادری اور شجاعت میں مشہور تھا ، مسلمانوں کے مقابلے کے لیے لا کھڑا کیا ۔ عمرو بن العاص نے خود اس کے مقابلے کے لیے نکلنا چاہا لیکن مسلمہ بن مخلد نے آپ کو روکا اور کہا "آپ ہمارے امیر ہیں اگر خدانخواستہ یہ آپ پر غالب آ گیا تو ساری فوج ہمت ہار بیٹھے گی ۔ اس کے مقابلے کے لیے میں ہی کافی ہوں ۔ اگر میں غالب آ گیا تو کیا کہنے اور اگر نہ بھی آ سکا تو بھی میں اکیلا ہی قتل ہوں گا ۔ میرے قتل ہونے سے باقی فوج پر کوئی اثر نہ پڑے گا ۔" عمرو بن العاص نے اجازت دے دی ۔ چنانچہ مسلمہ بن مخلد رومی بہادر کے مقابلے میں نکلے اور نصرت خداوندی سے تلوار کے ایک دو وار ہی میں اس کا خاتمہ کر دیا ۔

رومیوں نے بادل ناخواستہ اپنا وعدہ پورا کیا اور انھیں قلعے کی فصیل سے باہر کر دیا ۔ اس وقت انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ اسلامی فوج کے سپہ سالار عمرو بن العاص بھی ان

لوگوں میں ہیں ۔ بعد میں جب انہیں اس بات کا پتا چلا تو سخت افسوس ہؤا * ۔

مندرجہ بالا روایت کو ابن عبدالحکم اور مقریزی نے بیان کیا ہے لیکن ہمیں نہ صرف اس کی صحت میں شک ہے بلکہ ہم اسے محالات میں سے سمجھتے ہیں ۔ فتح کے بعد فاتحین اور قائدین کے متعلق ایسی حکایتیں اکثر مشہور ہوجاتی ہیں ۔ عمروبن العاص کے متعلق بھی ایسی باتیں مشہور ہو جانا تعجب کی بات نہیں ۔

مسلمانوں کو اسکندریہ کا محاصرہ کیے چودہ مہینے ہو چکے تھے ۔ حضرت عمر فاروق کو یہ بات بڑی شاق گزری اور آپ

* ایر فنج نے اس واقعے کے متعلق یوں گوہر افشانی کی ہے : ” جب عمرو بن العاص اسکندریہ میں رومیوں کے ہاتھوں میں قید ہو گئے تو آپ کو شہر کے حاکم کے سامنے لے جایا گیا ۔ اس سے گفتگو کے دوران میں آپ بالکل بھول گئے کہ اس وقت آپ کس حالت میں ہیں ۔ آپ نے حاکم کے سامنے ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے شجاعت اورعزم و ارادہ کا اظہار ہوتا تھا ۔ حاکم کو شبہہ پیدا ہؤا اور اس نے آپ کے قتل کا حکم صادر کر دیا ۔ وردان آپ کے برابر میں کھڑے تھے ۔ قتل کا حکم سن کر انھوں نے آپ کے منہ پر زور کا ایک تھپڑ مارا اور کہا ” اے کتے ! خاموش ۔ سرداروں کے سامنے بولا نہیں کرتے ۔“ ادھر مسلمہ نے حاکم سے کہا ” ہمارے خلیفہ نے عمرو بن العاص کو حکم بھیجا ہے کہ وہ شہر کا محاصرہ ختم کر دیں اور رومیوں سے مصالحت کر لیں ۔“ حاکم شہر نے یہ سن کر اس امید میں انہیں چھوڑ دیا کہ اب مسلمان محاصرہ ختم کر دیں گے اور مصالحت کی تجاویز اس کے سامنے پیش کریں گے ۔“

کے دل میں مختلف شبہات پیدا ہونے لگے۔ آپ نے عمرو بن العاص کو ایک خط بھیجا جس میں اسکندریہ کی فتح میں تاخیر پر ناراضی کا اظہار فرمایا اور حکم دیا کہ اس خط کو مسلمانوں کے سامنے پڑھ کر سنا دیا جائے تاکہ ان کی ہمتیں بیدار ہوں اور وہ ایک نئے عزم اور ولولے سے لڑائی کے لیے تیار ہو جائیں۔ عمرو بن العاص نے فوج کے سامنے یہ خط پڑھا اور عبادہ بن صامت کو حکم دیا کہ وہ قلعے پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے بڑے زور شور سے حملہ کر دیا اور اس وقت تک دم نہ لیا جب تک خشکی اور تری دونوں جگہوں میں رومیوں کو شکست فاش نہ دے دی۔ اس طرح چودہ * مہینے کے طویل محاصرے کے بعد شہر اسکندریہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا۔

اگرچہ اسکندریہ کی فتح بزور شمشیر ہوئی تاہم عمرو بن العاص نے وہاں کے باشندوں کو ذمیوں کے ذیل میں شمار کیا اور حکم دے دیا کہ جو شخص ذمی بن کر شہر میں رہنا چاہے اسے

---

* محاصرے کی مدت کے متعلق مؤرخین میں اختلاف ہے۔ بلاذری اور کندی لکھتے ہیں کہ محاصرہ تین مہینے جاری رہا۔ کندی ہی نے لیث سے جو روایت بیان کی ہے اس میں محاصرے کی مدت چھ مہینے بیان کی ہے۔ مقریزی، ابن عبدالحکم، سیوطی، گبن اور ایرفنج کی تحریر کے مطابق محاصرہ چودہ مہینے جاری رہا۔ ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ محاصرہ چودہ مہینے جاری رہا کیونکہ یہ بات بعید از فہم ہے کہ اس قدر مضبوط و مستحکم قلعے کا محاصرہ، جس میں بے حد سامان رسد موجود تھا اور جو سمندر کی راہ سے بالکل کھلا ہوا تھا، صرف تین یا چھ مہینے ہی جاری رہے حالانکہ تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ اسکندریہ کی جنگ انتہائی شدید جنگ تھی۔

اجازت ہے اور جو شخص نکل جانا چاہے اس کی راہ میں بھی کسی قسم کی کوئی روک نہیں * ۔

مقریزی ابن لہیعہ سے روایت کرتے ہیں کہ عمرو بن العاص نے اسکندریہ کے باشندوں پر چھ لاکھ دینار جزیہ عاید کیا کیونکہ شہر میں تین لاکھ باشندے موجود تھے جنھیں آپ نے ذمی شمار کر کے فی کس دو دینار جزیہ لگا دیا ۔

بٹلر کا بیان ہے کہ جس شخص نے اسکندریہ کے باشندوں کے متعلق مسلمانوں سے معاهدہ کیا وہ مقوقس تھا جو ہرقل کی وفات کے بعد اپنی جلا وطنی کے دن پورے کر کے مصر واپس آ گیا تھا ۔

ذیل میں وہ شرائط لکھی جاتی ہیں جنھیں بٹلر نے اپنی کتاب میں یوحنا اسقف نقیوس کے حوالے سے درج کیا ہے :

(۱) جن لوگوں پر جزیہ فرض ہوگا وہ ہر سال دو دینار جزیے کے طور پر ادا کیا کریں گے ۔

(۲) عارضی صلح کی مدت گیارہ مہینے ہو گی اور یہ مدت ۲۸ ستمبر ۶۴۲ء کو ختم ہو جائے گی †۔

---

* مصر کی بعض بستیاں ایسی بھی تھیں جہاں کے باشندے رومیوں کے حامی تھے اور عربوں کے مخالف مثلاً بلہیب ، سلطیس، سخا ، قرطیا وغیرہ ۔ عمرو بن العاص نے ان پر تسلط حاصل کر کے ان کے باشندوں کو قیدی بنا لیا اور انھیں حضرت عمر کی خدمت میں مدینہ روانہ کر دیا ۔ حضرت عمر نے انھیں ان کی بستیوں میں واپس بھجوا دیا اور انھیں اہل ذمہ میں شمار کرنے کا حکم دیا ۔

† اس شرط سے معلوم ہوتا ہے کہ عارضی صلح اس وقت تک کے لیے تھی جب تک حضرت عمر کی طرف سے اس صلح کی توثیق یا عدم توثیق نہ ہو جاتی ۔

(٣) عرب صلح کے دوران میں مصریوں کے مراکز کی حفاظت کریں گے ، اسکندریہ کے خلاف کوئی فوجی کاروائی نہ کریں گے - رومی فوجوں کے لیے بھی ضروری ہوگا کہ وہ مخالفانہ سرگرمیوں سے باز رہیں -

(٤) سمندر کا راستہ رومی فوجوں کے اسکندریہ سے کوچ کرنے کے لیے کھلا ہوگا - وہ اپنے ساتھ اپنا سارا مال اسباب لے جا سکیں گی - وہ فوجیں جو خشکی کے راستے مصر سے کوچ کریں گی ان سے اس مہینے کا جزیہ لیا جائے گا جس میں انہوں مصر سے کوچ کیا -

(٥) رومی لشکر یہاں سے جانے کے بعد نہ واپس آئے گا اور نہ مصر واپس لینے کی کوشش کرے گا -

(٦) مسلمان گرجوں کی بے حرمتی اور مسیحیوں کے مذہبی امور میں کسی قسم کی دست اندازی نہ کریں گے -

(٧) یہودیوں کو اسکندریہ میں رہنے کی اجازت ہو گی -

(٨) مسلمانوں کے پاس ڈیڑھ سو رومی سپاہی اور ملکی فرقے کے پچاس آدمی بطور یرغمال رہیں گے -

مقریزی نے لکھا ہے کہ فتح اسکندریہ کے بعد عمرو بن العاص نے حضرت عمر کو ایک خط تحریر کیا جس میں اسکندریہ کا حال تفصیل سے بیان کیا - آپ نے خط میں لکھا کہ اس شہر میں چارہزار حمام ، بارہ ہزار سبزی فروش ، ستر ہزار یہودی اور دو لاکھ رومی ہیں -

ابن عبدالحکم اور بعض دیگر مؤرخین نے لکھا ہے کہ اسکندریہ کے محاصرے کی طویل مدت میں مسلمانوں کے صرف بائیس آدمیوں نے جام شہادت نوش کیا - اس کے مقابلے میں

گبن مسلمان شہداء کی تعداد تئیس ہزار بتاتا ہے ۔ لیکن یہ دونوں اندازے مبالغہ آمیز ہیں ۔ جہاں تک اول الذکر روایت کا تعلق ہے یہ بات قرین قیاس نہیں کہ اسکندریہ کے طویل محاصرے کے دوران میں ، جہاں مسلمانوں کو انتہائی مضبوط و مستحکم فصیلوں کا سامنا کرنا پڑا اور جن کے برجوں سے رات دن مسلمانوں پر تیروں کی بارش کی جاتی تھی ، ان کے صرف بائیس آدمی شہید ہوئے ہوں ، حالانکہ اس دوران میں مرنے والوں کی تعداد اس تعداد سے کئی گنا بڑھ کر ہوگی ۔

اسی طرح ہم یہ بات بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ مسلمانوں کو اس جنگ کے دوران میں تئیس ہزار آدمیوں کا نقصان اٹھانا پڑا کیونکہ اسلامی لشکر کی کل تعداد بھی تئیس ہزار تک نہیں پہنچی چہ جائیکہ تئیس ہزار مسلمان میدان جنگ میں کام آ جائیں ۔

اسکندریہ کی فتح رومیوں کے تابوت میں آخری میخ ثابت ہوئی ۔ تمام مصری باشندوں نے دل و جان سے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی اکثریت اسلام قبول کرتی گئی ۔

(۳) کتب خانہ اسکندریہ : زمانہ حال کے مؤرخین میں کتب خانہ اسکندریہ کی آتش زدگی کے متعلق کافی بحث ہوئی ہے ۔ اکثر مستشرقین اور یورپی مؤرخین مثلاً گبن ، بٹلر ، موسیوسیدیو اور گستاو لیبان وغیرہ نے بھی اس بحث میں دل کھول کر حصہ لیا ہے ۔ بحث و تدقیق کے بعد اکثر مؤرخین اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عمرو بن العاص پر یہ الزام صحیح نہیں کہ انھوں نے حضرت عمر کے حکم سے اس کتب خانے کو نذر آتش کر دیا

تھا کیونکہ جہاں اسلامی فاتحین کے طور طریقے اس قسم کے وحشیانہ افعال کے صریحاً منافی ہیں وہاں آن معاصر غیر مسلم مؤرخین نے اس واقعے کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا جن کے سامنے مصر کی اسلامی فتوحات رونما ہوئیں اور جنھوں نے اپنی تاریخوں میں ان فتوحات کے حالات بالتفصیل قلم بند کیے - انہیں معاصر غیر مسلم مؤرخین میں سے ایک شخص اوتیخوس بھی ہے جس نے نہایت بسط اور تفصیل سے اسکندریہ کی فتح کا حال اپنی کتاب میں لکھا ہے لیکن اس کی کتاب مسلمانوں کے ذریعے سے کتب خانۂ اسکندریہ کی آتشزدگی کے واقعے سے یکسر خالی ہے - آخر کیا وجہ ہے کہ اس غیر مسلم مؤرخ کی نظر سے اتنا عظیم الشان واقعہ اور وحشت و درندگی کی اتنی حیرت انگیز مثال پوشیدہ رہ گئی ؟ اس روایت کے بناوٹی ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ قدیم مؤرخین مثلاً طبری ، کندی ، یعقوبی ، بلاذری اور ابن عبدالحکم وغیرہ میں سے کسی ایک نے بھی اس واقعے کے متعلق کچھ نہیں لکھا ، حالانکہ ان مؤرخین نے اسلامی تاریخ کے چھوٹے سے چھوٹے واقعے کو بھی اپنی کتابوں میں قلم بند کیا ہے اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کی کہ اس روایت کے بیان کرنے سے مسلمانوں کے دامن پر کوئی دھبا لگتا ہے یا نہیں - دور آخر کے مؤرخین مثلاً مقریزی اور سیوطی وغیرہ کی کتابیں بھی اس واقعے کے ذکر سے خالی ہیں -

سب سے پہلے جس شخص نے عمرو بن العاص سے کتب خانہ اسکندریہ کو آگ لگانے کا الزام منسوب کیا وہ عبداللطیف بغدادی تھا جس نے ۱۲۳۱ء میں انتقال کیا - زمانۂ حال کے بعض مؤرخین یہ بھی لکھتے ہیں کہ سب سے پہلا شخص جس نے اس

حادثے کا ذکر کیا ھے وہ ابوالفرج ملطی* ھے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ابوالفرج کا زمانہ ۱۲۲٦ء سے ۱۲۸٦ء تک ھے یعنی عبداللطیف بغدادی کے بعد تک - ابوالفرج نے یہ الزام اپنی کتاب ' مختصرالدول ' میں عائد کیا ھے اور یورپی مؤرخین نے اس کتاب کو سند بنا کر اس بے بنیاد الزام کو ھوا دی ھے -

ذیل میں کتب خانے کی آتشزدگی کے متعلق ابوالفرج کی بیان کردہ روایت درج کی جاتی ھے - وہ لکھتا ھے :

" مصر کی اسلامی فتوحات کے زمانے میں ایک قبطی پادری

---

* غریغوریوس ابوالفرج بن أهرون المعروف بہ ابن العبری ۱۲۲٦ء میں آرمینیا کے دارالحکومت ' ملطیہ ' میں پیدا ھؤا - پہلے اس نے یونانی ، سریانی اور عربی سیکھی - اس کے بعد فلسفہ اور الٰہیات کی تحصیل میں مشغول ھؤا - اس نے ساٹھ برس کی عمر پائی اور ۱۲٦۸ میں انتقال کیا - وہ بے حد محنتی شخص تھا اور ساری عمر مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مصروف رھا - اس کی تالیفات کی تعداد تیس سے بھی متجاوز ھے - یہ کتابیں اس نے عربی اور سریانی میں تحریر کیں اور یہ فلسفہ ، علم ھیئت ، طب ، تاریخ ، نحو اور شعر وغیرہ اصناف پر مشتمل ھیں - اس کی مشھور ترین تالیف ' تاریخ الدول ' ھے جسے اس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں سریانی سے عربی میں منتقل کیا - یہ سریانی کتاب کا خلاصہ ھے لیکن اس میں متعدد ایسے امور کا اضافہ کر دیا گیا ھے جو اصل سریانی کتاب میں موجود نہیں - زوائد میں اسلامی سلطنت اور مغلوں سے تعلق رکھنے والے امور اور علماء و اطباء کے حالات خصوصیت سے قابل ذکر ھیں - (کتاب مختصرالدول مکتبہ سلطانیہ مصر کے شعبۂ تاریخ میں موجود ھے اور اس کا نمبر ۱۲۲۴ ھے)

یحیٰی نحوی نے ، جو ہماری زبان میں غرسا طیقوس کے لقب سے ملقب ہے ، بڑی شہرت حاصل کی - یہ شخص اسکندریہ کا رہنے والا تھا - اس کے عقائد یعقوبی عیسائیوں کے سے تھے اور یہ ساوری کے عقیدے کی تائید کرتا تھا - بعد ازآں اس نے عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث سے انکار کر دیا - اس پر سارے مصر کے پادری جمع ہوئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ اس عقیدے سے رجوع کر لے لیکن اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا - اس پر پادریوں نے اس کا عہدہ اور رتبہ گھٹا دیا - جب عمرو بن العاص نے شہر اسکندریہ فتح کیا تو وہ آپ کے پاس آیا - چونکہ عمروبن العاص اس کی علمی قابلیت سے واقف تھے اس لیے آپ اس سے بہت عزت و تکریم کے ساتھ پیش آئے اور اس سے وہ فلسفیانہ باتیں سنیں جن سے اہل عرب ناآشنا تھے - اس کی باتوں نے عمرو بن العاص کے دل پر بہت اثر کیا - چونکہ وہ بڑے عقل مند ، خوش فہم اور صحیح الفکر شخص تھے اس لیے انھوں نے یحیٰی کو اپنے پاس بلا لیا اور اسے کسی وقت بھی اپنے سے جدا نہ کرتے تھے -

ایک دن یحیٰی نے عمرو بن العاص سے کہا کہ " آپ نے اسکندریہ کی تمام چیزوں کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے - جو چیزیں آپ کے کام کی ہیں ان سے تو میں کچھ تعرض نہیں کرتا لیکن جو چیزیں آپ کے کسی مصرف کی نہیں ان سے فائدہ اٹھانے کے حق دار تو ہمیں ہیں -" عمرو بن العاص نے پوچھا " تمھیں کن چیزوں کی ضرورت ہے ؟" یحیٰی نے جواب دیا " فلسفے کی ان کتابوں کی جو شاہی کتب خانوں میں ہیں -" عمرو بن العاص نے کہا "میں امیرالمومنین حضرت عمر بن الخطاب کی اجازت کے بغیر ان کتابوں کے بارے میں کوئی حکم نہیں دے سکتا - چنانچہ انھوں نے خلیفہ کو ایک خط ارسال کر کے یحیٰی کی درخواست

سے مطلع کر دیا ۔ وہاں سے جواب آیا کہ جن کتابوں کا تم نے
ذکر کیا ہے اگر وہ کتاب‌اللہ کے موافق ہیں تو ان کی کوئی
ضرورت نہیں ، اللہ کی کتاب ہی کافی ہے ۔ اور اگر وہ کتاب‌اللہ
کے مخالف ہیں تو تباہ کر دینے کے لائق ہیں ، اس لیے تم آنھیں
تباہ کرنا شروع کر دو ۔ یہ خط آنے پر عمرو بن العاص نے ان
کتابوں کو اسکندریہ کے حماموں میں تقسیم کرنا اور آنھیں جلوانا
شروع کر دیا ۔ چھ مہینے کی مدت میں وہ کتابیں جل کر ختم
ہوئیں ۔ پس جو کچھ ہؤا اسے سنو اور تعجب کرو ۔"

جب ہم ابوالفرج کی اس روایت کو تنقید کی کسوٹی پر رکھتے
ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعاً بناوٹی اور از سرتاپا جھوٹ
اور فریب کا مجموعہ ہے ۔ گبن ، بٹلر ، سیدیو اور علامہ شبلی نعمانی
نے بھی اس روایت کو قطعی طور پر ناقابل اعتبار ٹھہرایا ہے ۔
گبن اپنی تاریخ میں لکھتا ہے :

" جب سے ابوالفرج کی کتاب لاطینی زبان میں ترجمہ ہوئی
اور یورپیوں کو اس کتب خانے کے جلائے جانے کی خبر پہنچی ،
اس وقت سے علم و ادب کے اس بیش قیمت خزانے کی تباہی پر
افسوس کا اظہار کیا جا رہا ہے ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے ،
میں اس واقعے کی اصلیت اور اس واقعے سے مرتب ہونے والے
نتائج ، دونوں سے انکار کی طرف مائل ہوں ۔ عجیب بات ہے کہ
یہ روایت (سب سے پہلے) وہ شخص بیان کرتا ہے جو فارس کے
علاقے کا رہنے والا ہے اور جو اسکندریہ کی فتح کے چھ سو سال
بعد پیدا ہؤا ، لیکن مصر کے وہ دو مسیحی مؤرخ جو اس واقعے
کے وقت زندہ موجود تھے اور جن کی آنکھوں کے سامنے تمام
واقعات پیش آئے ، وہ اس کتب خانے کی تباہی کے بارے میں
بالکل خاموش ہیں ۔ ان میں سے ایک مؤرخ بطریق اوتیخوس

(یوٹیکس) ہے جس نے اسکندریہ کی فتح کا حال خاص طور پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے - اسلامی تعلیمات اور روایات بھی اس روایت کی تردید کرتی ہیں - جب مسلمانوں نے ان یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی کتابوں سے تعرض نہ کیا جو ہمیشہ ان سے برسرپیکار رہے اور اُن کی کتابوں کے جلانے یا اُنھیں تباہ کرنے کا اُن کے دلوں میں واہمہ بھی پیدا نہ ہؤا تو یہ کس طرح مانا جا سکتا ہے کہ وہ فلسفہ ، طب ، تاریخ ، شعر اور دیگر غیر مذہبی علوم کی اُن کتابوں کو بلا تامل نظر آتش کر دیتے جن سے وہ بے حد فائدہ حاصل کر سکتے تھے- اس ذیل میں میں اُن واقعات کو دوبارہ بیان کرنا نہیں چاہتا جو ۴۷ق م میں جولیس سیزر کے محاصرۂ اسکندریہ کے زمانے میں کتب خانہ اسکندریہ کی آتشزدگی کی صورت میں رونما ہوئے تھے اور نہ قدیم عیسائیوں کی اُس شدید نفرت ہی کو زیر بحث لانا چاہتا ہوں جو اُنھیں بت پرستوں سے تھی اور اسی نفرت کا اثر تھا کہ اُنھوں نے مصر میں بت پرستوں کو تباہ کرنے اور اُن کی بنائی ہوئی چیزوں کو برباد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا (انھیں چیزوں میں شاہی محلات اور سراپیم کے کتب خانے بھی تھے) اُن امور سے قطع نظر جب ہم انتونیو سے تھیوڈوسس تک کے عہد پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں متعدد شواہد کی ایک لمبی کڑی کے ذریعے سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اس زمانے کے بعد شاہی محل اور سراپیم کے معبد کے وہ کتب خانے موجود ہی نہ رہے تھے جنھیں 'لاجوسیین' نے قائم کیا تھا اور جن میں ایک روایت کے مطابق چار لاکھ اور بعض دوسری روایات کے رو سے سات لاکھ کتابیں موجود تھیں - البتہ حماموں میں اُن کتابوں کے جلائے جانے کا احتمال ہو سکتا ہے جو آریوسیین اور خلقدونیوں کے باہمی مذہبی بحث و مباحثہ پر مشتمل

تھیں ۔ اس صورت میں ہر عاقل حکیم اس بات پر خوشی محسوس کرے گا کہ یہ سب کچھ انسانی خدمت کی خاطر کیا گیا ۔''
(تاریخ زوال سلطنت روما ، جلد ۹)

گبن متعجب ہے کہ ابوالفرج مصر سے دوری اور چھ سو برس بعد ہونے پر ایک ایسا واقعہ بیان کرتا ہے جو اس سے پہلے کسی نے بیان نہیں کیا ۔ لیکن اس سے پہلے عبداللطیف بغدادی المتوفی ۱۲۳۱ء یہی واقعہ بیان کر چکا ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ اس سے پہلے بھی کسی نے یہی واقعہ لکھا ہو جسے عبداللطیف نے اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہو ۔ غرض کہ ابوالفرج سے پہلے عربی مصنفین کی کتابوں میں یہ واقعہ درج ہو چکا ہے ۔ ابوالفرج نے صرف اتنا کیا کہ اس پر حاشیے چڑھا کر خوب مبالغے سے بیان کیا ۔ باقی رہا یہ احتمال کہ ' اگر کچھ کتابیں جلی بھی تھیں تو وہ دو انتہا پسند فرقوں کے مذہبی جھگڑوں کی کتابیں تھیں اور ایسا کرنے سے مقصود خدمت انسانی تھی' تو یہ گبن کے اپنے پہلے بیان کے صریح متناقص ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ میں اس واقعے کی اصلیت اور اس واقعے سے مرتب ہونے والے نتائج دونوں سے انکار کرتا ہوں ۔

شیخ عبدالوہاب نجار لکھتے ہیں '' اس حقیقت کے پیش نظر کہ عبداللطیف بغدادی نے ، جو ابوالفرج ملطی سے کچھ ہی عرصہ قبل گزرا ہے ، اپنی کتاب میں یہ ذکر کیا ہے کہ عمرو بن العاص نے کتب خانہ اسکندریہ کو آگ لگا دی تھی ، سارا الزام عبداللطیف پر عاید ہوتا ہے ، ابوالفرج پر نہیں کیونکہ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ ابوالفرج کی بیان کردہ روایات کا ماخذ عبداللطیف بغدادی کی کتاب ہو جس میں یہ واقعہ بغیر کسی ثبوت کے بیان کر دیا گیا ۔ عبداللطیف نے کہیں نہیں لکھا کہ

اس نے یہ روایت کس تاریخ سے لی اور اس روایت کا ماخذ کون سا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب اسے جگہ کے متعلق یہ معلوم ہؤا کہ اس جگہ ایک کتب خانہ تھا جسے حوادث زمانہ نے نابود کر دیا تو اس نے بطور خود یہ فرض کر لیا کہ اسے تباہ کرنے والے اسلامی فوج کے سپہ سالار عمرو بن العاص تھے ۔ بہت ممکن ہے کہ عوام میں اس قسم کی باتیں مشہور ہوں اور اور اس نے بے تحقیق ان بازاری افواہوں کو حقیقت الامر سمجھ کر اپنی کتاب میں درج کر دیا ہو ۔"

مختصر یہ کہ عمرو بن العاص پر کتب خانے کو آگ لگانے کے الزام میں سب سے بڑا حصہ عبداللطیف بغدادی کا ہے ، ابوالفرج کا نہیں ۔

مسٹر سیدیو اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں :

" ابوالفرج (۱۲۲٦ء تا ۱۲۸٦ء) اور ابوالفداء (۱۲۷۳ء تا ۱۳۳۱ء) لکھتے ہیں کہ اسکندریہ پر عربوں کے تسلط کے بعد سراپیم کے مشہور کتب خانے کو آگ لگا دی گئی ۔ اس روایت کی صحت اور عدم صحت کے متعلق مؤرخین میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمعصر مؤرخین کی کتابوں میں سے کسی کتاب میں بھی اس واقعے کا ذکر نہیں پایا جاتا ۔ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہو تو بھی اس کا اطلاق چند کتابوں پر ہوگا کیونکہ کتب خانۂ مذکور کا غالب حصہ سیزر کے عہد میں اور بقیہ حصہ ۳۹۱ء میں تھیوڈوسس کے وقت میں جل گیا تھا ۔ اسلامی فتوحات کے وقت کتب خانے کی صرف دیواریں باقی تھیں ۔" (جلد اول ، صفحہ ۱۰۵ - ۱۰٦)

یہی مسئلہ ایک فرانسیسی رسالے میں بھی زیر بحث آیا تھا۔ اُس وقت موسیولکارک نے لکھا تھا ' ہمیں موسیو سیدیو کی اس بات سے اتفاق نہیں کہ " اگر یہ واقع صحیح بھی ہو تو بھی اس کا اطلاق چند کتابوں پر ہوگا۔" کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ کتب خانہ اسلامی فتوحات کے وقت موجود ھی نہ تھا۔

ڈاکٹر گستاولیبان اس واقعے سے انکار کرنے والے ایک اور مؤرخ ' لودفیک‌لالان ' کی حمایت کرتے ہوئے لکھتے ھیں :

" پہلا شخص جس نے کتب خانہ اسکندریہ کی آتشزدگی کا ذکر اپنی کتاب میں کیا ھے ایک عربی طبیب عبداللطیف بغدادی ھے جس کی وفات اس مزعومہ حادثے کے ۵۹۱ برس بعد ۱۲۳۱ء میں ھوئی۔ جہاں تک کتب خانے کے جلائے جانے کا تعلق ھے ایسا کرنا عربوں کے اخلاق کے صریح منافی ھے۔

" انتہائی تعجب انگیز بات ھے کہ اس بے اصل روایت کو بڑے بڑے ذی علم اشخاص نے بڑی بے تکلفی سے بلاتحقیق اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔ ھمارے زمانے کے محققین اس واقعے کی پر زور الفاظ میں تردید کر چکے ھیں۔ ھمیں ان کے دلائل دھرانے کی ضرورت نہیں البتہ صرف اتنا کہنا چاھتے ھیں، متعدد شہادتوں سے یہ بات ثابت ھو چکی ھے کہ عربوں کے حملے سے کافی مدت پہلے مسیحیوں نے اسکندریہ میں اُن تمام کتابوں کو تباہ کر دیا تھا جو اُن کے مخالف بت پرستوں نے جمع کی تھیں۔ کتابوں کو تباہ کرنے کے ساتھ اُنھوں نے اُن کے تمام بتوں کو بھی توڑ ڈالا تھا۔ ان واقعات پرغور کرنے سے بہ‌آسانی سمجھ میں آ سکتا ھے کہ اسکندریہ میں کوئی ایسی چیز باقی نہ رھی تھی جسے جلایا جا سکتا ھو۔" (صفحہ ۲۰۸)

جن عربی مصنفین نے کتب خانۂ اسکندریہ کے جلائے جانے کا حال بیان کیا ہے وہ دو ہیں ، ایک مقریزی اور دوسرا عبداللطیف بغدادی ۔

مقریزی اپنی تاریخ میں اسکندریہ کے مشہور مینار ' عمودالسواری ' کا حال بیان کرتے ہؤا لکھتا ہے :

" بیان کیا جاتا ہے کہ یہ ستون من جملہ اُن ستونوں کے ہے جن پر ارسطو کا رواق قائم تھا اور جہاں ارسطو حکمت اور فلسفے کا درس دیا کرتا تھا ، اور یہ کہ وہ دارالعلم تھا ۔ اس میں وہ کتب خانہ بھی تھا جسے عمرو بن العاص نے حضرت عمر کے اشارے سے جلا دیا ۔" (جلد اول ، صفحہ ۱۵۹)

عبداللطیف بغدادی جس نے حقیقتاً سب سے پہلے کتب خانۂ اسکندریہ کے عربوں کے ہاتھوں جلائے جانے کا ذکر کیا ہے اپنی ' الافادۂ والاعتبار ' کےصفحہ ۲۸ پر لکھتا ہے :

" میں نے عمودالسواری کے اردگرد بعض ستون بھی دیکھے جن میں سے بعض ابھی تک صحیح و سالم ہیں اور بعض ٹوٹ چکے ہیں ۔ ان ستونوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ایک عمارت قائم تھی ۔ عمودالسواری کے اُوپر ایک قبہ بھی بنا ہؤا ہے ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ وہ رواق ہے جہاں ارسطو اور اس کے شاگرد درس دیا کرتے تھے اور یہی وہ دارالعلم ہے جسے اسکندر نے شہر کی بنا ڈالتے ہوئے تعمیر کیا تھا ۔ اسی عمارت میں وہ کتب خانہ بھی تھا جسے عمرو بن العاص نے حضرت عمر کے حکم سے جلا دیا تھا ۔"

' ارفانیتاکی ' لکھتا ہے :

" کتب خانۂ اسکندریہ کی آتشزدگی کے متعلق مؤرخین میں

بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہے ۔ اکثر مؤرخین نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ اسکندریہ کا شاہی کتب خانہ اور سراپیم کا کتب خانہ دونوں اپنی تباہی کے لیے عربوں کے حملوں کا انتظار نہ کر سکتے تھے ۔ اُن لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عمرو بن العاص کے محاصرے کے وقت اسکندریہ میں جو کتابیں موجود تھیں وہ سب رومی سلطنت میں منتقل کر دی گئی تھیں ۔"

فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا (جلد ۳ ، صفحہ ۶۴۸) میں لکھا ہے:

" سراپیم کے کتب خانے میں جو کتابیں تھیں انہیں عیسائیوں نے چوتھی صدی عیسوی میں جلا کر خاکستر کر دیا تھا ۔ البتہ جو کتابیں اسکندریہ کے عجائب گھر میں تھیں وہ بدستور اپنی جگہ رہیں ۔ آخر ۸۳۸ء میں ترکوں نے آ کر انہیں تباہ و برباد کر دیا ۔ انہوں نے تمام آثار قدیمہ کو خراب کر ڈالا اور اُن کتابوں تک بھی جا پہنچے جو اب تک عجائب گھر میں زمانے کی دست برد سے محفوظ رہی تھیں ۔"

مذکورہ انسائیکلو پیڈیا میں اس کتب خانے کی تباہی کے متعلق بالکل نیا نظریہ بیان کیا گیا ہے جسے آج تک کسی مؤرخ نے بیان نہیں کیا ، نہ مضمون نگار نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش کی ہے ۔ ترکوں سے مضمون نگار کا اشارہ غالباً دولت طولونیہ کی طرف ہے ۔

جن شواہد کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اُن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت عمر اور عمرو بن العاص دونوں مذکورہ بالا الزام سے بری ہیں اور ابوالفرج کی روایت (اسی طرح عبداللطیف بغدادی کی روایت بھی ، جس کی وفات ابوالفرج کی ولادت کے پانچ سال بعد ہوئی) جو مصر کی فتح کے چھ سو سال بعد بیان کی

گئی اور جسے معاصر مؤرخین اور متقدمین میں سے کسی ایک نے بھی بیان نہیں کیا محض جھوٹ اور افتراء کی پوٹ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ۔

اس موضوع پر ہندوستان کے علامہ شبلی نعمانی نے اردو میں ایک بے نظیر مضمون لکھا ہے جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں ہو چکا ہے ۔ ہماری خواہش تھی کہ ہمیں انگریزی ترجمہ دیکھنے کا موقع ملتا تا کہ ہم اس سے کماحقہ استفادہ کر سکتے ، لیکن افسوس ایسا نہ ہوسکا ۔ خوش قسمتی سے مجلہ ' الہلال ' میں اس مضمون کا خلاصہ شائع ہو گیا ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں ۔ ' الہلال ' لکھتا ہے :

" علامہ شبلی کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے جس شخص نے کتب خانہ اسکندریہ کی آتشزدگی کے واقعے کو عمرو بن العاص کی طرف منسوب کیا ہے وہ ایک یہودی طبیب قارون (اہرون) کا بیٹا ابو الفرج ہے ۔ ابوالفرج ۱۲۲۶ء میں ملاطیہ میں پیدا ہؤا ...... اسی نے سب سے پہلے اپنی کتاب میں کتب خانۂ اسکندریہ کی آتشزدگی کا مسئلہ چھیڑا اور اسی کی بیان کردہ روایت کی بنا پر یورپی مصنفین نے اسے اپنی کتابوں میں درج کیا ۔ اس طرح یورپ میں یہ روایت ابوالفرج ہی کے ذریعے سے پہنچی ۔ سب سے پہلے جس شخص نے اس واقعے سے انکار کیا وہ مسٹر گبن ہیں ۔ انھوں نے اس روایت پر باقاعدہ مؤرخانہ تنقید کی اور اس بارے میں کوئی واضح دلیل موجود نہ ہونے کے باعث اس روایت کی صحت پر اپنے شک و شبہہ کا اظہار کیا کیونکہ یہ روایت پہلی بار فتح اسکندریہ سے چھ سو سال بعد بیان کی گئی اور اس سے پہلے کسی شخص نے بھی اس واقعے کا ذکر اپنی کتاب میں نہیں کیا ۔ گبن کی اس رائے سے مؤرخین

یورپ چونک پڑے اور انھوں نے اس کے متعلق باقاعدہ تحقیقات شروع کر دی ۔ بڑی کد و کاوش کے بعد ان یورپی مؤرخین نے، جو کتب خانے کے جلائے جانے کے الزام کو اپنے هم مذهب عیسائیوں کے سر سے اتارنے اور اسے خواہ مخواہ مسلمانوں کے سر منڈھنا چاھتے تھے ، یہ دلیل پیش کی کہ اس روایت کو صرف ابوالفرج هی نے نہیں بلکہ مقریزی (جو ابوالفرج کی وفات سے ایک مدت بعد پیدا ھؤا ،) عبداللطیف بغدادی اور حاجی خلیفہ نے بھی ، جن کا شمار بڑے نامور اور معتبر عربی مؤرخین میں هوتا ھے ، اپنی کتابوں میں درج کیا ھے ۔ بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ابن خلدون نے بھی اس کا ذکر کیا ھے ۔

” علامہ شبلی لکھتے ھیں کہ جہاں تک ابن خلدون کا تعلق ھے ، اس کی تاریخ ایک عام اور مشہور کتاب ھے اور هر جگہ مل جاتی ھے ۔ جس شخص نے اسے دیکھا ھے اسے معلوم هوگا کہ اس میں کہیں بھی اس واقعے کا ذکر نہیں ۔ باقی رہ گئے دوسرے تین اشخاص تو اس سلسلے میں پہلی ضروری بحث یہ ھے کہ ان تینوں مصنفین کی درج کردہ روایت ایک هی روایت ھے یا تین جداگانہ اور مستقل شہادتیں ھیں ؟ سو مقریزی نے اپنی تاریخ میں ' عمودالسواری ' کے بیان میں حرف بحرف وہ عبارت نقل کر دی ھے جو اس مینار اور کتب خانے کے بارے میں عبداللطیف بغدادی نے اپنی کتاب میں لکھی ھے ، اس لیے مقزیری کا بیان کوئی مستقل شہادت نہیں هو سکتا ۔ اب صرف عبداللطیف اور حاجی خلیفہ باقی رہ جاتے ھیں ۔

” حاجی خلیفہ کی بیان کردہ عبارت میں کہیں اسکندریہ کے شہر کا نام نہیں آتا ۔ اس نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ھے وہ یہ ھے ” اهل عرب شروع اسلام میں تمام علوم میں سے سوا لغت ،

احکام شریعت اور طب کے کسی علم کی طرف توجہ نہ کرتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے اور اُن کے عقائد میں ابھی تک مضبوطی پیدا نہ ہوئی تھی، اس لیے اُنھیں خوف تھا کہ دیگر علوم سے ان کے عقائد اور اعمال میں خلل واقع نہ ہو اور وہ علوم اُن کے دلوں پر تسلط نہ حاصل کر لیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اُن لوگوں نے اپنی فتوحات کے دوران میں مفتوحہ شہروں میں جو کتابیں پائیں وہ نذر آتش کر دیں۔"

" حاجی خلیفہ کی اس عبارت سے بھی یورپی مؤرخین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کیونکہ اس میں اسکندریہ کا ذکر تک نہیں بلکہ عام طور پر کتابوں کے جلانے کا ذکر کیا ہے اور وہ بھی 'کہا جاتا ہے' کے الفاظ میں' جو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک عامیانہ روایت ہے۔ اس روایت کو پڑھنے سے کہیں بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مصنف اس واقعے کو واقعۂ مسلمہ قرار دیتا ہے۔

" اب صرف عبداللطیف بغدادی میدان میں رہ جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں 'عمودالسواری' کا ذکر کرتے ہوئے ضمناً کتب خانۂ اسکندریہ کی آتشزدگی کا ذکر کیا ہے۔ اس کی عبارت پڑھنے سے بھی یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس نے یہ روایت محض علیٰ سبیل التذکرہ بیان کر دی ہے اور یہ بھی منجملہ ان خرافات اور خلاف عقل بیانات کے ہے جو اس زمانے میں زبان زد خلائق تھے مگر جن کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ عبداللطیف نے اُن خلاف عقل باتوں کو تحریر کرتے وقت یہ روایت بھی درج کر دی لیکن اس میں کسی قسم کی صداقت نہیں۔"

اس کے بعد فاضل مؤلف نے وہ دلائل بیان کیے ہیں جن سے یہ امر مبرھن ہو جاتا ہے کہ اس کتب خانے کو نہ

عمرو بن العاص نے حضرت عمر کے حکم سے اور نہ کسی اور خلیفہ یا امیر نے آگ لگائی ، اور ثابت کیا ہے کہ یہ کتب خانہ اسلام سے قبل ہی جل کر خاکستر ہو چکا تھا ۔ آدھا جولیس قیصر رومی نے جلایا تھا اور بقیہ نصف اسلام سے قبل اسکندریہ کے پادریوں نے نذر آتش کر دیا تھا ۔

ابوالفرج کی روایت کے فرضی اور بناوٹی ہونے کا اعتراف بٹلر نے بھی کیا ہے ۔ اس نے لکھا ہے کہ کتب خانۂ اسکندریہ اسلامی فتوحات سے خاصی مدت قبل تباہ و برباد ہو چکا تھا ۔ اس ذیل میں اس نے ' امیانوس مارسلینوس ' کا یہ قول درج کیا ہے کہ سات لاکھ کتابوں پر مشتمل کتب خانہ اسکندریہ جولیس سیزر قیصر روم کے محاصرۂ اسکندریہ کے وقت مکمل طور پر تلف ہوگیا تھا ۔ اسی واقعے کی تائید ' اورازیوس* ' نے بھی کی ہے اور لکھا ہے کہ کتب خانہ مذکور جولیس سیزر کے محاصرے کے وقت جل چکا تھا ۔

پروفیسر اسماعیل رأفت بک لکھتے ہیں " ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ اس وقت (اسکندریہ کی فتح کے وقت) کتب خانہ مذکور موجود ہی نہ تھا ۔ اس کا ایک بڑا حصہ ۴۷ ق م میں جولیس سیزر کے لشکر نے بلا ارادہ جلا دیا تھا اور بقیہ حصہ بھی چار صدیوں کے بعد ۳۹۱ء میں اسقف تیوفیل کے حکم سے برباد کر دیا گیا کیونکہ عیسائی پادریوں کے نزدیک بت پرستوں کے ادب اور فلسفے کا مطالعہ کرنا حرام تھا ۔ اسی لیے ساری مملکت میں احکام

---

* ' اورازیوس ' وہ شخص ہے جس نے چوتھی صدی عیسوی میں اسکندریہ کی سیر کی تھی ۔ اس موقع پر اس نے کتب خانے کی تمام الماریوں کو بالکل خالی دیکھا تھا ۔

بھیج دیے گئے کہ کوئی شخص قدیم ادب اور فلسفے کی کتابیں نہ پڑھے - اسی زمانے میں ہر طرف سے اس کتب خانے پر پے در پے وار کیے جاتے رہے - یہ صورت حال دیکھ کر آخر 'جوتنیانوس' نے اثینا کے مدارس بند کر دینے کا حکم دے دیا ۔''

بٹلر نے یہ بھی لکھا ہے ، '' بدقسمتی یہ ہوئی کہ ابوالفرج نے اپنی بیان کردہ روایت میں حضرت عمر کی جانب جو جواب منسوب کیا ہے اسی قسم کا ایک حکم حضرت عمر ایران کی فتوحات کے دوران میں وہاں کی کتابوں کو جلانے کے متعلق دے چکے تھے ۔'' بٹلر کی اس عبارت پر حاشیہ لکھتے ہوئے پروفیسر بری لکھتے ہیں :

'' ایرانی بت‌پرستوں کی کتابوں سے مسلمانوں کا سلوک عیسائیوں کی کتابوں سے مختلف تھا کیونکہ وہ ایسی کتابوں کو ناپسند کرتے تھے جن میں اللہ کا نام ہو ۔''

حقیقت یہ ہے کہ ابوالفرج کی اس روایت کو کہ '' کتب خانے کی کتابیں اسکندریہ کے چار ہزار حماموں میں تقسیم کر دی گئیں اور وہاں مسلسل چھ ماہ تک ان سے پانی گرم کیا جاتا رہا'' جس جہت سے بھی دیکھا جائے اس کا بناوٹی اور جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہے - اگر عمرو بن العاص ایسے ہی سادہ مزاج انسان تھے کہ انھوں نے ان کتابوں کو حماموں کے (عیسائی مالکوں کے رحم کرم پر چھوڑ دیا تھا تو کیا یوحنا نحوی یا اس جیسے کسی اور کتابوں کے عاشق کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ حماموں کے مالکوں کی منت سماجت کر کے ان کتابوں کو سستے داموں خرید لیتا اور انھیں آگ کے شعلوں میں جلنے سے بچا لیتا؟ یقیناً یوحنا کے پاس اس قسم کے ذرائع تھے کہ اگر وہ ایسا کرتا

تو اسے کامیابی ہوتی ۔ ابوالفرج کی روایت میں سب سے زیادہ تعجب اور مضحکہ خیز حصہ وہ ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ کتابیں چار ہزار حماموں کو چھ ماہ تک کافی ہوئیں ۔ اگر فرض کیا جائے کہ ہر حمام میں کم از کم ایک سو کتابیں بھی روزانہ جلائی جاتیں (یہ تعداد بہت تھوڑی ہے کیونکہ اس زمانے میں کتابوں کا حجم بہت کم ہوتا تھا) تو تمام کتابوں کی تعداد ، جو چھ ماہ کے عرصے میں جلائی گئیں ، سات کروڑ بیس لاکھ بنتی ہے ۔ یہ تعداد کتب خانے کی کتابوں کی اصل تعداد سے تقریباً ایک سو تین گناہ زیادہ ہے ، سات لاکھ کتابیں تو چار ہزار حماموں کو ایک دن کے لیے بھی کافی نہیں ہو سکتیں ، چہ جائیکہ چھ ماہ کے لیے کافی ہوں ۔

اسماعیل رأفت بک اس امر کو ناممکن الوقوع سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں :

" کتب خانے میں جو کتابیں تھیں وہ ہرنی کے چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں ۔ ہر شخص بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ چمڑا آگ جلانے کے کام تو آ سکتا ہے لیکن بطور ایندھن کے استعمال نہیں ہوسکتا۔

بٹلر بھی اسی امر کی تائید کرتے ہوئا لکھتا ہے کہ "سراپیم کے کتب خانے میں جو کتابیں تھیں وہ چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں جسے قبطی کثرت سے اس غرض کے لیے استعمال کرتے تھے اور دوسری چیزوں پر لکھنے کے بجائے چمڑے پر لکھنے کو ترجیح دیتے تھے ۔"

بٹلر نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ یوحنا نحوی ، جس کا ذکر ابوالفرج نے اپنی روایت میں کیا ہے ، ۶۴۲ء میں اسکندریہ کی فتح کے وقت زندہ موجود ہی نہ تھا کیونکہ یوحنا مذکور

دیوسقوروس ، اور ساویرس اسقف انطاکیہ کی قائم کردہ اس جماعت کا آدمی تھا جو انھوں نے خلقدونی عقیدے کی مخالفت کے لیے قیصر جو سٹینن (۵۲۷ء) کے زمانے میں قائم کی تھی ۔ اس کی وفات اسکندریہ کے فتح ہونے سے تیس یا چالیس سال قبل ہو چکی تھی ۔

بٹلر نے یہ بھی لکھا ہے کہ سراپیم کا کتب خانہ ۳۹۱ء میں تباہ ہو چکا تھا اور اس کے کھنڈروں پر عیسائیوں نے گرجے تعمیر کر لیے تھے ۔ کتب خانے کے کھنڈروں میں اس کی بعض دیواریں باقی تھیں ۔ کچھ تعجب نہیں کہ عیسائیوں نے کتب خانے پر قبضہ کر کے بت پرستوں کے عقائد کی تمام کتابیں مکمل طور پر تلف کر دی ہوں اور علمی کتابیں قسطنطنیہ لے گئے ہوں ۔ ایسا ہونا اس لیے بھی بعید نہیں کہ عیسائیوں نے سراپیم کے ہیکل کو بھی تباہ کر کے اسے جلا کر خاکستر کر دیا تھا اور بت پرستوں کے بنائے ہوئے پتھر کے بتوں میں سے کسی کو بھی صحیح و سالم نہ چھوڑا تھا ۔

بٹلر کتب خانہ اسکندریہ پر بحث کا اختتام ان الفاظ سے کرتا ہے :

” ساری بحث کے بعد میں پھر یہی بات دہراتا ہوں کہ اس کتب خانے کا مسلمانوں کے ہاتھوں جلایا جانا قطعاً غلط اور محال ہے ۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ عرب گیارہ مہینے تک اسکندریہ پر قبضہ نہ کر سکے ۔ اس سارے عرصے میں سمندر کا راستہ رومیوں کے لیے کھلا رہا ۔ ان کے لیے اس راستے سے کتب خانے کو قسطنطنیہ یا کسی اور جگہ منتقل کرنا کچھ مشکل نہ تھا ۔ فتح کے بعد صلح نامہ لکھا گیا تو اس میں بھی یہ شرط رکھی گئی کہ

رومیوں کو اپنا سارا سامان سلطنت روم میں منتقل کرنے کی اجازت ہوگی ۔ اگر یوحنا کا وجود اس زمانے میں فرض کر بھی لیا جائے تو بھی کیا وہ اور اس جیسے دیگر علم دوست اشخاص اسلامی فتح سے پہلے یا فتح کے بعد اس شرط کے مطابق کتب خانے کو اسکندریہ سے منتقل نہ کر سکتے تھے ؟"

ہم نے کتب خانے کے جلائے جانے کے متعلق کئی مؤرخین کی آراء درج کر دی ہیں تاکہ ہم ان اقوال و آراء پر اچھی طرح بحث و تمحیص کر کے یہ ثابت کر سکیں کہ عمرو بن العاص کا حضرت عمر بن الخطاب کے حکم سے کتب خانے کو جلانا تو رہا درکنار ، اس زمانے میں یہ کتب خانہ موجود تک نہ تھا ۔ چنانچہ مندرجۂ بالاحوالوں سے صاف طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ اسکندریہ کی فتح کے بعد وہاں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے نذر آتش کیا جا سکتا اورعمروبن العاص اورحضرت عمر، ابوالفرج وغیرہ کے لگائے ہوئے الزام سے قطعاً بری ہیں ۔

د : منزل

(۱) تتمہ فتوحات مصر : بلاذری فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ قسطاط (بابلیون)فتح کرنے کےبعد عمروبن العاص نے عبداللہ بن حذافہ السہمی کو عین شمس کی طرف ، خارجہ بن حذافہ عدوی کو فیوم ، اشمونین ، اخمیم ، بشرودات* اور بالائی مصر کے دوسرے علاقوں کی طرف ، عمیر بن وہب جمحی کو تنیس ، دمیاط ،

* غالباً یہ وہی شہر ہے جس کا ذکر یاقوت حموی نے معجم البلدان میں ' بشرود ' کے نام سے کیا ہے ۔ اس شہر کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ یہ ریف کے علاقے میں ہے ۔

توته* ، دمیرہ † ، شطا ، دقہلہ‡ ، بنہا :: اور بوصیر:!: کی طرف

* تونه کے متعلق مرحوم علی مبارک پاشا لکھتے ہیں که یه مصر کے نواح میں ' دمیرہ ' کے قریب ایک جزیرہ ہے ۔

† یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ہیں که دمیرہ مصر کی ایک بڑی بستی ہے جو ' دمیاط ' کے قریب واقع ہے ۔ اس لیے ان دونوں شہروں کو ' دمیرتان ' کہتے ہیں ۔ یه دونوں دریائے نیل کے کنارے ایک دوسرے کے بالمقابل واقع ہیں ۔

‡ دقہله کے متعلق یاقوت حموی لکھتے ہیں " دقہله دریائے نیل کے ایک معاون دریا کے کنارے واقع ہے ۔ اس کے اور دمیاط کے درمیان چار فرسخ کا فاصله ہے ۔ دمیرہ یہاں سے سات فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے ۔ اس کا شمار مصر کے گنجان اور آباد شہروں میں ہوتا ہے ۔ یه اپنے ضلع کا صدر مقام بھی ہے جس کا نام بھی اس کے نام پر 'کورۂ دقہلیه ' ہے ۔"

:: بنہا کے متعلق یاقوت لکھتے ہیں " یه مصر کا ایک قدیم شہر ہے ۔ اس کے ضلع کا نام بھی اسی کے نام پر ' کورۂ بنہا ' ہے ۔" ابوالحسن مہلبی لکھتے ہیں که فسطاط اور بنہا کے درمیان اٹھارہ میل کا فاصله ہے ۔ بنہا ایک مشہور اور قدیم شہر ہے ۔"

:!: مرحوم علی مبارک پاشا لکھتے ہیں "مصر میں بوصیر نام کے چار شہر ہیں ۔ پہلا بوصیر سمنودیه کے ضلع میں ایک چھوٹا سا قصبه ہے ۔ دوسرا بوصیر ' فیوم ' تیسرا بوصیر ' جیزہ ' اور چوتھا بوصیر ' بہنسا ' ہے ۔ وہ بوصیر جو سمنودیه کے سامنے ہے اسے ' بوصیر بنا ' کہتے ہیں کیونکه وہ 'بنا ' کی بستی کے قریب ہے جو دریائے نیل کے مغربی کنارے پر واقع ہے ۔ ' بوصیر بنا ' اور ' بنا ' کے درمیان دو فرسخ کا فاصله ہے ۔

اور عقبہ بن عامر جہنی کو (بعض روایات کے مطابق اپنے غلام وردان کو) زیرین مصر کی طرف بھیجا ۔ یہ چاروں جرنیل کامیاب و کامران واپس آئے اور ان تمام شہروں پر جہاں قائدین کو بھیجا گیا تھا مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا ۔ عمرو بن العاص نے ان تمام علاقوں کی زمینوں کو خراجی زمینیں قرار دیا ۔ گو ان شہروں پر قبضہ حاصل کیا گیا تھا لیکن ان کے باشندوں کو ذمی قرار دیا گیا ۔ (فتوح البلدان بلاذری ، صفحہ ۲۲۴)

' فیوم ' کے متعلق سیوطی لکھتے ہیں کہ ایک سال تک یہ مسلمانوں کی نظروں سے پوشیدہ رہا ۔ مسلمان اس شہر کے متعلق کچھ بھی نہ جانتے تھے ۔ آخر ایک شخص نے عمرو بن العاص سے اس کا تذکرہ کیا اور اسے فتح کرنے کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی ۔ اس پر عمرو بن العاص نے اس شخص کے ساتھ ربیعہ بن حبیش بن عرفطہ صدفی کو اسے فتح کرنے کے لیے بھیجا ۔ وہاں کے باشندوں نے بلا مقابلہ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی ۔ (سیوطی جلد اول ، صفحہ ۶۲)

' دمیاط ' کے متعلق مقریزی لکھتے ہیں کہ اسے فتح کرنے کے لیے عمرو بن العاص نے مقداد بن اسود کو بھیجا ۔ اس جگہ کا حاکم مقوقس کا ایک ماموں (ھاموک) تھا ۔ اس نے مسلمانوں کی اطاعت قبول نہ کی اور ان کے خلاف جنگ کی تیاری شروع کر دی ۔ جنگ ہوئی جس میں اس کا بیٹا مارا گیا ۔ جب فتح کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ھاموک نے اپنے ساتھیوں اور اہل الرائے لوگوں کو بلایا اور ان سے مشورہ طلب کیا کہ اب کیا کیا جائے جس پر ایک عاقل و فرزانہ شخص اٹھا اور کہنے لگا :

" اے بادشاہ! عقل کا جوہر وہ شے ہے جس کی کوئی قیمت

بقرر نہیں کی جا سکتی - جس شخص کو عقل کی دولت مل جائے
اُس کی کامیابی میں کسی کو شبہہ نہیں ہوسکتا اورہلاکت کے راستے
اُس پر بند ہو جاتے ہیں - ان عرب لوگوں نے ابتداء سے کبھی
ناکامی کا منہ نہیں دیکھا - ان کا پھریرا ہمشیہ بڑی شان سے
میدان ہائے جنگ میں لہراتا رہا ہے اور کبھی ، کسی بھی
موقع پر ، سرنگوں نہیں ہؤا - جس ملک اور جس علاقے کی طرف
بھی ان کی نظریں اُٹھیں اُسے اُنھوں نے فتح کیے بغیر نہ چھوڑا -
بڑے سے بڑے جرار لشکر کو بھی ان کے مقابلے میں کامیابی
نصیب نہ ہوئی - ہم شام کے عظیم‌الشان لشکروں سے زیادہ
طاقت ور نہیں - جب وہ بھی ان کے سامنے نہ ٹھہر سکے تو ہم کس
شمار قطار میں ہیں - ان حالات کے پیش نظر میری رائے یہ ہے
کہ ہم ان سے صلح کر لیں - اس طرح ہمیں امن حاصل ہو جائے
گا ، ہمارے آدمیوں کا خون بے مصرف نہ بہے گا اور ہماری زمینیں
تباہ و برباد ہونے سے بچ جائیں گی -،،

مگر ہاموک کے سر پر مسلمانوں کو شکست دینے کا جن
سوار تھا - اس نے غضب ناک ہو کر اس آدمی کو قتل کرا
دیا - جب اُس شخص کے بیٹے کو یہ واقع معلوم ہؤا تو وہ رات
کے وقت اپنے مکان سے ، جو شہر پناہ سے بالکل ملا ہؤا تھا ،
نکل کر مسلمانوں کے کیمپ میں آیا اور اُنھیں شہر کے پوشیدہ
راستوں کا پتا بتا دیا - مسلمان اُن راستوں سے شہر میں داخل ہو
گئے - ہاموک کو اُس وقت مسلمانوں کی آمد کا پتا چلا جب
اُنھوں نے فصیل پر چڑھ کر تکبیر کے نعرے بلند کیے -

جب ہاموک کے بیٹے 'شطا ' نے دیکھا کہ مسلمان اب دم کے
دم میں شہر پر قابض ہؤا چاہتے ہیں تو وہ اپنے چند رفیقوں کے ساتھ
مسلمانوں سے آ کر مل گیا - اس واقعے سے ہاموک کی کمر ہمت

یکسر ٹوٹ گئی اور اس نے مسلمانوں کا مقابلہ کرنا بالکل بے سود جانا ۔ شطا نے مقداد بن اسود سے اپنے والد کے لیے امان حاصل کر لی ۔ مسلمان شہر پر قابض ہو گئے ۔ شہر پر پوری طرح تسلط حاصل کرنے کے بعد مقداد خود تو شہر کا نظم و نسق درست کرنے کے لیے وہیں ٹھہر گئے اور ایک قاصد کے ہاتھ عمرو بن العاص کو فتح کی خوشخبری بھجوا دی ۔(مقریزی جلداول ، صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴)

(۲) فتوحات برلس * ، دمیرہ † اشموم طناح ‡ ، تنیس ::

---

* 'برلس' کے متعلق علی مبارک پاشا لکھتے ہیں کہ یہ مصر کی سرحد پر سمندر کے قریب واقع ہے ۔ یہ بہت بڑی چھاؤنی تھی ۔ اس کے اردگرد کا علاقہ بھی جو برلس اورساحل بحر کے درمیان واقع تھا، خطۂ برلس کہلاتا تھا ۔ شہر بربس اس علاقے کا صدرمقام تھا ۔

† 'دمیرہ' بحیرۂ منزلہ پرتنیس کے قریب واقع تھا ۔' ابن دقماق' تنیس اور دمیاط کے ذیل میں اس کا بھی ذکر کرتے ہیں ۔ وہ لکھتے ہیں '' تنیس ، دمیاط اور شطا ، دبیق ، دمیرہ تونہ اور ان جزائر کے قریبی علاقوں میں سوتی کپڑا نہایت عمدہ اور نفیس بنا جاتا ہے اور یہ صنعت یہاں عروج پر ہے ۔'' عرب اس شہر پر تنیس اور دمیاط کے ساتھ ہی قابض ہوئے ۔

‡ ' اشموم طناح' کے متعلق ابن دقماق لکھتے ہیں کہ یہ قصبہ دقہلیہ کے علاقے میں مشرق نیل کی خلیج کے کنارے واقع ہے ۔ دریا کی یہ شاخ سلطان ملک الظاہر بیبرس البندقداری الصالحی کے حکم سے کھدوائی گئی تھی ۔ یہ شہر اپنے حماموں ، بازاروں ، مسجدوں اور سراؤں کی وجہ سے مشہور ہے ۔

:: مقریزی اور ابن دقماق نے ' تنیس' کا ذکر بڑی تفصیل سے

باقی صفحہ ۱۸۶ پر

اور شطا * : مقریزی لکھتے ہیں کہ دمیاط کی فتح کے بعد شطا نے اسلامی فوج میں شامل ہو کر مردانگی کے جوہر دکھانے شروع کیے - وہ اسلامی فوج کے ہمراہ برلس ، دمیرہ اور اشموم طناح کی بستیوں میں آیا - اس علاقے کے باشندوں نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی اور وہ مسلمانوں کے لیے بڑی تقویت کا موجب ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ تنیس کی فتح کے لیے روانہ ہؤا - اہل شہر نے لڑائی کے لیے تیاری کر رکھی تھی - وہ مقابلے پر نکل آئے اور خوب زور شور کی لڑائی ہوئی جس میں شطا نے بھی جام شہادت نوش کیا - نعش کو دمیاط لا کر شہر سے باہر دفن کر دیا گیا - اس کی شہادت وسط شعبان میں جمعہ کی رات کو ہوئی تھی - ہر سال مقررہ تاریخوں میں اس کی قبر پر ' عرس ' منایا جاتا ہے -

---

بقیہ حاشیہ : صفحہ ١٨٤
کیا ہے - مقریزی لکھتے ہیں کہ یہاں کے باشندے بہت امیر کبیر ہیں - کپڑے کی صنعت یہاں عروج پر ہے اور نہایت نفیس کپڑا تیار کیا جاتا ہے - یہاں خلفاء کے لیے ایک خاص کپڑا تیار کیا جاتا تھا جسے ' بدنہ ' کہا جاتا تھا - اس کپڑے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں سوت صرف ایک چھٹانک کے قریب ہوتا تھا اور باقی کپڑا سونے کے مضبوط اور مہین تاروں سے تیار کیا جاتا تھا - اس کپڑے کے تھان کی قیمت ایک ہزار دینار ہوتی تھی -

* شطا کا شہر تنیس اور دمیاط کے قریب واقع ہے - یہ بھی کپڑے کی صنعت کے باعث مشہور تھا - خانۂ کعبہ کو جو غلاف بھیجا جاتا تھا وہ شطا ہی میں تیار کیا جاتا تھا -

مقریزی یہ بھی لکھتے ہیں کہ تنیس کا حاکم ایک شخص ' ابوثور' نامی تھا جو عرب عیسائیوں میں سے تھا ۔ دمیاط کی فتح کے بعد جب مسلمان تنیس کی طرف بڑھے تو وہ بیس ہزار عرب عیسائیوں ، قبطیوں اور رومیوں کے ساتھ میدان جنگ میں مسلمانوں کے مقابلے کے لیے نکلا ۔ دوران جنگ میں ' ابو ثور ' کو مسلمانوں نے گرفتار کر لیا ۔ اس کے ساتھیوں کو شکست ہوئی اور مسلمان فاتحانہ شہر میں داخل ہو گئے ۔

ابوثور ، جس کا ذکر مقریزی اور ابن دقماق وغیرہ نے کیا ہے ، ہماری رائے میں ایک فرضی شخص ہے کیونکہ اُن دونوں کا بیان ہے ، یہ شخص عرب عیسائیوں میں سے تھا ۔ لیکن کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ ان عرب عیسائیوں نے اسلامی فتوحات کے دوران میں مسلمانوں سے لڑنے کے لیے اشتراک عمل کیا ہو ۔

رومی لشکر کی تعداد کے بارے میں بھی ان مؤرخین نے غلطی کھائی ہے ۔ ہمارے خیال میں تنیس کی محافظ فوج کی تعداد صرف دو ہزار تھی نہ کہ بیس ہزار ۔ اس کے دو سبب ہیں :

(۱) تاریخ مصر اسلامی فتوحات کے کم از کم دو سو سال بعد مدون ہوئی ۔

(۲) ان قبطی مؤرخین نے ، جو اسلامی فتوحات کے وقت موجود تھے ، اپنی کتابوں میں نہ ' ابوثور ' کا ذکر کیا ہے نہ اس کی بیس ہزار فوج ہی کا ۔ ڈاکٹر بٹلر بھی ہماری اس رائے کی تائید کرتے ہیں ۔

شطا کے بارے میں بٹلر نے یوحنا اسقف نقیوس کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ شہر اسلامی فتوحات سے بہت پہلے بھی اسی نام سے

مشہور تھا ۔ اس کا نام ھاموک کے بیٹے شطا کے نام پر نہیں رکھا گیا ۔ ھو سکتا ھے بٹلر کی یہ بات درست ھو ۔ پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ھاموک کا ایک بیٹا شطا نامی ضرور تھا جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وہ عربوں کی فوجوں میں شامل ھوکر مسلمانوں کے دشمنوں سے بڑی بہادری اور شجاعت سے لڑا تھا ۔

(۳) مصر کی فتح صلح سے ھوئی یا بزور شمشیر* : مؤرخین میں فتح مصر سے متعلق اختلاف ھے کہ آیا وہ صلح کے ذریعے سے فتح ھؤا تھا یا بزور شمشیر ۔

ھم اوپر صلح کی ان شرائط کا ذکر کر آئے ھیں جو عمرو بن العاص اور مقوقس کے درمیان طے پائی تھیں ۔ ذیل میں ھم اختصار سے اس موضوع پر مؤرخین کی بیان کردہ متضاد اور متبائن روایات درج کرتے ھیں تاکہ ھمارے لیے یہ معلوم کرنا آسان ھو جائے کہ مصر صلح کے ذریعے سے مسلمانوں کے قبضے میں آیا یا بزور شمشیر ۔ اس سلسلے میں چند امور قابل غور ھیں :

(۱) اس معاھدے سے ، جو بابلیون کے محاصرے کے ایک ماہ بعد (جب مقوقس نے صلح اور ادائے جزیہ پر آمادگی ظاھر کی تھی) عمرو بن العاص اور مقوقس کے درمیان طے پایا تھا ، یہ واضح ھوتا ھے کہ عمرو بن العاص نے اھل مصر کو وھی مراعات دینے پر آمادگی ظاھر کی تھی جو عموماً صلح کے ذریعے سے

* اس ضمن میں جہاں کہیں یہ الفاظ آئے ھیں ان سے مراد صرف یہ ھے کہ آیا اھل مصر سے ذمیوں کا سا سلوک کیا گیا یا حربیوں جیسا ۔ ویسے تو اکثر شہر بزور شمشیر ھی فتح کیے گئے ۔ (مترجم)

زیر ہونے والے علاقوں کے لوگوں کو دی جاتی ہیں ۔ آپ نے اپنے اس عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ آپ نے مصر کی فتح صلح کے ذریعے سے تسلیم کر لی تھی ۔ لیکن ساتھ ہی جب اس واقعے پر نظر ڈالی جائے کہ ہرقل نے یہ شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا اور رومی فوج برابر قلعے کے دفاع کے لیے کوشاں رہی تھی تو بظاہر یہ فتح بزور شمشیر ماننی پڑتی ہے ۔ تاہم رومی چونکہ بالآخر وہی شرائط قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے جو قبل ازیں مسلمانوں اور مقوقس کے درمیان طے پا گئی تھیں اور حضرت عمر نے بھی ان ہی شرائط پر صلح کرنے کی اجازت دے دی تھی اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ لازماً قلعہ صلح کے ذریعے سے فتح ہؤا اور مذکورہ عہد نامے کی شرائط کا اطلاق تمام اُن مصریوں پر ہوتا تھا جن پر اداء جزیہ فرض اور لازم تھا ۔

(۲) جہاں تک اسکندریہ کی فتح کا تعلق ہے اس کے باشندوں نے شہر پر عمرو بن العاص کا پورا قبضہ ہونے سے پیشتر ہی مسلمانوں کی اطاعت قبول کرلی تھی اور اداء جزیہ کے لیے آمادہ ہوگئے تھے ۔ عمرو بن العاص نے بھی شہر کا مال غنیمت مسلمانوں میں تقسیم کرنے اور شہر والوں کو لونڈی غلام بنانے کے بجائے عہدنامہ کر کے ان پر جزیہ لگا دیا تھا ۔ بعد میں جب رومیوں نے معاہدۂ صلح توڑ دیا اور مسلمانوں کے مقابلے کے لیے تیار ہونے لگے تو عمرو بن العاص بابلیون سے اسکندریہ لوٹے اور اسے فتح کر کے دوبارہ قبضے میں کر لیا ۔ چونکہ اس کی دوبارہ فتح بزورشمشیر عمل میں آئی اس لیے آپ نے وہاں کے باشندوں کا مال مسلمانوں میں تقسیم کرنا چاہا لیکن حضرت عمر نے انھیں ایسا کرنے سے منع کر دیا اور حکم دیا کہ اسکندریہ والوں سے وہی سلوک کیا جائے جو دیگر مصریوں سے کیا گیا ہے ۔ اس حکم

کے مطابق جب عمرو بن العاص نے جزیہ لگانے کے لیے شہر کے لوگوں کی مردم شماری کرائی تو اداء جزیہ کے قابل لوگ تین لاکھ کی تعداد میں نکلے چنانچہ اُن پر جزیہ لگا دیا گیا اور انھیں خراج ادا کرنے کا حکم دیا گیا ۔

(۳) عمرو بن العاص نے جب بلہیب *، سلطیس اور قرطیا وغیرہ بستیوں پر قبضہ کیا تو وہاں کے باشندوں کو رومیوں کی اعانت کرنے اور عربوں کی مخالفت میں جنگ کرنے کی وجہ سے قیدی بنا لیا اور انھیں مدینہ روانہ کر دیا ۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو حضرت عمر نے انھیں واپس بھیج دیا اور انھیں بھی اہل جزیہ میں شمار کرنے کا حکم دیا ۔

علامہ بلاذری مصر کی فتح صلح کے ذریعے سے مانتے ھیں چنانچہ وہ عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ایسی ھی روایت بیان کرتے ھیں ۔ ابن عبدالحکم مختلف راویوں سے مختلف روایتیں بیان کرتے ھیں ۔ لیث سے روایت بیان کرتے ھوئے وہ لکھتے ھیں کہ سوا اسکندریہ کے، جو بزور فتح ھؤا، باقی سارے مصر کی فتح صلح کے ذریعے سے عمل میں آئی ۔ ھشام بن اسحاق عامری سے انھوں نے جو روایت بیان کی ھے اس میں مذکور ھے کہ عمرو بن العاص اور اھل مصر کے درمیان چھ شرطوں پر مصالحت ھوئی تھی :

---

* یاقوت حموی معجم البلدان میں لکھتے ھیں کہ 'بلہیب' مصر کی ایک بستی ھے ۔ عمرو بن العاص نے اس بستی کے لوگوں سے خراج اور جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی تھی، باوجودیکہ بلہیب، خیس، قرطیا اور سخا کے باشندوں نے مسلمانوں کے خلاف رومیوں کی مدد کی تھی ۔

(۱) اهل مصر گھروں سے نہ نکالے جائیں گے ۔
(۲) اُن کی عورتوں کو لونڈیاں نہ بنایا جائے گا ۔
(۳) اُن کا مال اسباب اُنھیں کے پاس رہنے دیا جائے گا ۔
(۴) اُن کی زمینیں چھینی نہ جائیں گی ۔
(۵) جزیے کی شرح میں زیادتی نہ کی جائے گی ۔
(۶) دشمنوں کے حملوں سے اُن کی حفاظت کی جائے گی ۔

اس معاہدے کے رو سے سارے مصر کی سرزمین خراجی قرار پائی ۔ مسلمانوں نے اپنے وعدے کے مطابق نہ ان سے مال غنیمت حاصل کیا اور نہ ان کے بیوی بچوں کو غلام بنایا ۔(ابن عبدالحکم صفحہ ۷٦ - ۷۹ ، مقریزی جلد اول ، صفحہ ۲۹۴)

ابن عبدالحکم اور مقریزی نے بعض راویوں کے حوالے سے ایسی روایات بھی درج کر دی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کی فتح بزور شمشیر عمل میں لائی گئی ۔ چنانچہ مقریزی ، ابن لہیعہ اور زید بن اسلم سے روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر کے پاس ایک صندوق تھا جس میں وہ تمام عہد نامے محفوظ تھے جو مسلمانوں نے مفتوحہ اقوام سے کر رکھے تھے ، لیکن اُن میں کوئی ایسا عہد نامہ نہ تھا جو مصریوں سے کیا گیا ہو ۔

ابن عبدالحکم یحیی بن عبداللہ بن بکیر سے روایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابوسلمہ بن عبدالرحمن کشتی کے ذریعے سے اسکندریہ روانہ ہوئے ۔ اُنھیں کشتی چلانے کے لیے ایک ملاح کی ضرورت پڑی ۔ اس غرض سے اُنھوں نے ایک قبطی کو بیگار میں پکڑ لیا ۔ جب لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے اس غریب کو بیگار میں کیوں پکڑا ہے تو اُنھوں

نے جواب دیا " یہ لوگ بمنزلہ غلاموں کے ہیں اس لیے اگر ہمیں ضرورت پڑے تو انھیں بیگار میں پکڑ سکتے ہیں۔"

مقریزی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عمرو بن العاص نے فرمایا میں مصر کا فاتح ہوں اور کسی قبطی سے میرا کوئی عہد اور وعدہ نہیں۔ مقریزی یحییٰ بن بکیر سے یہ روایت بھی بیان کرتے ہیں کہ مصر کا کچھ حصہ صلح کے ذریعے سے فتح ہؤا اور کچھ حصہ بزور شمشیر لیکن حضرت عمر بن الخطاب نے تمام اہل مصر کو ذمی قرار دے دیا۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ عربوں نے رومیوں سے باقاعد مقابلوں کے بعد بزور شمشیر مصر کو زیرنگیں کیا خصوصاً فرما، بلبیس، ام دنین اور اسکندریہ جہاد و قتال کے بعد ہی مسلمانوں کے قبضے میں آئے لہذا جن مؤرخین نے بزور شمشیر مصر فتح کرنے کا ذکر کیا ہے اگر ان کے بیانات کا مطلب یہ لیا جائے کہ جہاں تک فتوحات کا تعلق ہے (قطع نظر اس کے کہ بعد میں مصر کے باشندوں سے کس قسم کا سلوک کیا گیا) وہ بزورشمشیر ہی عمل میں آئیں تو انھیں تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

پھر بھی ہم اس عہد نامے سے اغماض نہیں برت سکتے جو عمرو بن العاص اور مقوقس کے درمیان ہؤا تھا اور جسے طبری، ابن عبدالحکم، بلاذری، مقریزی، مسعودی وغیرہ متعدد بلند پایہ مؤرخین نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس عہد نامے کا پاس کرتے ہوئے عمرو بن العاص نے مصر کے اموال غنیمت کی تقسیم اس وقت تک کے لیے روک دی تھی جب تک تمام حالات کی اطلاع حضرت عمر کو دے کر ان سے ہدایات حاصل نہ کر

لی جائیں ۔ حضرت عمر نے اہل مصر کو ذمی قرار دیا اور ان سے جزیہ اور خراج وصول کرنے کا حکم دیا۔ آپ نے عمروبن العاص کو لکھا کہ مصر کا جس قدر علاقہ تم فتح کر چکے ہو اسے خراجی قرار دو اور یہ سمجھ لو کہ تم نے صلح کے ذریعے سے اسے قبضے میں لیا ہے لہٰذا مسلمانوں کے لیے وہاں مال غنیمت اور خمس حاصل کرنا درست نہیں ۔

مصریوں سے اس قدر نرمی کا سلوک کر کے حضرت عمر بن الخطاب اور عمرو بن العاص دونوں نے بے نظیر فرزانگی اور اعلیٰ سیاست کا ثبوت دیا ۔ اگرچہ مصریوں نے اکثر مقامات پر مسلمانوں کا سخت مقابلہ کر کے انھیں شدید مشکلات میں مبتلا کیا تھا لیکن اس کے باوجود ان سے مفتوحین کا سا سلوک نہ کر کے بلکہ انھیں ذمی قرار دے کر مسلمانوں نے ان کے دل موہ لیے اور وہ دل و جان سے ان کی اطاعت اور خدمت گزاری کے لیے تیار ہو گئے ۔

جہاں تک ابومسلمہ بن عبدالرحمٰن کے ایک قبطی کو بیگار میں پکڑ لینے کے واقعے کا تعلق ہے یہ محض ایک انفرادی واقعہ ہے اور اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مصریوں کو حربی مفتوحین کے زمرے میں رکھا گیا تھا ۔ ان کا فعل نہ دوسرے لوگوں کے لیے حجت تھا اور نہ ان روایات کے متناقض کہ مصر کی فتح بذریعۂ صلح قرار دی گئی تھی اور مصریوں کو ذمیوں اور اہل صلح کے زمرے میں شمار کیا گیا تھا ۔

تمام روایات کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں ، یحییٰ بن خالد کی یہ روایت سب سے زیادہ حقیقت کے قریب ہے کہ مصر کا کچھ حصہ صلح کے ذریعے سے فتح ہوا اور کچھ حصہ بزور شمشیر ، لیکن حضرت عمر بن الخطاب نے تمام

اہل مصر کو ذمی قرار دے دیا۔ حضرت عمر نہ چاہتے تھے کہ ایک قوم ، جو سینکڑوں سال سے رومیوں کے ہاتھوں مظالم اور مصائب کی چکی میں بری طرح پس رہی تھی ، آئندہ بھی اپنے نئے فاتحین کی غلامی میں زندگی بسر کرے اور اس طرح مسلمانوں کے لیے بھی اس کے دل میں نفرت و حقارت کے وہی جذبات موجزن ہوں جو اس سے قبل رومیوں کے لیے تھے ۔ اس لیے آپ نے حکم دے دیا کہ جزیے کی ایک قلیل رقم عائد کرنے کے سوا ان کے اموال و جائداد ، اراضیات اور اہل و عیال سے قطعاً کوئی تعرض نہ کیا جائے اور وہ بدستور انہیں کے ہاتھوں میں رہنے دیے جائیں ۔ ان احکام کا نتیجہ خاطرخواہ نکلا اور مصری اپنے نئے حاکموں کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات رکھنے کے بجائے ان پر صدق دل سے جانیں چھڑکنے لگے ۔

۷ : فتوحات کا آخری دور

(۱) فتح برقہ و طرابلس : عمرو بن العاص کی عالی ہمتی اور اولوالعزمی مملکت فراعنہ کی فتح اور وہاں سے رومیوں کے اخراج ہی تک محدود نہ رہی بلکہ آپ نے آگے بڑھ کر بلاد مغرب پر بھی دھاوا بولنا چاہا ۔ بلاد مغرب کی طرف پیش قدمی کرنے میں زیادہ تر یہ جذبہ کار فرما تھا کہ وہ رومی مقبوضات ختم کر دیے جائیں جو مصر کے مغرب میں واقع تھے تاکہ اگر رومیوں کو اپنی مملکت واپس لینے کا خیال آئے تو مصر مغربی سمت سے ان کے حملوں سے محفوظ رہ سکے ۔

اسکندریہ فتح کرنے کے بعد عمرو بن العاص فوج لے کر

صحراء قطع کرتے ہوئے برقه * پہنچے جو غربی جانب سے مصر کی آخری حد پر واقع تھا - آپ نے اسے فتح کیا اور اس کے باشندوں سے تیرہ ہزار درہم سالانہ جزیے پر صلح کر لی - اس واقعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے آسے بزور شمشیر نہیں بلکہ صلح کے ذریعے سے فتح کیا - سیوطی (جلد اول ، صفحہ ۶۳) اور ابن دقاق (جلد اول ، صفحہ ۴) وغیرہ بھی ہماری رائے کی تائید کرتے ہیں -

برقه سے عمرو بن العاص نے عقبہ بن نافع کو زویلہ کی جانب بھیجا - آپ نے برقه سے زویلہ تک کا سارا علاقہ فتح کر لیا - اس کے بعد عمرو بن العاص بھی فوج لے کر ۲۲ھ (مئی ۶۴۳ء) میں طرابلس † روانہ ہوئے - اس کا قلعہ برقه کے قلعے سے بہت زیادہ مضبوط اور مستحکم تھا - یہاں ایک بھاری فوج بھی مقیم تھی جس نے پورے ایک مہینے تک مسلمانوں کو قلعے میں داخل

* علی مبارک پاشا لکھتے ہیں کہ رومیوں نے برقه کا نام ' بنطا پولیس ' رکھا تھا جس کے معنی ہیں ' پانچ شہر ' - برقه صحرائے سرخ میں واقع ہے - یہاں سے مصر کو شہد اور تانبا بھیجا جاتا تھا -

† بلاذری اور ابن دقاق نے اسے ' اطرابلس ' لکھا ہے اور علی مبارک پاشا نے طرابلس - طرابلس کے معنی ہیں ' تین شہر ' - مکیری لکھتے ہیں کہ طرابلس سمندر کے کنارے واقع ہے ، اس کی فصیل پتھر کی ہے - یہاں جامع مسجد ، متعدد بڑے بڑے بازار اور حمام ہیں - اس کے گرد و نواح میں پھل کثرت سے پیدا ہوتے ہیں -

ہونے سے روکے رکھا *۔

جب یہاں کے باشندے بھوک اور لڑائی کی شدت سے بالکل بے حال ہو گئے تو عربوں کو سمندر کی راہ سے شہر میں داخل ہونے کا موقع مل گیا کیونکہ اس جانب کوئی دیوار نہ تھی۔ طرابلس کی فتح کے بعد آپ برقہ واپس آ گئے اور قبیلہ لواتہ کو مطیع کیا جو اس علاقے کے اکثر حصے میں آباد تھا۔

برقہ سے آپ نے حضرت عمر کو ایک خط لکھا:

"ہم طرابلس تک پہنچ گئے ہیں۔ ہمارے اور افریقہ (تونس) کے درمیان صرف نو دن کی مسافت ہے۔ اگر امیرالمومنین کی اجازت ہو تو ہم افریقہ پر بھی چڑھائی کر دیں......"

لیکن حضرت عمر نے انہیں آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی اور فتوحات کے سلسلے کو طرابلس ہی پر ختم کرنے کی ہدایت کی۔ اس پر مجبوراً عمرو بن العاص کو رک جانا پڑا اور عقبہ بن نافع الفہری کو اس علاقے کی دیکھ بھال کے لیے وہاں چھوڑ کر خود مصر واپس آ گئے۔

حضرت عمر کا عمرو بن العاص کو آگے بڑھنے کی اجازت نہ دینا بہت بڑی دوراندیشی پر مبنی تھا کیونکہ اگر عمرو بن العاص اپنے قلیل لشکر اور بہت ہی تھوڑے سامان جنگ کے ساتھ اس

* یاقوت حموی لکھتے ہیں کہ محاصرہ تین مہینے جاری رہا لیکن ابن خلدون کے نزدیک محاصرے کی مدت صرف ایک مہینا ہے۔ ابن عبدالحکم لکھتے ہیں کہ یہ ۲۳ھ میں فتح ہؤا۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو اس کے معنی ہیں کہ طرابلس کی فتح برقہ کی فتح سے خاصی مدت بعد وقوع میں آئی۔ ہاں اگر برقہ کی فتح ۲۲ھ کے اواخر میں مانی جائے تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

طویل و عریض علاقے میں داخل ہو جاتے تو اُن کی قوت بہت تھوڑی مدت میں ختم ہو جاتی ۔ اس صورت میں سب سے بڑا خطرہ یہ لاحق ہوتا کہ جب رومی دیکھتے ، عمرو بن العاص اپنے لشکر کے ہمراہ مصر سے کافی فاصلے پر دشمنوں سے بر سر پیکار ہیں اور مصر کی حفاظت کے لیے بہت ہی تھوڑی فوج باقی ہے تو وہ فوراً حملہ کر کے بڑی آسانی سے مصر پر دوبارہ قابض ہو جاتے۔ لیکن حضرت عمر نے اپنی بے نظیر سیاست کو کام میں لاتے ہوئے عمرو بن العاص کو آگے بڑھنے سے روک کر جہاں ان کی فوج کو تباہ و برباد ہونے سے بچا لیا وہاں مصر کو بھی دوبارہ رومیوں کے قبضے میں جانے سے محفوظ کر لیا* ۔

(۲) نوبہ کی جانب پیش قدمی : بلاد مغرب پر مسلمانوں کے قبضے سے یہ خدشہ دور ہو گیا کہ کہیں اس جانب سے رومی حملہ کر کے مصر میں مسلمانوں کی حکومت کو ضعف نہ پہنچائیں ۔ اب صرف ایک جہت اور باقی رہ گئی تھی جہاں سے مسلمانوں کو رومیوں کے حملوں کا خوف لاحق ہو سکتا تھا ، وہ تھی مصر کی جنوبی سمت ۔ عمرو بن العاص نے اس خطرے کا سدباب کرنے کا بھی ارادہ کیا ۔ اس غرض سے آپ نے نافع بن عبدالقیس القہری (عاص بن وائل کے سوتیلے بھائی) کو روانہ کیا ۔ وہ جا کر وہاں کے باشندوں سے برسرپیکار ہو گئے لیکن انہوں نے ڈٹ کر مسلمانوں کا مقابلہ کیا اور انہیں اپنے علاقے پر قابض نہ ہونے دیا ۔ عمرو بن العاص کے زمانۂ امارت میں یہ علاقہ فتح نہ ہو سکا ۔ حضرت عثمان کے زمانے میں جب عبداللہ بن سعد ،

* فتوح البلدان بلاذری (صفحہ ۲۳۳)، تاریخ یعقوبی (جلد اول، صفحہ ۲۳۳)

عمرو بن العاص کی جگہ ، مصر کے والی بنائے گئے تو انھوں نے ۳۱ھ میں یہاں کے باشندوں سے صلح کر کے اس علاقے کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا * ۔

(۳) اسکندریہ پر رومیوں کا حملہ اور شکست : رومیوں کے دلوں سے وہ خلش دور نہ ہوسکی جو مصر کے چھن جانے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی ۔ وہ مصر پر حملہ کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے ۔ ادھر مصر کے باشندوں میں بھی ایک طبقہ ایسا تھا جس نے دامن اُمید رومیوں سے وابستہ کر رکھا تھا ۔ ۲۵ھ میں جب حضرت عثمانؓ کو مسند خلافت سنبھالے ہوئے دو سال گزر چکے تھے ، رومیوں نے موقع دیکھ کر اسکندریہ پر حملہ کر دیا † ۔

بعض مؤرخین نے اس حملے کا سبب یہ بتایا ہے کہ ' اخنا ' کا رئیس ' طلما ' عمرو بن العاص کے پاس آیا اور آپ سے عرض کی کہ جزیے کی شرح میں اضافہ کر دیا گیا ہے ، اسے کم کر دیا جائے ۔ آپ نے اس کی درخواست نامنظور کر دی ۔ اس پر وہ ناراض ہو کر رومیوں سے جا ملا اور انھیں مصر پر حملہ آور ہونے پر آمادہ کر لیا ۔ رومیوں کی جمیعت مسلمانوں کے مقابلے

* مسلمانوں نے اہل نوبہ سے صلح کی جو شرائط طے کی تھیں وہ متعدد تھیں ۔ ان کی تفصیل سٹینلے لین پول نے عربی تاریخوں سے لے کر اپنی کتاب A History of Egypt in the Middle Ages میں درج کی ہے ۔

† جو مؤرخین اس سنہ پر متفق ہیں وہ یہ ہیں (۱) بلاذری (۲) ابن اثیر (۳) ابوالمحاسن (۴) مقریزی (۵) سیوطی (۶) یعقوبی (۷) بٹلر (۸) سٹینلے لین پول ۔

میں آئی لیکن اسے شکست فاش اٹھانی پڑی - طلما کو گرفتار کر کے عمرو بن العاص کے سامنے پیش کیا گیا - آپ نے لوگوں کے اس اصرار کے باوجود کہ اسے نقص عہد کے جرم کی پاداشی میں قتل کر دیا جائے اس کی جان بخشی کر دی - طلما نے اداء جزیہ کا اقرار کیا اور کہا کہ اگر میں عہد شکنی کے جرم میں ھرقل کے سامنے پیش ھوتا تو وہ مجھے ضرور قتل کر دیتا -

ھمارے خیال میں یہ روایت بالکل بے بنیاد ھے کیونکہ عمرو بن العاص نے اپنے زمانۂ امارت میں کبھی خراج اور جزیے کی شرح میں اضافہ نہیں کیا جس سے قبطیوں کو ناراض ھونے کا موقع ملا ھو -

رومیوں کے حملے کا اصلی سبب ھمارے خیال میں وہ ھے جو ابن اثیر نے بیان کیا ھے - ابن اثیر کہتے ھیں کہ اھل اسکندریہ نے قسطنطین ، شہنشاہ روم ، کو لکھا کہ اسکندریہ پر حملہ کرنے کا یہ موقع نہایت اچھا ھے کیونکہ اس وقت اسکندریہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ھے - مصر کے ھاتھ سے نکل جانے کا زخم رومیوں کے دلوں سے مندمل نہ ھؤا تھا اس لیے شہنشاہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور فوجوں کو فوراً تیار ھونے کا حکم دے دیا - ' طی الکتان ' میں اسکندریہ پر چڑھائی کرنے کے لیے ایک بحری بیڑا موجود تھا - رومی اپنے بیڑوں کی وجہ سے سمندر کے سردار شمار ھوتے تھے اور کوئی قوم اس میدان میں ان کا ھم پلہ ھونے کا دعویٰ نہ کر سکتی تھی -

رومی فوج کی قیادت ایک بطریق ' مانویل خصی ' کے سپرد تھی - وہ تین سو کشتیوں پر مشتمل بحری بیڑے کے ھمراہ رات کے وقت اسکندریہ پہنچا اور اس پر قابض ھوگیا - عمرو بن العاص کو جب اس حملے کا حال معلوم ھؤا تو وہ اپنے قدیم راستے سے

اسکندریہ کی جانب روانہ ہوئے - آپ کے ساتھ بے شمار قبطی بھی تھے -

اسکندریہ پر قابض ہونے کے بعد مانویل نے فوج کے ہمراہ مصر کی سرزمین میں یلغار شروع کردی - اس کے ساتھ عہدشکنی کرنے والے قبطیوں کی بھی معقول تعداد تھی - یہ لوگ بستیوں میں جاتے اور لوگوں کے کھانے پینے کی چیزیں ، مویشی اور دیگر سامان لوٹ لیتے - وہاں کے باشندے اپنے اندر مقابلے کی طاقت نہ رکھنے کے باعث خاموش ہو رہتے اور کچھ نہ کر سکتے - اسی طرح لوٹ مار کرتے ہوئے مانویل نقیوس پہنچ گیا جہاں عمرو بن العاص کے لشکر سے اس کی مڈ بھیڑ ہوئی* - خشکی اور تری † ، دونوں جگہوں میں زبردست جنگ ہوئی - تیروں کی بارش میں عمرو بن العاص کا گھوڑا بھی مارا گیا - آپ اس کی پیٹھ سے کود پڑے اور پیدل ہی لڑنا شروع کر دیا - رفتہ رفتہ مسلمان رومیوں پر دباؤ ڈالنے لگے اور اس بے جگری سے لڑے کہ رومیوں کو شکست کھا کر اسکندریہ کی طرف بھاگتے ہی بن پڑی - ان کا سردار مانویل مارا گیا - عمرو بن العاص نے اسی پر بس نہ کی بلکہ اسکندریہ کی طرف بھاگنے والی فوج کا پیچھا کیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا -

محاصرے نے زیادہ طول نہ کھینچا - مسلمان شدید مقابلہ کرنے کے بعد شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے اور رومیوں کو

---

* بلاذری کی روایت کے بموجب مسلمانوں کے لشکر کی تعداد پندرہ ہزار تھی - اس کے مقابلے میں رومیوں کی فوج کئی گنا بڑی تھی -

† تری سے مراد وہ دریا ہے جو نقیوس کے پاس سے گزرتا ہے -

سخت ہزیمت اٹھا کر بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا * ۔

عمرو بن العاص نے قسم کھائی تھی کہ اگر اللہ نے انھیں رومیوں پر فتح عطا فرما دی تو وہ اسکندریہ کی فصیل منہدم کرا دیں گے ۔ چنانچہ فتح کے بعد انھوں نے پہلا کام یہی کیا کہ شہر کی فصیل منہدم کرا دی اور آئندہ کے لیے اس بات کا کوئی خطرہ نہ رہا کہ دشمن یہاں قلعہ بند ہو سکے گا ۔

---

* اکثر مؤرخین مثلاً مقریزی اور سیوطی وغیرہ نے لکھا ہے کہ رومیوں کے حملے کے موقع پر مقوقس فرمانبردار قبطیوں کے ہمراہ عمرو بن العاص کے پاس آیا اور عہد شکنی کرنے والے قبطیوں سے بیزاری اور علحدگی کا اظہار کیا ۔ لیکن یہ درست نہیں کیونکہ مقوقس اس واقعے سے بہت پہلے انتقال کر چکا تھا ، غالباً ان کی مراد بنیامین سے ہے جو مقوقس کی طرح اس زمانے میں قبطیوں کا سردار تھا ۔ اسی نے عمرو بن العاص کے پاس آ کر وفاداری کا اظہار کیا ہو گا ۔ بلاذری بھی ہماری رائے کی تائید کرتے ہیں ۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

”بعض روایات میں بیان کیا گیا ہے ، جب مقوقس کو معلوم ہؤا کہ اہل سکندریہ نے عہد شکنی کی ہے تو وہ عمرو بن العاص کے پاس آیا اور وفاداری کا اظہار کرتے ہوئے عہد شکن لوگوں سے کلی برأت کا اظہار کیا چنانچہ عمرو بن العاص نے اس کی یقین دہانی قبول کر لی ۔ لیکن بعض دوسری روایات میں ہے کہ وہ اس واقعے سے خاصی مدت قبل انتقال کر گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر مؤرخین نے بنیامین کو مقوقس سمجھ کر روایت میں بجائے بنیامین کے مقوقس درج کر دیا ہے اور اسی بنیاد پر انھوں نے مندرجۂ بالا روایت بیان کی ہے ۔“

تیسرا باب

فاتح مصر

۱ : مصر کی کیفیت ، عمرو بن العاص کے قلم سے

مصر کی فتوحات مکمل ہونے کے بعد عمرو بن العاص نے حضرت عمر کو ایک خط لکھا جس میں بڑی شرح و بسط سے مصر کی کیفیت بیان کی اور جو سیاست آپ وہاں رائج کرنا چاہتے تھے اس پر روشنی ڈالی ۔ اس تاریخی خط کی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں اس کی اصل عبارت اور ترجمہ درج کیا جاتا ہے ۔

عمرو بن العاص نے لکھا :

مصر تربة غبراء و شجرة خضراء ۔ طولها شهر و عرضها عشر ۔ یکنفها جبل أغبر و رمل اعفر ۔ یخط و سطها نهر میمون الغدوات مبارک الروحات ۔ یجری بالزیادة و النقصان کجری الشمس والقمر له أوان ۔ تظهربه عیون الارض و ینابیعها حتیٰ اذا عج عجاجه و تعظمت امواجه لم یکن وصول بعض اهل القریٰ الی بعض الا فی خفاف القوارب وصغار المراکب ، فاذا تکامل فی زیادته نکص علیٰ عقبه کاول ما بدأ فی شدته وطما فی حدته ۔ فعند ذالک یخرج القوم لیحرثوا بطون أودیته و روابیه یبذرون الحب و یرجون الثمار من الرب ، حتیٰ اذا اشرق و أشرف سقاه من فوقه الندی و غذاه من تحته الثری ۔ فعندذالک یدر حلابه و یغنی ذبابه فبینما هی یاامیرالمومنین

درة بیضاء اذاهی عنبرة سوداء ، و اذاهی زبرجة خضراء فتعالی الله الفعال لما یشاء ، الذی یصلح هذه البلاد و ینمیها ویقر قاطنها فیها انلا یقبل قول خسیسها فی رئیسها ، و ان لا یستأدی خراج ثمرة الا فی اوانها ، وان یصرف ثلث ارتفاعها فی عمل جسورها و تراعها ، فاذا تقرر الحال مع العمال فی هذه الاحوال تضاعف ارتفاع المال ، والله تعال یوفق فی المبتداء والمآل * -

(مصر کی سر زمین نہایت سیرحاصل اور سر سبز و شاداب ہے۔ اس کا طول ایک مہینے اور عرض دس مہینے کی مسافت ہے ۔ اسے ایک بھورا پہاڑ اور سرخی مائل صحراء چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے ۔ اس کے درمیان سے وہ دریا گزرتا ہے جس کی رفتار صبح سعید اور روانی شام مبارک ہے ۔ اس کے بہاؤ میں مہرو ماہ کی طرح کبھی زیادتی اور کبھی کمی ہوتی رہتی ہے ۔ جب وہ چڑھتا ہے تو تمام چشمے اور نہریں لبالب بھر جاتی ہیں ۔ جب اس کی موجیں جوش مارتی ہیں تو باشندوں کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کو بجز کشتیوں کے اور کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا ۔ جب اس کا جوش ختم ہو چکتا ہے تو یہ اسی تیزی سے اترتا ہے جس تیزی سے چڑھا تھا ۔ اس وقت کاشت کار اس کے ساحلوں کے فراز اور دامنوں کے نشیب میں نکل پڑتے ہیں ، دانے بوتے ہیں اور اپنے پروردگار سے اچھی فصل کے امیدوار ہوتے ہیں ۔ جب دانے پھوٹتے ہیں اور اوپر سے بارش کی تری اور نیچے سے زمین کی نمی پا کر ان میں نشو و نما اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے تو چند ہی روز میں ہرے بھرے کھیت لہلانے لگتے ہیں اور زمین کی دولت اس کے شکم سے پشت پر آ جاتی ہے۔

* ابوالمحاسن (جلد اول ، صفحہ ۳۳)

اس وقت اے امیرالمومنین ! مصر کی زمین عجیب عجیب رنگ سے ظاہر ہوتی ہے ۔ ابھی دمکتا ہؤا موتی ہے ، ابھی عنبر سیاہ اور ذرا سی دیر میں زمرد سبز ۔ یہ اللہ کی قدرت کے کرشمے ہیں جس نے اس میں یہ صلاحیت رکھ دی اور باشندوں کی معیشت کے لیے اسے ایسا بنایا ۔

یہاں کا خراج وقت معینہ سے پہلے وصول نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا کم سے کم تہائی حصہ یہاں کی نہروں اور پلوں کی تعمیر و مرمت میں صرف کیا جائے کیونکہ اس سے آبادی بڑھے گی اور ملک کی دولت و ثروت میں اضافہ ہو کر سلطنت کی قوت و شوکت کا باعث ہوگا ۔ ابتداء اور انتہاء غرض ہر حالت میں اللہ ہی ہمارا معین و مددگار ہے ۔)

بعد میں آنے والے مؤرخین میں سے اکثر نے اس خط کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے لیکن ہمیں شک ہے کہ یہ عمروبن العاص کے قلم سے لکھا گیا ہو گا کیونکہ اس خط کی دلکش عبارت ایک ایسے جدید اسلوب کی حامل ہے جو عربوں کے لیے اس زمانے میں بالکل اجنبی تھا ۔

ابوالمحاسن لکھتے ہیں کہ جب یہ خط حضرت عمر کے پاس پہنچا تو آپ نے فرمایا " اے ابن العاص ! میں کس حد تک تمہاری تعریف کروں ۔ تم نے تو مصر کی سر زمین میری آنکھوں کے سامنے لا رکھی ہے ۔"

مشہور فرانسیسی مصنف مسٹر ' اوکتاف اوزان ' نے ایک فرانسیسی جریدے ' ال فیجارو ' میں اس کا ترجمہ بڑے اہتمام سے شائع کرایا ہے ۔ انھوں نے اسے بلاغت کا حیرت انگیز نمونہ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ معمورۂ عالم کے تمام مدارس میں

اسے پڑھانا چاہیے تا کہ طلبہ کو اشیاء کا بنظر غائر مطالعہ کرنے، حقائق اور اوصاف بیان کرنے، ملک کا انتظام کرنے، اور سیاست کی ترویج کے طریقوں کا علم ہو سکے۔

گبن اور بٹلر نے بھی اپنی کتابوں میں اس خط کا ترجمہ درج کیا ہے اور اسے بے نظیر بلاغت کا شاہکار قرار دیا ہے۔

ب : دارالحکومت کی منتقلی

اسکندریہ فتح کرنے کے بعد عمرو بن العاص نے وہاں اپنا ایک نائب مقرر فرمایا اور خود فسطاط چلے گئے۔ اسکندریہ چھوڑنے کا سبب یہ ہؤا کہ باشندوں سے مصالحت کرنے کے بعد جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو آپ کو وہاں سیکڑوں عالیشان مکانات خالی ملے کیونکہ ان میں رہنے والے رومی انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ آپ ان مکانات کو مسلمانوں کی ضرورت کے لیے کافی دیکھ کر خوش ہوئے اور کہا کہ اللہ نے ہمیں مکانات تعمیر کرنے کی زحمت سے بچا لیا۔ آپ کی خواہش تھی کہ اسکندریہ ھی کو اپنا مرکز رکھیں۔ اس غرض کے لیے آپ نے حضرت عمر سے اجازت طلب کی۔ حضرت عمر نے آپ کے قاصد سے پوچھا "یہ بتاؤ کہ میرے اور مسلمانوں کے درمیان دریا حائل ہوگا یا نہیں؟" اس نے جواب دیا "جی ہاں، طغیانی کے وقت دریائے نیل حائل ہوگا۔" اس پر آپ نے عمرو بن العاص کو لکھ دیا، میں یہ پسند نہیں کرتا کہ مسلمان ایسی جگہ قیام کریں جہاں گرمی یا سردی میں میرے اور ان کے درمیان دریا حائل ہو۔ اس لیے تم اپنا قیام ایسی جگہ رکھو جہاں میں جس موسم میں چاہوں بلا کھٹکے تمہارے پاس پہنچ سکوں۔

اسکندریہ کے زمانے سے مصر اور دنیا کے متمدن ممالک کے درمیان جو تعلقات تھے ان کا تقاضا یہ تھا کہ اسکندریہ ھی کو دارالحکومت رھنے دیا جاتا ، لیکن مصر کی سیادت کا مرکز چونکہ عرب میں منتقل ھو چکا تھا اس لیے ضروری تھا کہ ملک کا دارالحکومت یا بحیرۂ احمر پر ھوتا یا کسی ایسی جگہ جہاں بری اور بحری ، دونوں ذرائع سے بہ آسانی پہنچا جا سکتا ۔ چونکہ عرب بحری قوم نہ تھے اور سمندر کے سفر سے بہت گھبراتے تھے اس لیے مصر کے دارالحکومت کا ایسی جگہ ھونا ضروری تھا جو عرب اور مصر کے قریب ترین نقطۂ مواصلت پر واقع ھو ۔ اس غرض سے فسطاط کی سرزمین بہترین جگہ تھی اور اسی زمین پر عمرو بن العاص کی نگاہ انتخاب پڑی ۔ یہاں سے مصر کے شمالی اور جنوبی ، دونوں طرفوں کی نگہداشت ھو سکتی تھی ۔ آب و ھوا کے لحاظ سے بھی یہ جگہ صحت بخش تھی ۔ اس کے ایک طرف دریائے نیل تھا اور دوسری طرف کوہ مقطم ۔ یہ سارا قطعہ نہایت سرسبز و شاداب تھا ۔

فسطاط میں منتقل ھونے کے بعد آپ نے ملک کے نظم و نسق کی درستی پر توجہ دینی شروع کی ۔ سب سے پہلے آپ نے عدل و انصاف کے قیام ، ملک کی آبادی اور باشندوں کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ فرمائی ۔ اپنی عقل مندی اور حسن سیاست سے آپ نے قبطیوں کے دلوں کو گرویدہ کر لیا اور وہ دل و جان سے مسلمانوں کے حامی اور مددگار بن گئے ۔ مصری مدت دراز سے رومیوں کے ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے ۔ آپ نے آ کر انھیں ان مظالم سے نجات دلائی ، ان کی ثقافت اور عقائد سے قطعاً تعرض نہ کیا ، انھیں مذھبی امور میں مکمل آزادی بخشی ، ان کی جان و مال ، اھل و عیال ، عزت و حرمت ، دولت و تجارت

ہر چیز کی حفاظت اور غیر اقوام کے حملوں سے مدافعت کا یقین دلایا ۔

قبطیوں کی دل جوئی کی خاطر آپ نے ایک کام یہ کیا کہ ان کے عزیز ترین مذہبی پیشوا ' بنیامین ' کو جو تیرہ سال سے رومیوں کے ڈر سے روپوش تھا امان نامہ لکھ کر واپس بلا لیا اور اسے اسکندریہ کے بطریق کے عہدے پر دوبارہ فائز کر دیا۔ اس حکم سے تمام مصریوں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی اور عمرو بن العاص سے آن کی محبت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ۔

تیرہ سال کی جلاوطنی کے بعد جب بنیامین اسکندریہ پہنچا تو عمرو بن العاص کے احکام کے مطابق اس کا شاندار استقبال کیا گیا ۔ عمرو بن العاص سے اپنی ملاقات میں اس نے کلیسا کو بعض مراعات دینے کی درخواست کی ۔ آپ نے اس درخواست کو شرف قبولیت بخش کر اسے قبطیوں کے مذہبی امور کی نگہداشت اور کلیسا کے انتظامات کو چلانے کے لیے غیر محدود اختیارات دے دیے۔ اس طرح اس کی حیثیت قبطیوں کے مختار کل مذہبی پیشوا کی ہو گئی ۔

' نقیوس ' کے اسقف ' باسیلی ' نے ' دیر مقار یوس ' میں جو فصیح و بلیغ تقریر کی تھی اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ قبطی مسلمانوں کے مصر پر قبضے سے کس قدر مسرور تھے ۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا :

” دین سے خارج اور ستم پیشہ رومیوں کے مظالم کے بعد اب میں اسکندریہ میں امن و امان اور راحت کا دور دورہ دیکھتا ہوں ۔“

اسی زمانے میں جب بنیامین نے دیرمقاریوس کی زیارت کی تو

اسقف ساویرس نے کہا :

" آج ہماری قوم کی بیڑیاں کٹ گئیں اور وہ ظالم و سفاک رومیوں کے پنجوں سے آزاد ہو گئی ۔"

ج : شہر فسطاط کی بنیاد

عمرو بن العاص نے مصر کو فتح کرتے ہی دوسرے فاتحین کے برعکس یہاں اسلامی تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالنی شروع کی ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا کام مصر کے نئے دارالحکومت ' فسطاط' کی تاسیس تھی ۔

جس جگہ فسطاط کا شہر آباد تھا وہ بڑی شاداب اور پر فضا تھی اور دریائے نیل اور کوہ مقطم کے درمیان واقع تھی ۔ اس جگہ قلعہ بابلیون اور چند گرجاؤں کے اور کوئی عمارت نہ تھی ۔ قلعے کی شمالی اور مشرق جانب کھجوروں اور انگوروں کے باغ تھے ۔ گرجے ، قلعے اور کوہ مقطم کے درمیان بنے ہوئے تھے ۔ حکومت مصر کے چیف سول انجنیر پروفیسر یوسف آفندی نے شہر کی جگہ کی تعیین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فسطاط اس منطقے میں بسا ہوا تھا جو جامع عمرو بن العاص کے ارد گرد واقع ہے ۔ مشرق میں اس کی حدود جبل مقطم کے دامن تک تھیں ، شمال میں فم الخلیج ، قناطر السباع اور جبل یشکر تک ۔ مغرب میں دریائے نیل اور جنوب میں ساحل أثر النبی تک ۔

مقریزی لکھتے ہیں کہ جب عمرو بن العاص نے پہلی بار اسکندریہ فتح کیا تو حضرت عمر کی ہدایات کے مطابق وہاں اپنا نائب مقرر کر کے خود اس جگہ واپس آ گئے جہاں قلعۂ بابلیون کے محاصرے کے وقت اسلامی فوجوں نے ڈیرے ڈال رکھے

تھے ۔ وہاں آپ نے وہ مشہور مسجد تعمیر کی جسے جامع عتیق اور جامع عمرو بن العاص کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اس مسجد کے چاروں طرف قبائل عرب کو بسایا ۔ اس طرح اس جگہ نے ایک شہر کی صورت اختیار کر لی جسے فسطاط کا نام دیا گیا۔

فسطاط کی وجہ تسمیہ کے بارے میں متعدد روایات مشہور ہیں ۔ ایک روایت یہ ہے کہ قلعۂ بابلیون کی فتح کے بعد جب عمرو بن العاص نے اسکندریہ کی جانب کوچ کرنے کا ارادہ کیا اور آپ کا خیمہ اکھاڑا جانے لگا تو آپ کی نظر ایک کبوتر پر پڑی جس نے خیمے میں گھونسلا بنا کر انڈے دے رکھے تھے ۔ آپ نے فرمایا ” اس کبوتر نے ہمارے جوار میں پناہ لی ہے ، خیمہ مت اکھاڑو ورنہ ہمارے اس مہمان کو تکلیف ہوگی ۔“ چنانچہ وہ خیمہ اسی طرح گڑا رہنے دیا گیا ۔ جب آپ اسکندریہ سے واپس آئے تو اسی خیمے میں اترے ۔ عربی میں فسطاط خیمے کو کہتے ہیں اس لیے شہر کا نام بھی فسطاط ہی پڑ گیا ۔

ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جب عمرو بن العاص اسکندریہ سے واپس ہوئے تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا ” تم کہاں اترو گے ؟“ انھوں نے کہا ” فسطاط کے قریب ۔“ ان کی مراد عمرو بن العاص کے اس خیمے سے تھی جسے آپ نے اسکندریہ روانہ ہوتے وقت ایستادہ ہی رہنے دیا تھا اور جو بدستور اپنی جگہ ہی نصب تھا ۔ عمرو بن العاص نے بھی وہیں قیام کرنا پسند کیا اور اپنا گھر اسی جگہ بنایا جہاں ان کا خیمہ نصب تھا ۔ اس کے عین سامنے جامع عمرو بن العاص تعمیر کی ۔ جب قبائل کے لیے مکان بنانے کا سوال درپیش ہؤا تو ان میں باہم اختلاف رونما ہو گیا ۔ ہر قبیلہ چاہتا تھا کہ وہ دریا کے قریب رہے ۔ آخر عمرو بن العاص نے شہر کی پیمائش اور محلوں کی تقسیم

کا کام چار اشخاص * کے سپرد کیا اور انھیں اختیار دیا کہ وہ جس قبیلے کو جہاں چاھیں بسا دیں - انھوں نے پیمائش کر کے ھر قبیلے کے لیے علحدہ علحدہ قطعات معین کر دیے -

ابن قتیبہ نے فسطاط کے بارے میں دو روایتیں اور بیان کی ھیں - پہلی روایت یہ ھے کہ صرف شہر فسطاط ھی پر موقوف نہیں ، عرب ھر شہر کو فسطاط کہتے تھے - دوسری روایت یہ کہ رسول اللہ نے فرمایا ھے علیکم بالجاعۃ فان ید اللہ علی الفسطاط † (تم جماعت کے ساتھ رھو کیونکہ اللہ کا ھاتھ فسطاط پر ھے -)

ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتے ھیں کہ شہر آباد کرتے وقت مندرجہ ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ھے (اول) اس کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جائے جو عام سطح سے کسی قدر اونچی ھو - (دوم) وہ پہاڑ ، سمندر یا دریا سے گھری ھوئی ھو تا کہ دشمن آسانی سے وھاں تک نہ پہنچ سکے - (سوم) وھاں کی آب و ھوا پاک و صاف ھو تا کہ شہر کے لوگ وبائی امراض سے محفوظ رہ سکیں - (چہارم) اس کے اردگرد کی زمین زراعت کے قابل ھو تا کہ شہر والوں کو خوراک بہ افراط ملتی رھے -(مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۶۹) فسطاط آباد کرتے وقت عمرو بن العاص نے انھیں امور کو مدنظر رکھا - چنانچہ شہر اس طرح بسایا گیا کہ اس کے ایک طرف دریائے نیل تھا اور دوسری طرف کوہ مقطم- آب و ھوا بھی بہت اچھی تھی اور قریب کی زمین بھی زرخیز اور

* ابن دقماق نے ان چار اشخاص کے نام بھی لکھے ھیں : (۱) معاویہ بن حدیج تجیبی (۲) شریک بن سمی غطیفی (۳) عمرو بن قیحزم خولانی (۴) حویل بن ناشر معافری

† یہ حدیث بے بنیاد معلوم ھوتی ھے - (مترجم)

زراعت کے لیے بہترین تھی -

جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ، شہر آباد کرتے وقت قبائل میں باہم اختلاف پیدا ہو گیا تھا اور عمرو بن العاص نے چار اشخاص کے سپرد محلوں کی تقسیم اور پیمائش کا کام کیا تھا - لیکن بٹلر لکھتا ہے کہ زمین کی پیمائش اور مکانات کی تعمیر سے متعلقہ دوسرے امور قبطیوں کے سپرد کیے گئے تھے کیونکہ انھیں عربوں کے برعکس تعمیر کے فن میں بڑی مہارت حاصل تھی -

ہمارے خیال میں بٹلر کا یہ لکھنا درست نہیں کیونکہ عربوں نے شروع میں جو مکانات بنائے تھے وہ کچی اینٹوں سے تعمیر کیے گئے تھے اور یک منزلہ تھے - ان کے بنانے میں انجینیری اور فن تعمیر میں مہارت کی ضرورت نہ تھی - اس کی روشن مثال جامع عمرو بن العاص کی ہے - اس میں ابتداًء نہ محرابیں تھیں ، نہ روشن دان، نہ کھڑکیاں ، نہ صحن - یہ تمام تر مسقف تھی اور چھت بھی بہت نیچی ، جس کی وجہ سے گرمیوں میں اندر دم گھٹتا تھا - اس لیے جب لوگ نماز پڑھنے آتے تو باہر دیواروں کے سایے میں بیٹھا کرتے تھے اور باہر دروازے کے سامنے نماز پڑھتے تھے -

مسلمانوں نے ابتداء میں بڑے بڑے احاطے گھیر کر کچی اینٹوں سے مکانات بنائے تھے جو یک منزلہ تھے - سب سے پہلے خارجہ بن حذافہ نے گھر کے اوپر بالا خانہ بنوایا - جب حضرت عمر کو یہ خبر پہنچی تو آپ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا، کیا خارجہ کو پڑوسیوں کے پردے کا خیال نہیں - چنانچہ آپ نے عمرو بن العاص کو حکم بھیجا کہ خارجہ کے بالا خانے پر جا کر درمیانے قد کے ایک آدمی کو چارپائی پر کھڑا کر دو ، اگر اس کا سر روشندان تک نہ پہنچے تو خیر ، ورنہ بالا خانہ

ڈھا دو ۔ عمرو بن العاص نے ایسا ہی کیا لیکن آدمی کا سر چونکہ روشن دان تک نہ پہنچا تھا اس لیے بالا خانہ باقی رکھا گیا ۔

رفتہ رفتہ شہر کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا ۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ مکانات نے بھی وسعت اختیار کرنی شروع کی اور سات سات ، آٹھ آٹھ منزل کے مکانات بننے لگے ۔ جس محلے میں پہلے چند خاندان آباد تھے اب ان میں چار چار ، پانچ پانچ سو باشندوں کی سکونت ہو گئی ۔ روشنی کی کمی اور نمی کے باعث وہ لوگ نچلی منزل میں سکونت نہ رکھتے تھے ، نچلی منزلیں گودام کا کام دیتی تھیں ۔ بہت کم گھر ایسے ہوں گے جن میں کنوئیں ، پانی کے حوض اور حمام نہ ہوں ۔

مکانات اور سڑکوں کی تعمیر میں باقاعدہ ترتیب اور جدت سے کام لیا گیا تھا ۔ بازار ، سڑکیں اور گلیاں وسیع و فراخ تھیں ۔ مکانات بلند و بالا اور عالیشان تھے ۔ یہ سب کچھ فتح کے تھوڑے عرصے بعد وقوع میں آ گیا تھا ۔

د : جامع عتیق کی تاسیس

قلعۂ بابلیون کے شمال میں جامع عمرو بن العاص (جسے جامع عتیق بھی کہتے ہیں) تعمیر کی گئی ۔ یہ مصر کی پہلی مسجد ہے ۔ چونکہ اس مسجد سے عمرو بن العاص کا نام وابستہ ہے اس لیے اب تک اس سے جلال اور ہیبت ٹپکتی ہے ۔

اس مسجد کی بنیاد ۲۱ھ میں رکھی گئی ۔ یہ جگہ ایک شخص قیسبہ بن کلثوم التجیبی کے قبضے میں تھی ۔ جب مسلمان اسکندریہ سے واپس ہوئے تو عمرو بن العاص نے قیسبہ کو بلایا

اور یہ جگہ مسجد کے لیے قیمتاً دینے کی درخواست کی ۔ اس نے یہ درخواست بخوشی قبول کرلی اور بغیر قیمت لیے یہ جگہ آپ کے حوالے کر دی ۔ آپ نے اس پر تعمیر شروع کرا دی ۔ مسجد کا طول پچاس گز اور عرض تیس گز تھا ۔ بعد میں وقتاً فوقتاً اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ سمت قبلہ کی تعیین ۸۰ صحابہ نے مل کرکی جن میں زبیر بن عوام ، مقداد بن اسود اور عبادہ بن صامت شامل تھے ۔ تعمیر کے وقت سب سے پہلی اینٹ قرہ بن شریک * نے رکھی ۔ اس کے چھ دروازے تھے ۔ دو دروازے عمرو بن العاص کے گھر کے عین سامنے تھے، دو دروازے شمالی جانب تھے اور دو دروازے مغربی جانب ۔ ابتداًء مسجد میں محراب نہ تھی ، چھت بہت نیچی تھی ، صحن بالکل نہ تھا ۔ مسجد اور عمرو بن العاص کے مکان کے درمیان سات گز کا فاصلہ تھا ۔ اس کے چاروں طرف راستہ چھوڑا ہؤا تھا ۔ عمرو بن العاص نے اس میں ایک منبر بھی بنایا تھا۔ جب حضرت عمر کو یہ معلوم ہؤا تو آپ نے عمرو بن العاص کے اس فعل پر اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے لکھا کہ کیا یہ مناسب ہے کہ تم تو منبر پر کھڑے ہو اور مسلمان تمھارے قدموں کے نیچے بیٹھے ہوں ۔ یہ خط ملنے پر عمرو بن العاص نے منبر تڑوا دیا ۔

۲ : جامع عتیق میں خطبہ

جامع عتیق کے ذکر کے ضمن میں ہم عمرو بن العاص کا ایک خطبہ بھی درج کر دیتے ہیں جو آپ نے اسی مسجد میں ارشاد فرمایا تھا ۔

---

* قرہ بن شریک ولید بن عبدالملک بن مروان کے عہد سے قبل ۹۰ھ سے ۹۶ھ تک مصر کے والی بھی رہے ہیں ۔

سعید بن میسرہ المعافری روایت کرتے ہیں کہ ایک روز میں اپنے والد کے ساتھ نماز جمعہ کے لیے گیا - مسجد میں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ کوڑے ہاتھوں میں لیے آئے اور لوگوں کو ہٹا کر راستہ صاف کرنے لگے - میں ڈر گیا اور اپنے والد سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں ؟ انھوں نے بتایا کہ یہ پولیس کے سپاھی ہیں اور والیٔ مصر عمرو بن العاص کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں - مؤذن نے اذان دی اور عمرو بن العاص کھڑے ہوگئے - میرے سامنے ایک خوش رو ، ھنس مکھ ، کوتاہ قامت ، بھاری سر اور روشن اور موٹی آنکھوں والا شخص منقش کپڑے پہنے کھڑا تھا - آپ نے حمد و ثنا اور درود کے بعد فرمایا :

" اے لوگو ! چار باتوں سے بچتے رہو کیونکہ وہ راحت و آرام کے بعد تکلیف و مشقت اور فراخی اور عیش و آرام کے بعد تنگی اور غریبی کی دعوت دیتی ہیں - وہ چار چیزیں یہ ہیں - اھل و عیال کی کثرت سے بچو ، عاجزی اور درماندگی کی زندگی سے دور رھو ، مال کو ضائع نہ کرو اور بے فائدہ قیل و قال میں وقت نہ گنواؤ - لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان ہر وقت کام میں مشغول رہے - اسے کچھ آرام بھی کرنا چاہیے اور یہ فراغت کا وقت جسمانی حالت بہتر بنانے ، مستقبل کی بہتری کے لیے تدابیر سوچنے اور خواھشات اور ارادوں کو جامۂ عمل پہنچانے میں صرف کرنا چاھیے - لیکن میانہ روی کو کسی حالت میں بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا چاھیے - فراغت کے وقت میں انسان اپنے نفس سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے لہذا اس وقت کو بھی بہتر مصرف میں لانا چاہیے اور ضائع نہ کرنا چاھیے - اس وقت تم پر خدا کا فضل ہے - وبا کا نام و نشان نہیں ، زمین سر سبز و شاداب ہے ، پیداوار بہ افراط ہے - تم

خود بھی یہاں کی پیداوار اور شکار سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے گھوڑوں کو بھی چراگاھوں میں چرا کر خوب موٹا تازہ کرو۔ تم پر اپنے گھوڑوں کی نگہداشت فرض ھے کیونکہ وہ تمہیں تمہارے دشمنوں سے بچاتے ھیں، انھیں کے ذریعے سے تمہیں مال غنیمت حاصل ھوتا ھے۔ تمہارے قرب میں جو قبطی رھتے ھوں انہیں ھمیشہ نیکی کی تلقین اور اسلام کی تبلیغ کرتے رھو۔ رعایا سے ھمیشہ اچھا سلوک کرو۔ نرم و نازک جسم اور شہد کی طرح شیریں زبان زنا کار عورتوں سے پرے رھو کیونکہ وہ تمہارے دین کی خرابی کا باعث ھوتی ھیں اور تمہاری ھمتوں کو پست کر دیتی ھیں۔ میں نے امیرالمومنین کی زبانی رسول اللہ کی یہ حدیث سنی ھے کہ اللہ میرے بعد تمہیں مصر پر غلبہ عطا فرمائے گا، تم وھاں کے قبطیوں سے اچھا سلوک کرنا اور انہیں ھمیشہ نیکیوں کی تلقین کرتے رھنا کیونکہ تمہارے اور ان کے درمیان شادی بیاہ کا سلسلہ چلے گا۔ تم ھاتھوں کو ظلم سے روکے رکھنا، شرم گاھوں کی حفاظت کرنا اور نظریں نیچی رکھنا۔

"وہ تمام آدمی میری نظر میں ھیں جو خود تو کھا کھا کر بھاری تن و توش کے مالک ھو گئے ھیں لیکن انھوں نے اپنے گھوڑوں کو دبلا پتلا رکھ چھوڑا ھے۔ میں عنقریب گھوڑوں کا معاینہ کروں گا۔ معاینے کے دوران میں جس گھوڑے کو کمزور اور دبلا پتلا دیکھوں گا اگر اس کا مالک اس کے لیے معقول وجہ پیش نہ کر سکا تو اس کا وظیفہ کم کر دوں گا۔ یاد رکھو تمہیں اپنے دشمنوں کی کثرت اور ان کی تم سے بے پناہ بغض و عداوت کے باعث قیامت تک کے لیے فوجی تیاریاں کرنی پڑیں گی۔ امیر المومنین حضرت عمر نے

بتایا کہ رسول اللہ فرماتے تھے، اللہ تمھیں میرے بعد مصر پر غلبہ بخشے گا، تم وہاں بھاری لشکر متعین کرنا کیونکہ وہ فوجوں کے لیے روئے زمین پر بہترین چھاؤنی ہے۔

"اے لوگو! تم ان نعمتوں پر، جو اللہ نے اپنے فضل سے تمہیں یہاں آ کر بخشی ہیں، شکر کرو اور ان سے خوب فائدہ اٹھاؤ۔ لیکن قحط سالی کا موسم آ جائے تو فسطاط میں آ کر جمع ہو جاؤ۔ جب کبھی تم اپنے اہل و عیال کے پاس جاؤ تو مقدور کے مطابق ان کے لیے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے کر جاؤ۔ اللہ تمہاری ہر طرح حفاظت و نصرت فرمائے۔"

عمرو بن العاص کے اس خطبے سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ آپ اپنی رعایا اور فوج کے بے حد خیر خواہ تھے اور حضرت عمر کی سیاست کے نقش قدم پر چلنے والے تھے۔ آپ لوگوں کو دنیوی نعمتیں حاصل کرنے سے روکتے نہ تھے لیکن آپ کی تاکید یہ ہوتی تھی کہ ان نعمتوں سے فائدہ اٹھانے میں فضول خرچی کو دخل نہ ہونا چاہیے۔ اس خطبے سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ فوجی تیاریاں جاری رکھنے اور گھوڑوں کی پرداخت اور نگہداشت کرنے کے کس قدر آرزو مند تھے۔ در اصل آپ کو یقین تھا کہ شمالی افریقہ میں رومیوں سے جنگ ضرور پیش آئے گی کیونکہ رومی نئے سرے سے مصر پر حملہ کرنے کے لیے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے اور اس غرض سے ان کی فوجی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔

س: نہر امیرالمومنین (خلیج قاہرہ) کی کھدائی

مصر میں عمرو بن العاص کے بے نظیر کاموں میں سے ایک

کام خلیج قاہرہ کی کھدائی ہے جسے نہر امیرالمومنین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ۔ علی مبارک پاشا اپنی کتاب ' الخطط التوفیقیہ ' میں اس کے متعلق رقم طراز ہیں :

" مقریزی اور بعض دوسرے مؤرخین کی روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی نئی نہر نہ تھی بلکہ پرانی نہر تھی جس کے ذریعے سے دریائے نیل اور بحیرۂ احمر کو آپس میں ملا دیا گیا تھا ۔ اس نہر کے ذریعے سے عرب ، ہند اور سودان کی تجارتی چیزیں مصر میں آتی تھیں اور مصر کی چیزیں ان ممالک میں جاتی تھیں ۔ کشتیوں کے ذریعے سے مصر کا مال بحیرۂ احمر میں پہنچتا تھا اور وہاں سے ان ممالک میں چلا جاتا تھا ۔ اس لحاظ سے اس نہر کا شمار آثار قدیمہ میں ہوتا ہے ۔"

مقریزی نے اپنی کتاب ' المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط و الاثار ' میں اس نہر کا مفصل حال ایک علیحدہ باب میں بیان کیا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :

" یہ نہر قاہرہ کی مغربی جانب سے 'مقس' تک چلی گئی تھی ۔ ابتداء اسلام میں اسے نہر امیرالمومنین کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا ۔ یہ ایک قدیم نہر ہے ۔ سب سے پہلے اسے مصر کے ایک بادشاہ ' طوطیس بن مالیا ' نے (جس کا دارالحکومت منف تھا) کھدوایا تھا ۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ مصر تشریف لائے تھے اور حضرت اسماعیل کی والدہ حاجرہ کو لے کر یہاں سے واپس گئے تھے۔ جب حضرت ابراہیم، حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل کو وادئ مکہ میں چھوڑ کر فلسطین چلے گئے تو ہاجرہ نے 'طوطیس' کو یہ پیغام بھیجا کہ ہم ایک بے آب و گیاہ میدان میں ہیں ، اگر تم ہماری کچھ مدد کر سکتے ہو تو کرو ۔ یہ پیغام پہنچنے

پر طوطیس نے یہ نہر کھودنے کا حکم دیا ۔ جب یہ تیار ہو گئی تو اس کے ذریعے سے غلہ بھری کشتیاں جدہ بھجوانی شروع کیں جو حجاز کی بندرگاہ ہے ۔ جدہ سے یہ غلہ مکہ آ جاتا تھا ۔ اس طرح حجاز کا سارا علاقہ خوش حال ہو گیا ...... مدت دراز گزرنے پر یہ نہر اٹ گئی ۔ آخر قیصر 'اندرومانوس' (ادریان) نے اسے دوبارہ صاف کرایا ۔ ھجرت سے چار سو سال پیشتر تک اس نہر میں کشتیاں چلتی تھیں ۔"

مقریزی کی یہ روایت من گھڑت اور بے بنیاد معلوم ہوتی ہے ۔ یہ امر بالکل بعید از قیاس ہے کہ ایک بادشاہ محض ایک عورت کی خاطر اتنی بڑی نہر کھدوانے کا عزم کرے اور ھزار مشکلات کے باوجود اسے پورا کر کے ھی چھوڑے ۔

مشہور سیاح ھیرو دت ، جو ساڑھے چار سو سال قبل مسیح میں مصر کی سیاحت کے لیے آیا تھا ، اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ 'نیخوس بن ابسا ستکوس' پہلا شخص ہے جس نے دریائے نیل کو بحیرۂ احمر سے ملانے کا کام شروع کیا لیکن وہ اسے پورا نہ کر سکا ۔

دارا کے زمانے میں جب مصر ایرانیوں کی عملداری میں آیا تو نہر کی کھدائی کا کام دوبارہ شروع ہؤا اور بالآخر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ۔ اس کی لمبائی اتنی تھی کہ کشتیاں چار دن میں اس کا سفر پورا کیا کرتی تھیں اور عرض اتنا تھا کہ دو کشتیاں برابر برابر آسانی سے چل سکتی تھیں ۔ یہ نہر ، جو دریائے نیل کے پانی سے بھری رہتی تھی ، مقام 'بوبسط' سے جو شہر 'باطموس*' کے قریب واقع تھا نکال

* باطموس کا شہر وھی ہے جسے اب تل الکبیر کہتے ھیں ۔

کر پہاڑ کی جنوبی وادیوں میں سے لے جاتے ہوئے سمندر تک پہنچائی گئی تھی - اس نہر کا نام خلیج تراچان تھا -

تاریخ قرون وسطیٰ مؤلفہ لبون میں لکھا ھے ”عمر و بن العاص نے یہ ارادہ کیا تھا کہ فرما سے ایک نہر نکالیں جو بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم کو آپس میں ملا دے - ان دونوں سمندروں کے درمیان صرف ستر میل کا فاصلہ تھا - لیکن حضرت عمر نے اس خیال سے کہ کہیں اس نہر کے ذریعے سے رومی عرب پر حملہ نہ کرنے لگیں عمرو بن العاص کو ایسا کرنے سے روک دیا - اس پر عمرو بن العاص نے خلیج تراچان کی درستی کرنے ھی پر اکتفا کی جسے شاہ ادریان نے بابلیون کے قریب سے کھدوانا شروع کیا تھا اور اسے اس قدیم نہر سے ملادیا تھا جو نیخوس نے کھدوانی شروع کی تھی لیکن اسے پورا نہ کر سکا تھا - ان دونوں نہروں کے ملنے سے ایک نہر بن گئی جو دریائے نیل سے جھیل مرّہ تک چلی گئی تھی - ’بطلیموس لاغوس‘ کے عہد میں اس نہر کی تکمیل ہوئی * اور اسے اس مقام پر جہاں آج کل سویز واقع ھے بحیرۂ قلزم سے ملا دیا گیا - یہ نہر شہر بابلیون کے متصل دریائے نیل سے شروع ھوتی تھی اور عین شمش اور وادئ طمیلات سے گزرتی ہوئی قنطرہ (خلیج تمساح) تک پہنچتی تھی - وھاں سے جنوب کا رخ کرتی تھی اور قلزم کے نزدیک بحیرۂ احمر میں گر جاتی تھی -“

اوپر کے بیان سے معلوم ھوتا ھے کہ خلیج (نہر) تراچان اور خلیج ادریان فی‌الجملہ ایک ھی نہر تھی جو دریائے نیل سے

* بٹلر لکھتا ھے کہ اس نہر کی تکمیل ’بطلیموس فیلاڈلف ثانی‘ کے عہد میں ہوئی تھی -

جھیل مرہ تک چلی گئی تھی ۔ بعد ازآں بطلیموس نے اسے بحیرۂ قلزم سے ملا دیا ۔ یہ نہر صرف دریائے نیل کی طغیانی کے وقت کارآمد ہوتی تھی ۔

رومی بعد میں اس نہر کی درستی اور صفائی کی طرف سے غافل ہوگئے اور جگہ جگہ اس میں ریت اور مٹی اٹ جانے کی وجہ سے یہ بالکل بند ہو گئی ، تاآنکہ عمرو بن العاص نے اسے دوبارہ کھدوا کر استعمال کے قابل بنایا اور اس کے ذریعے سے مصر کا غلہ بہ آسانی حجاز جانے لگا ۔ اس نہر کی لمبائی ۸۰ میل سے کم نہ تھی ۔

عمرو بن العاص کے عہد میں اس نہر کے دوبارہ اجراء کا سبب سیوطی نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک بار مدینہ میں سخت قحط پڑا ۔ حضرت عمر نے تمام صوبوں سے غلہ طلب کیا ۔ مصر سے غلہ پہنچنے میں کچھ دیر ہوئی تو آپ نے عمرو بن العاص کو ایک مختصر خط لکھا :

" امیرالمومنین کی جانب سے عمرو بن العاص کے نام

تم پر سلامتی ہو ۔ خدا کی قسم اے عمرو بن العاص ! جب تم اور تمھارے ساتھی شکم سیر ہوں تو تم اس کی پروا نہیں کرتے کہ میں اور میرے ساتھی ہلاک ہو جائیں ۔"

عمرو بن العاص نے جواب میں لکھا :

" لبیک لبیک یا امیرالمومنین ! میں آپ کے پاس آونٹوں کا اتنا بڑا قافلہ بھیجتا ہوں جس کا اگلا حصہ آپ کے پاس اور پچھلا حصہ میرے پاس ہے ۔"

چنانچہ وعدے کے مطابق آپ نے غلے کا بہت بڑا قافلہ روانہ فرما دیا جس سے قحط کی تمام تکالیف دور ہو گئیں ۔ حضرت عمر

نے عمرو بن العاص کو لکھا کہ تم مصر کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر میرے پاس آؤ - جب آپ مدینہ پہنچے تو حضرت عمر نے فرمایا :

" عمرو بن العاص ! اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو مصر کی زرخیز اور وافر پیداوار والی زمین پر غلبہ عطا فرمایا ہے اور اسے تمام مسلمانوں کی قوت کا ذریعہ بنایا ہے - لیکن اگر ان فتوحات سے حرمین کے لوگوں کو فائدہ نہ پہنچے اور وہ بدستور تنگی سے گزارہ کرتے رہیں تو ان کا کیا فائدہ - میرے دل میں خیال آیا ہے کہ تم دریائے نیل سے بحیرۂ قلزم تک ایک نہر کھدواؤ جس سے مدینہ اور مکہ تک غلہ پہنچنا آسان ہو جائے کیونکہ خشکی کے راستے غلہ پہنچنے میں بہت دیر ہو جاتی ہے اور وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو ہم چاہتے ہیں - میں نے تمہیں اس اس لیے بلایا ہے کہ تم اپنے ساتھیوں سے اس بارے میں مشورہ کرو اور جلد از جلد کام شروع کر دو -"

عمروبن العاص نے مصری ساتھیوں کو ساری بات بتائی - ان پر یہ امر بہت گراں گزرا اور انھوں نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ اس نہر کے جاری ہونے سے مصر کو نقصان پہنچے گا ، آپ امیرالمومنین کے پاس جائیں اور عرض کریں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا آپ اسے سمجھتے ہیں ، اس لیے یہ خیال ترک کر دیں - عمرو بن العاص حضرت عمر کے پاس پہنچے - حضرت عمر اپنی بے نظیر فراست سے تاڑ گئے کہ مصریوں نے آپ سے یہ بات کہی ہو گی - آپ نے عمرو بن العاص کو مجبور کیا کہ وہ جائیں اور نہر کی کھدوائی کا کام شروع کرا دیں - نہر کے پرانے حصے اور نشانات ابھی تک باقی تھے - آپ نے انہیں نشانات کے مطابق فسطاط کے کنارے سے نہر کھدوانی شروع کی اور وادئ شمس

اور وادیٔ طمیلات سے لا کر شہر قلزم کے متصل بحیرۂ احمر میں گرا دیا ۔ اس نہر کا نام آپ نے نہر امیرالمومنین رکھا ۔ اس کے بننے سے مصر کا غلہ بہت آسانی سے عرب میں آنے لگا ۔ کشتیاں جار کے مقام پر پہنچ کر لنگر ڈالتی تھیں اور وہاں سے اونٹوں پر لد کر غلہ مکہ اور مدینہ آتا تھا ۔

یہ نہر ایک سال سے بھی کم عرصے میں، امیرالمومنین حضرت عمر کی زندگی ہی میں ، تیار ہو گئی تھی ۔ کندی نے لکھا ہے کہ عمرو بن العاص نے یہ نہر ۲۳ھ میں کھدوائی اور یہ چھ مہینے میں تیار ہو گئی تھی ۔ کندی کے اس قول سے یہ پتا نہیں چلتا کہ نہر کی کھدوائی ۲۳ھ میں شروع ہوئی تھی یا کھدائی کا کام ۲۳ھ میں ختم ہؤا تھا ۔ غالب گمان یہ ہے کہ اس کی کھدائی ۲۲ھ کے اواخر میں ہوئی تھی اور ذی الحجہ ۲۳ھ میں حضرت عمر کی وفات سے قبل بن کر تیار ہو گئی تھی ۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے تک یہ نہر خوب کام دیتی رہی اور اس کے ذریعے سے مصر اور عرب کی تجارت ہوتی رہی لیکن آپ کے بعد جو والی آئے انھوں نے اس کی صفائی کی طرف سے غفلت برتی اور اس میں ریت اٹ گئی یہاں تک کہ قلزم کے قریب ' ذنب التمساح ' میں یہ بالکل بند ہو گئی ۔ اس کے نشانات کہیں کہیں پائے جاتے تھے - ۱۸۹۷ء میں حکومت مصر نے ان بقیہ نشانات کو بھی پاٹنے کا حکم دے دیا اور اب اس نہر کے نشانات کہیں نہیں پائے جاتے ۔

ص : مقیاس النیل

مصر کی خوش حالی کا انحصار دریائے نیل پر تھا ۔ دریائے نیل

کی طغیانی کی کمی بیشی ہی پر محصول گزاری کی تحصیل کی جاتی تھی - مسلمانوں سے پہلے وہاں کے حاکم لگان کی تشخیص کے لیے چند سال کی پیداوار کا اوسط نکال لیتے تھے اور اسی کے مطابق خراج وصول کرتے تھے - مصریوں کے لیے یہ طریقہ بہت تکلیف دہ تھا - دریائے نیل کی طغیانی ہمیشہ یکساں نہیں رہتی تھی ، اس میں کمی یا زیادتی ہوتی رہتی تھی - طغیانی اور زیادتی کے مطابق پیداوار میں بھی کمی زیادتی ہوتی رہتی تھی - لیکن مصریوں کو ہر سال مقررہ رقم دینی پڑتی تھی ، خواہ پیداوار میں کمی ہو یا زیادتی -

جب مسلمانوں نے مصر فتح کیا اور حضرت عمر کو مصریوں کی ان تکالیف کا علم ہؤا تو آپ نے عمرو بن العاص کو تمام حالات کی تفصیل بھیجنے کی ہدایت فرمائی - عمرو بن العاص نے جواباً لکھا :

" مصر کی زراعت کا انحصار دریائے نیل کی طغیانی پر ہے - میرے علم میں جب دریا کا چڑھاؤ ۱۴ ذراع تک پہنچ جاتا ہے تو خشک سالی کا خطرہ نہیں رہتا - سولہ ذراع میں سارا ملک سیراب ہو جاتا ہے اور اس قدر وافر پیداوار ہوتی ہے کہ دوسرے سال کے لیے بھی بچ رہتی ہے - نیچے اور اوپر کی جو حدیں ہیں وہ خطرناک ہیں - یعنی اگر دریا کی طغیانی ۱۲ ذراع تک ہو تو ملک میں قحط سالی کا اندیشہ ہوتا ہے اور اگر ۱۸ ذراع تک پہنچ جائے تو سخت طوفان آ جاتا ہے ، تمام زمینیں مکمل طور پر زیر آب اور فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں - "

یہ خط پہنچنے پر حضرت عمر نے عمرو بن العاص کو نیل کا چڑھاؤ معلوم کرنے کے لیے مقیاس بنانے کا حکم دیا - اس حکم کے مطابق عمرو بن العاص نے حلوان کے مقام پر ایک مقیاس بنوایا

جو مقریزی کے بیان کے مطابق ۱۲۷۰ء تک موجود تھا ۔

ط : مصر کا خراج اور حضرت عمر کی بدگمانی

عمرو بن العاص نے شرائط صلح کے مطابق مصریوں سے خراج کی تحصیل شروع کی ۔ پہلے حاکموں کی طرح آپ ان سے معینہ اور مقررہ رقم وصول نہ کرتے تھے بلکہ دریائے نیل کی طغیانی اور پیداوار کی کمی بیشی کے مطابق وصول کرتے تھے ، خشک سالی کے موسم میں متاثرہ علاقوں کا خراج معاف بھی کر دیتے تھے ۔ پہلے سال خراج کی تحصیل ایک کروڑ بیس لاکھ دینار ہوئی حالانکہ اس سے پچھلے سال مقوقس دو کروڑ دینار وصول کر چکا تھا ۔ چونکہ عمرو بن العاص کے عہد میں رومیوں کے عہد سے بہت کم خراج وصول ہوتا تھا اس لیے حضرت عمر کو آپ کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی تھی ۔ اس کا اظہار اس خط و کتابت سے ہوتا ہے جو خاصی مدت تک دونوں کے درمیان خراج کے متعلق ہوتی رہی ۔

ذیل میں ہم سیوطی کی تصنیف 'حسن المحاضرۃ' سے حضرت عمر کا ایک خط نقل کرتے ہیں جو آپ نے عمرو بن العاص کو ایک موقع پر ، جب خراج وصول ہونے میں دیر ہو گئی تھی ، لکھا تھا ۔ آپ نے تحریر فرمایا :

" بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کے بندے امیرالمومنین کی طرف سے عمرو بن العاص کے نام

میں نے تمھاری حالت اور کیفیت پر بہت غور کیا ہے ۔ تمھارے پاس نہایت طویل و عریض سرزمین ہے جس کے باشندے کثیرالتعداد ، تندرست ، مضبوط و توانا اور خشکی و تری میں

کام کرنے کی قوت رکھتے ہیں - باوجود ان کی سرکشی اور نافرمانی کے فراعنہ نے انھیں اپنی سخت گیری کی وجہ سے تکلے کی طرح سیدھا کر دیا تھا - مجھے سخت تعجب ہے کہ جس قدر خراج وہ وصول کیا کرتے تھے تم اس سے نصف بھی وصول نہیں کر سکتے حالانکہ نہ قحط ہے نہ خشک سالی - میں تمھیں بارہا خراج کا حساب بھیجنے کے متعلق لکھ چکا ہوں - مجھے امید تھی کہ تم بلا تاخیر حساب بھیج دو گے - لیکن تم ٹال مٹول کر رہے ہو - تمھارے عذرات میرے لیے قطعاً ناقابل قبول ہیں - نہ معلوم حساب بھیجنے میں تمھیں کیا امر مانع ہے - میرا خیال ہے کہ تمھارے عمال اچھے نہیں - انھوں نے اپنی بے عنوانیوں کی آڑ تمھیں بنا رکھا ہے - لیکن یاد رکھو کہ میرے پاس اللہ کے فضل سے ان تمام خرابیوں کی دوا موجود ہے - اے عبداللہ ! (عمرو بن العاص) جب تم اپنا کوئی حق چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تو دوسروں کا حق کیوں ادا نہیں کرتے ؟ "

اس خط کے مطالعے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں :

اول یہ کہ حضرت عمر عمال اور والیوں کی نگرانی میں کس قدر سختی برتتے تھے -

دوم یہ کہ مدینہ میں عمرو بن العاص کے کچھ مخالف ایسے تھے جو خلیفہ کے پاس جا کر آپ کی شکایتیں کیا کرتے تھے - اگرچہ وہ آپ پر خیانت کی تہمت تو نہ لگا سکے لیکن آپ پر بے پروائی اور اپنے کارندوں پر عدم نگرانی کا الزام لگا کر خلیفہ کو آپ سے بدظن ضرور کر دیا -

اس خط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حضرت عمر نے اس سے قبل بھی مصر کے خراج کے متعلق عمرو بن العاص کو خطوط لکھے

تھے اور یہ کہ مصر کا وصول شدہ خراج ایک کروڑ دینار سے بھی کم ہوتا تھا - یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کیا عذرات تھے جو عمرو بن العاص نے پیش کیے تھے - خراج کی کمی سے حضرت عمر نے خیال کیا کہ اس کی وجہ عمرو بن العاص کی اپنے عمال پر عدم نگرانی ہے - عمال جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور اپنی آڑ انھوں نے عمرو بن العاص کو بنا رکھا ہے - اگر فی الواقع یہی بات ہو تو اس سے عمرو بن العاص کی سیاست اور آپ کے نظم و نسق کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے - لیکن دراصل ایسا نہیں - خراج کے اموال میں سے فوجوں کی تنخواہیں دی جاتی تھیں ، رفاہ عامہ مثلاً سڑکیں اور پل بنانے کا کام کیا جاتا تھا ، جو رقم بچتی تھی وہ مدینہ روانہ کی جاتی تھی - خراج کے کم وصول ہونے کی وجہ یہ تھی کہ عمرو بن العاص نے لاتعداد ٹیکسوں کے اس بھاری بوجھ کو مصریوں پر سے دور کر دیا تھا جو اس سے قبل ان پر مسلط تھا - عمرو بن العاص ظلم و ستم کا یہ سلسلہ ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہ کر سکتے تھے - خراج کی کمی کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ مصریوں نے کثرت سے اسلام میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا - دولت امویہ کے زمانے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ایک عامل حیان بن شریح کو لکھا کہ جو شخص اسلام لے آئے اس سے جزیہ مت وصول کرو - حیان نے آپ کو لکھا کہ اگر ایسا کیا گیا تو آمدنی بہت گھٹ جائے گی اور سلطنت کو بہت ضعف پہنچے گا اس لیے اس حکم کو منسوخ کر دیا جائے - اس کے جواب میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا بہت ناراضی کا خط حیان کے پاس گیا - آپ نے لکھا :

" خدا تمھارا برا کرے ، تم نے کیسی بری رائے دی ہے - اللہ نے محمد کو ہادی بنا کر بھیجا ہے ، ٹیکس وصول کرنے والا

بنا کر نہیں بھیجا ۔ اللہ کی قسم! میں تو اس بات کا خواہش مند ہوں کہ تمام لوگ مسلمان ہو جائیں خواہ حکومت کو ایک کوڑی بھی وصول نہ ہو ۔ میں تمہیں دوبارہ حکم دیتا ہوں ، جو لوگ اسلام قبول کر لیں اُن سے ہرگز جزیہ وصول نہ کیا جائے ۔"
(مقریزی جلد اول ، صفحہ ۷۷ - ۷۸)

عمرو بن العاص بہت خوددار آدمی تھے ۔ انھوں نے حضرت عمر کے اس خط کا جو جواب دیا اس سے بھی آپ کی خودداری مترشح ہوتی ہے ۔ آپ نے لکھا :

" بسم اللہ الرحمن الرحیم

امیرالمومنین کے نام عمرو بن العاص کی طرف سے

آپ کا خط پہنچا جس میں آپ نے مجھ پر خراج بھیجنے میں دیر کرنے پر خفگی کا اظہار فرمایا ہے ۔ آپ نے لکھا ہے کہ فراعنہ مصریوں سے میری نسبت دگنا خراج وصول کیا کرتے تھے لیکن جب سے میں عامل مقرر ہؤا ہوں خراج میں کمی آ گئی ہے ۔ آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ فراعنہ کے زمانے میں زمین آج کل کی نسبت بہت زرخیز تھی ۔ پھر وہ رعایا پر سخت ظلم کر کے ان کا مال جبراً ان سے چھینا کرتے تھے ۔ لیکن آج کل نہ زمین کی زرخیزی کی وہ حالت ہے اور نہ میں مصریوں پر ظلم و ستم کر کے ان کا مال نا جائز طریقوں سے جبراً چھیننا چاہتا ہوں ۔

آپ نے مجھے جو خط لکھا ہے اسے پڑھ کر میں یہ سمجھا ہوں ، آپ کا خیال یہ ہے کہ کوئی ناجائز امر آپ سے مخفی رکھا گیا ہے ۔ اس خیال کی بنا پر آپ نے مجھے دھمکیاں دینے اور برا بھلا کہنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ۔ اگر آپ چاہتے تو چند متین اور بلیغ فقرے لکھ کر اپنا مطلب بخوبی ادا کر سکتے

تھے لیکن افسوس کہ آپ نے ایسا نہیں کیا ۔

میں نے رسول اللہ اور ابو بکر کے عہد میں کام کیا اور ہمیشہ اپنے فرائض ایمانداری اور محنت سے انجام دیے ، ان کا حق ہمیشہ انھیں ادا کیا ۔ ہر قسم کی بے راہ روی کو معیوب اور اسے اختیار کرنے کو اپنے لیے باعث ننگ سمجھا ۔ آپ بھی ان سب باتوں سے باخبر ہیں اور خود میرا دل بھی مطمئن ہے کہ میں نے اپنے فرائض نہایت ایمان داری اور دیانت سے انجام دیے ۔ بد دیانتی ، خیانت اور ہر قسم کے گناہ سے میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور ان تمام باتوں سے جو آپ کے خط سے ظاہر ہوتی ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل سے پاک ہوں ۔ آپ نے اپنے خط میں میری عزت و آبرو کا ذرا پاس نہ کیا ۔ اگر میں خدانخواستہ مدینہ کا یہودی ہوتا تو آپ اس سے زیادہ کیا کہتے ۔ جب میں ان باتوں پر غور کرتا ہوں تو خودداری اور عزت نفس کی وجہ سے مجھے نہایت طیش آتا ہے ۔ لیکن مجھ پر آپ کے حقوق چونکہ بہت زیادہ ہیں اس لیے ان کا خیال کر کے خاموش ہو رہتا ہوں ۔ البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ اگر آپ ان امور سے واقف ہوتے جو مجھے یہاں پیش آتے ہیں تو آپ میرے متعلق کبھی اس قسم کا گمان نہ کرتے ۔ والسلام ۔“

خراج کے متعلق حضرت عمر اور عمرو بن العاص کی خط و کتابت اسی حد تک پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی بلکہ برابر جاری رہی ۔ وجہ یہ تھی کہ مصر کا خراج دیر میں پہنچتا تھا اور حضرت عمر اس چیز کو برداشت نہ کر سکتے تھے ۔ ایک مرتبہ جب خراج پہنچنے میں دیر ہوئی تو حضرت عمر نے پھر اسی سختی اور درشتی سے عمرو بن العاص کو لکھا :

” میں تمھیں بار بار لکھتا ہوں کہ خراج بھیجو لیکن تم نہیں

بھیجتے اور مختلف حیلے بہانے کر کے ٹال دیتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں اس وقت تک تم سے راضی نہیں ہو سکتا جب تک تم سے حق نہ لے لوں۔ میں نے مصر کو تمھاری اور تمھاری قوم کی جاگیر میں نہیں دیا بلکہ تمھیں وہاں اس لیے رکھا ہے کہ تم انتظام اور حسن سیاست سے اس کا خراج بڑھاؤ گے۔ جونہی میرا خط تمھارے پاس پہنچے فوراً خراج ارسال کر دو کیونکہ وہ مسلمانوں کا مال ہے اور جیسا کہ تم جانتے ہو مدینہ میں قحط رونما ہے۔ والسلام۔"

عمرو بن العاص نے جواب میں لکھا:

" بسم اللہ الرحمن الرحیم

امیرالمومنین عمر بن الخطاب کے نام عمرو بن العاص کی طرف سے

آپ کا خط خراج کے نہ پہنچنے کے متعلق ملا۔ امیرالمومنین! آپ یہ خیال درست نہیں کہ میں نے جان بوجھ کر خراج بھیجنے میں دیر لگائی ہے یا راہ حق سے روگردانی اختیار کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں کے باشندوں نے مجھ سے اس وقت تک کے لیے مہلت مانگی جب تک ان کے غلے تیار ہو جائیں۔ ان کی درخواست پر میں نے یہی مناسب سمجھا کہ انھیں کچھ عرصے کی مہلت دے دی جائے ورنہ انھیں اپنی ضروری چیزیں بیچ دینی پڑتیں اور ایسا کرنا ان پر غیرضروری بوجھ ڈال دینے کے مترادف ہوتا۔ والسلام۔"

اس پر بھی خراج پہنچنے میں دیر ہوئی تو حضرت عمر نے آپ کو لکھا کہ مصر کے کسی باشندے کو میرے پاس بھیج دو۔ آپ نے ایک قبطی کو بھیج دیا۔ حضرت عمر نے اس سے مصر کے خراج کی کیفیت دریافت فرمائی۔ اس نے کہا:

" امیرالمومنین ! وھاں فصل کی تیاری سے پہلے خراج لینے کا دستور نہیں لیکن آپ کے عامل نے قبل از وقت ھی ھم سے خراج کا مطالبہ شروع کر دیا ھے ۔ معلوم ھوتا ھے کہ وہ صرف ایک ھی سال مصر کو اپنے پاس رکھنا چاھتا ھے ۔"

اس واقعے سے ظاھر ھوتا ھے حضرت عمر کو عمرو بن العاص کی طرف سے اتنی بدگمانی پیدا ھوگئی تھی کہ آپ نے آن کے خطوط کو درخور اعتنا نہ سمجھتے ھوئے مصر سے ایک شخص کو بلوایا اور آس سے خراج کی تحصیل کا حال پوچھا ۔ اس واقعے میں ایک اور بات بھی محل‌نظر ھے اور وہ یہ کہ عمرو بن العاص کے خط اور قبطی کے بیان میں مطابقت نہیں پائی جاتی ۔ خط میں عمرو بن العاص نے یہ لکھا ھے کہ میں نے فصلیں تیار ھونے تک مصریوں کو مہلت دے رکھی ھے اور قبطی یہ بیان کرتا ھے کہ عمرو بن العاص نے فصلیں تیار ھونے سے پہلے ھی ھم سے خراج کا مطالبہ شروع کر دیا ھے ۔ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ عمرو بن العاص کے جواب سے حضرت عمر کو تسلی نہ ھوئی تھی اور خراج کا مطالبہ آپ کی طرف سے جاری تھا ، اس لیے باوجود اس بات کے کہ آپ کاشتکاروں کو غلے کی تیاری کی مہلت دے چکے تھے لیکن حضرت عمر کے تقاضوں سے مجبور ھو کر آپ نے مقررہ وقت سے پہلے ھی مطالبہ شروع کر دیا تھا جس کی شکایت قبطی نے حضرت عمر سے کی ۔

اس کے بعد حضرت عمر نے خراج کے محکمے کو باقاعدہ بنانے اور اس کی تقسیم و خرچ کے متعلق مفصلہ ذیل ھدایات عمروبن العاص کو بھیجیں تا کہ وہ خراج کے خرچ کرنے میں اپنی من مانی نہ کر سکیں :

" اھل مدینہ اور جن مسلمانوں کے گزارے بیت المال سے مقرر

ھیں ان میں سے جو تمھارے پاس پہنچیں انھیں ان کا اور ان کی اولاد کا گزارہ دو اور جو لوگ اس قسم کے جائیں جن کے نام میرے دفتر میں درج نہ ھوں ان کے گزارے اسی اصول اور اسی حساب سے جو ان جیسے دوسرے آدمیوں کے لیے مقرر ھیں خود مقرر کر دو ۔ تم اپنے لیے دو سو دینار سالانہ لے لیا کرو ۔ یہ وہ رقم ھے جو میں نے تمھارے ھم رتبہ لوگوں میں سے کسی کو بھی نہیں دی ۔ وجہ یہ ھے کہ تم مسلمانوں کے عامل ھو اسی لیے میں نے تمھارا درجہ بڑھا دیا ھے ۔ مجھے معلوم ھؤا ھے کہ تمھیں ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے زیادہ خرچ کی ضرورت ھے اس لیے زمین کی آبادی اور زراعت کو ترقی دو تا کہ خراج میں اضافہ ھو ۔ خراج وصول کرنے کے بعد مسلمانوں کے وظائف اور تنخواھیں دینے اور ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے جس قدر رقم کی ضرورت ھو وہ رکھ لو اور باقی مدینہ ارسال کر دو ۔

”سر زمین مصر میں خمس نہیں ۔ اسے صلح کے ذریعے سے فتح ھونے والا علاقہ شمار کرو* ۔ وھاں کی آمدنی پر حکومت کا حق ھے ، وہ اسے ملکی مصالح کے لیے جس طرح چاھے خرچ کرے ۔ سب سے پہلے سرحدوں پر متعین فوجوں کی تنخواھیں ادا کرو ، پھر معلمین قرآن اور دیگر مستحق لوگوں کو ۔ یہ جان لو کہ اللہ تمھیں اور تمھارے اعمال کو دیکھ رھا ھے اور تمھارا کوئی کام اس سے چھپا ھؤا نہیں ۔

* حضرت عمر کے اس اشارے سے بھی ھمارے اس دعوے کی تصدیق ھوتی ھے کہ مصر کی فتح صلح کے ذریعے سے قرار دی گئی ، بزور شمشیر نہیں ۔ حضرت عمر کا یہ ارشاد مصر کے کسی خاص حصے کے لیے نہیں بلکہ سارے ملک کے لیے ھے ۔

" تمہاری عملداری میں ذمی اور معاہد دونوں ہیں۔ رسول اللہ نے ان لوگوں اور خصوصاً قبطیوں سے حسن سلوک کی بے حد تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا " تم قبطیوں سے اچھا سلوک کرنا کیونکہ ذمی ہونے کے علاوہ تمہارا ان سے ایک رشتہ بھی ہے۔ وہ اس طرح کہ حضرت اسماعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ مصر ہی کی تھیں۔" معاہدین کے متعلق آپ فرماتے ہیں " جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا میں قیامت کے دن اس کے مقابل میں کھڑا ہوں گا۔" لہٰذا اے عمرو! سخت احتیاط رکھو کہ رسول اللہ میدان حشر میں تم پر کوئی دعویٰ نہ کریں کیونکہ آنحضرت جس شخص کے مقابل کھڑے ہو گئے اس کا ٹھکانا سوا جہنم کے اور کہیں نہ ہوگا۔

" میں تو اس امت کی ولایت سے مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں اور اپنے آپ کو یہ بوجھ اٹھانے کے ناقابل پاتا ہوں۔ جس قدر میری رعایا پھیلتی جاتی ہے میری ہڈیاں گھلتی جاتی ہیں۔ میں کے اللہ حضور دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے پاک و صاف اٹھا لے۔ اللہ کی قسم اگر اقصائے مصر میں بھی کوئی اونٹ ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ کے حضور میری پرسش ہو گی۔"

حضرت عمر کے ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں آپ کے دل میں عمرو بن العاص کی خاص قدر و منزلت تھی (اور اسی قدرو منزلت کی وجہ سے آپ کی تنخواہ بھی بیش قرار مقرر کی تھی) وہاں آپ ان سے حساب لینے میں کسی قسم کی رو رعایت نہ کرتے تھے۔ اگر خراج پہنچنے میں دیر ہو جاتی تھی تو بڑی سختی سے محاسبہ کرتے تھے۔

معاملہ صرف شدید باز پرس ہی تک نہ محدود رہا بلکہ بلاذری کی ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ

حضرت عمر نے عمرو بن العاص کا مال ضبط کر لیا تھا ۔ اس واقعے کی تفصیل یوں ہے : جب حضرت عمر کسی شخص کو والی بناتے تو اس کے مال اسباب کی فہرست بنوا کر اپنے پاس رکھ لیتے تھے ۔ جب آپ کو معلوم ہوتا کہ کسی والی کے پاس اس کی آمدنی سے زیادہ مال جمع ہو گیا ہے تو اس کے مال کا محاسبہ کر کے جس قدر مال زیادہ ہوتا اسے بحق سرکار ضبط کر لیتے ۔ آپ کو معلوم ہؤا کہ عمرو بن العاص کے پاس مال مویشی بہت ہو گئے ہیں ۔ آپ نے انھیں لکھا کہ تمھارے پاس مال و متاع، غلام، کھانے پینے کے بیش قیمت برتن اور مویشی کثرت سے جمع ہو گئے ہیں ، حالانکہ جب تم مصر کی ولایت پر گئے تھے تو یہ چیزیں تمھارے پاس نہ تھیں ۔ جواب دو کہ یہ کہاں سے آئیں؟ عمرو بن العاص نے جواب میں لکھا کہ مصر میں زراعت اور تجارت کے لیے بے حد راستے کھلے ہوئے ہیں ۔ ہم یہاں زراعت اور تجارت میں حصہ لیتے ہیں اور جو آمدنی ہوتی ہے اس سے مختلف چیزیں خرید لیتے ہیں ۔

حضرت عمر نے یہ خط پڑھ کر محمد بن مسلمہ کو تحقیقات کے لیے مصر بھیجا اور عمرو بن العاص کو لکھا :

” مجھے معلوم ہؤا ہے کہ تمھارے کار کن برے ہیں ۔ جو خطوط تم نے مجھے بھیجے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اگر بیت المال کے حقوق تم سے طلب کیے جائیں تو تمھیں قلق اور رنج پہنچتا ہے ۔ تمھارے اس رویے کے باعث میں تم سے بدگمان ہو گیا ہوں ۔ محمد بن مسلمہ کو تمھارے پاس بھیج رہا ہوں ، ان کے سامنے اپنا سارا مال پیش کرو ۔ آمد و خرچ کا حساب اور جس رقم کا وہ تم سے مطالبہ کریں بلاتامل ان کے حوالے کر دو ۔ اگر وہ محاسبے میں کچھ سختی کریں تو معاف کر دینا کیونکہ

وہ میرے حکم سے ایسا کریں گے ۔"

عمرو بن العاص نے حضرت عمر کےحکم کی تعمیل کی اور اپنا سارا مال اسباب محمد بن مسلمہ کے سامنے حاضر کر دیا ۔ آنھوں نے محاسبے کے بعد زائد مال تقسیم کرا لیا ۔ عمرو بن العاص اشراف قریش میں سے تھے ۔ ساری عمر امارت ، ریاست اور ناز و نعم میں گزری تھی ۔ اس زمانے کی یاد اب تک ان کے دل میں باقی تھی ۔ حضرت عمر کے اس سلوک پر وہ خاموش نہ رہ سکے اور محمد بن مسلمہ سے کہنے لگے :

" یہ زمانہ ، جس میں ابن حنتمہ (حضرت عمر) ہم سے ایسا سلوک کرتے ہیں ، برا زمانہ ہے ۔ میرا باپ عاص ہمیشہ ریشمی لباس پہنتا تھا جس پر دیباج کے حاشیے لگے ہوتے تھے ۔"

محمد بن مسلمہ نے جواب دیا :

" بس کرو اگر ابن حنتمہ کا زمانہ ، جسے تم برا کہتے ہو ، نہ ہوتا تو تم آج والئی مصر ہونے کے بجائے عرب میں بکریاں چراتے پھرتے ۔"

عمرو بن العاص نے کہا :

" میں تمھیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ تم میری ان باتوں کا ذکر حضرت عمر سے نہ کرنا ۔ یہ آپس کی باتیں ہیں ۔"

محمد بن مسلمہ نے جواب دیا :

" نہیں تم خاطر جمع رکھو ۔ ہماری ان باتوں کی خبر حضرت عمر کو نہ پہنچنے پائے گی ۔"

اس واقعے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کا سلوک اپنے عمال سے کیسا تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عمر اپنے عمال کا محاسبہ کرنے اور ان کے تمام اعمال و افعال پر کڑی نظر

رکھنے میں اپنی نظیر آپ تھے - آپ کی نظروں میں بڑے سے بڑا شخص بھی ادائے حقوق کے معاملات میں رعایا کے چھوٹے سے چھوٹے شخص کے برابر تھا - کوئی شخص اپنے فرائض سے کوتاھی کر کے آپ کے عتاب سے بچ نہ سکتا تھا ، یہی وجہ ہے کہ آپ نے عمرو بن العاص جیسے عظیم الشان سپہ سالار اور بے نظیر سیاست دان کا بھی — جس نے فلسطین اور مصر میں رومیوں کی عظیم الشان سلطنت کے پرخچے آڑا دیے تھے — کوئی لحاظ نہ کیا۔ اور اس خوف سے کہ مبادا بقیہ عمال بھی انھیں کی روش پر چل کر اسلام کو ضعف پہنچانے کا باعث بنیں ، بڑی سختی سے ان کا محاسبہ کیا اور انھیں اپنی من مانی کرنے کی قطعاً اجازت نہ دی -

ع : عمرو بن العاص کی حکمت عملی

عمرو بن العاص نے مصر میں جو حکمت عملی اختیار کی اس کا مفصل تذکرہ گزشتہ ابواب میں کیا جاچکا ہے - ذیل میں اختصاراً آن تمام کارناموں کا حال ، جو آپ نے مصر میں انجام دیے ، چند سطروں میں لکھا جاتا ہے تاکہ ایک ھی نظر میں سب کارناموں پر نگاہ دوڑائی جا سکے -

فتوحات کے بعد سب سے پہلے آپ نے مصر کا نظم و نسق بہتر بنانے پر توجہ مبذول کی - اس غرض سے آپ نے ملک میں بہت سی دور رس اصلاحات کیں - خراج کی تحصیل کے لیے نئے طریقے جاری کر کے باشندوں کو اس ظلم و ستم سے نجات دی جس کا شکار وہ رومی عہد حکومت میں ھو رہے تھے - نیل کے پانی کا اندازہ کرنے کے لیے مقیاس بنوایا - رفاہ عام کے لیے جا بجا حوض ، تالاب ، کنوئیں اور پل تعمیر کرائے نیز ایسے انتظامات کیے کہ سردی ھو یا گرمی ، برسات ھو یا خشک سالی ، مصر

کے عمال کے لیے کسی بھی موسم میں ملک کے دور دراز تک کے علاقوں میں کام کرنا مشکل نہ ہو اور وہ آسانی سے ہر جگہ جا کر اپنے فرائض بخوبی انجام دے سکیں ۔

عمرو بن العاص نے جس حکمت عملی اور سیاست سے کام لیا اس وجہ سے آپ قبطیوں اور عربی افواج دونوں کے محبوب بن گئے۔ آپ کے پیش نظر ہمیشہ مصریوں کی فلاح و بہبود رہی ۔ آپ نے انھیں آرام پہنچانے ، ان کی تکالیف دور کرنے اور اس طرح ان کی محبت و تعاون حاصل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ عدل و انصاف اور محبت و ہمدردی کے اس برتاؤ کا اثر یہ ہؤا کہ مصری دل و جان سے آپ کے مطیع و فرمان بردار ہو گئے اور آپ کے لیے اپنے احکام کا نفاذ نہایت آسان ہو گیا ۔

خراج میں سے اپنے لیے صرف اتنا ہی رکھتے جو ملکی نظم و نسق چلانے اور فوج و حکام کو تنخواہیں دینے کے لیے کافی ہوتا ، باقی خلیفہ کے پاس مدینہ بھیج دیتے ۔ خراج کی شرح نہایت مناسب رکھی تا کہ باشندے اسے بار محسوس نہ کریں ۔

مصریوں کے دل ہاتھ میں لینے کے لیے آپ نے جو طریقے اختیار کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپ نے ان کے معتقدات اور احساسات کو کبھی ٹھیس نہ لگائی ۔ وہ اس امر میں بالکل آزاد تھے کہ جو عقیدہ چاہیں اختیار کریں ۔ حکومت کی طرف سے اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاتی تھی ۔ ان کی زمینیں انھیں کے پاس رہنے دی گئیں ۔ ان سے اور ان کے اهل و عیال سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا گیا اور انھیں آزاد چھوڑ دیا گیا ۔ قلعہ بابلیون پر فتح پانے کے بعد آپ نے اپنے ہاتھ سے قبطیوں کو ایک عہد نامہ لکھ کر دیا جس میں تحریر تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے قبطیوں کے کلیساؤں کی حفاظت کی

جائے گی اور جو مسلمان انہیں ان کے گرجوں سے نکالنے کی کوشش کرے گا وہ اللہ کی لعنت کا سزاوار ہو گا۔ خراج کی وصولی سے پہلے آپ نے مصریوں پر یہ امر بخوبی واضح کر دیا، اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے ملک کا نظم و نسق بہتر بنایا جائے۔ باشندوں کا معیار زندگی بلند کیا جائے اور یہ رقم ان کی فلاح و بہبود کے لیے خرچ کی جائے۔ آپ کا یہ اقرار صرف زبانی ہی نہ تھا بلکہ آپ نے اسے پورا کر کے بھی دکھا دیا۔

آپ کی سیاست کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ آپ نے رومیوں کے برعکس سلکی اور یعقوبی فرقوں کے لوگوں میں کبھی کوئی فرق نہ کیا۔ قانون کی نظر میں سب لوگ یکساں تھے اور کسی کو کسی پر کوئی فوقیت اور بڑائی حاصل نہ تھی۔ 'پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو' کی پالیسی پر آپ کبھی عمل پیرا نہ ہوئے۔ آپ کی کامیابی کا راز مساوات اور عدل و انصاف کے اصول اختیار کرنے میں مضمر تھا۔ اسی سیاست کے بل بوتے پر آپ نے وہ قابل رشک کامیابی حاصل کی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے اور جو آپ کی توقعات سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ثابت ہوئی۔ ملک کا چپا چپا دل و جان سے آپ کا مطیع و فرمانبردار اور زیرنگیں تھا اور ہر شخص کے دل میں آپ کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

ف : معزولی

مصر کی ولایت سے عمرو بن العاص کی معزولی حضرت عثمان کے عہد میں واقع ہوئی۔ مگر دیگر امور کے علاوہ مؤرخین کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ عمرو بن العاص کو مصر کی ولایت سے کس

سنه میں معزول کر کے آپ کی جگه عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو مقرر کیا گیا ۔ بعض مؤرخین کہتے ھیں که اسکندریه پر منویل کے حملے سے پہلے ہی آپ کو معزول کیا جاچکا تھا لیکن اهل مصر نے حضرت عثمان سے استدعا کی که رومیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک تجربه کار اور مدبر قائد کی ضرورت ھے اور اس غرض کے لیے عمرو بن العاص سے موزوں تر کوئی شخص نہیں کیونکه انھیں نه صرف فنون جنگ سے کلی واقفیت ھے بلکه دشمنوں کے دلوں میں ان کی ہیبت بھی بیٹھی ہوئی ھے لہٰذا آپ رومیوں سے جنگ ختم ہونے تک کے عرصے کے لیے عمرو بن العاص کو دوبارہ مصر کا والی بنا کر بھیج دیجیے ۔ حضرت عثمان نے یه درخواست قبول فرما لی اور عمرو بن العاص کو دوبارہ مصر کا والی بنا کر بھیج دیا ۔ یه روایت بلاذری اور سیوطی نے بیان کی ھے ۔ ابن اثیر نے لکھا ھے که آپ کی معزولی ۲۶ھ میں ہوئی ۔ طبری لکھتے ھیں که معزولی کا واقعه ۲۷ھ میں پیش آیا ۔ گویا ابن اثیر اور طبری کے قول کے بموجب آپ کی معزولی اسکندریه پر منویل کے حملے کے بعد وقوع میں آئی ۔

ہماری رائے میں طبری اور ابن اثیر کی بیان کردہ روایات کو ترجیح حاصل ھے ۔ کیونکه :

(اول) حضرت عثمان نے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کو افریقیه (تونس) کی مہم پر ۲۵ھ میں بھیجا اور اسی سال رومیوں نے اسکندریه پر چڑھائی کی ۔

(دوم) افریقیه کی جنگ ایک سال تین ماہ تک جاری رہی تھی ۔ یه ناممکن تھا که عبداللہ اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے ھی ایسی حالت میں مصر چلے آتے جب رومیوں کو برابر امداد پہنچ رہی تھی اور مسلمان اپنے وطن سے سیکڑوں

میل دور دشمنوں سے برسر پیکار تھے ۔ ان امور کی موجودگی میں یہی ماننا پڑے گا کہ عبداللہ بن سعد افریقیہ کی مہم پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے بعد ۲۶ھ میں مصر آئے تھے ۔

(سوم) طبری نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان نے شروع میں عمرو بن العاص سے صرف خراج کا محکمہ لے کر عبداللہ بن سعد کو دیا تھا ۔ اس پر ان دونوں میں چشمک ہو گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف دربار خلافت میں شکایات بھیجیں ۔ عبداللہ بن سعد کہتے تھے کہ عمرو بن العاص خراج میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں اور عمرو بن العاص لکھتے تھے کہ عبداللہ بن سعد جنگی کارروائیوں میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں ۔ وہاں سے عمروبن العاص کی معزولی کا حکم آیا ۔ اور عبداللہ بن سعد کو بدستور خراج کا افسر رہنے دیا گیا ۔

ہر شخص سمجھتا تھا کہ دربار خلافت میں ان دونوں کی شکایت اور وہاں سے جواب یقیناً کچھ مدت چاہتا تھا اور عمرو بن العاص کی معزولی اس قدر جلد نہ ہوئی جس قدر جلد بعض مؤرخین نے سمجھی ہے ۔ ہماری رائے میں آپ کی معزولی اسکندریہ پر رومیوں کے حملے کے بعد ۲۶ھ کے اواخر یا ۲۷ھ کے اوائل میں ہوئی ۔ یہ حقیقت ہے کہ عبداللہ بن سعد کو مصر کی ولایت افریقہ کی جنگوں کے اختتام سے پہلے سپرد نہ کی گئی ۔ اس صورت میں یہ امر صریحاً خلاف عقل ہے کہ آپ کی معزولی ۲۵ھ میں یا اس سے بھی پہلے واقع ہوئی ہو ۔

جہاں تک معزولی کے سبب کا تعلق ہے وہ یہ تھا کہ حضرت عثمان نے زمام خلافت ہاتھ میں لینے سے کچھ عرصہ بعد ارادہ کیا کہ مصر کے خراج کا محکمہ عمرو بن العاص سے لے کر عبداللہ بن سعد کو دے دیا جائے اور عمرو بن العاص کے پاس

جنگ کا محکمہ رہنے دیا جائے۔ لیکن عمرو بن العاص نے یہ فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا " یہ نہیں ہو سکتا کہ گائے کے سینگ تو میں پکڑوں اور اس کا دودھ کوئی اور دوھے ۔"

حضرت عمر کی سیاست اس بات کی مقتضی تھی کہ جنگ ، خراج اور سلطنت کے نظم و نسق کے محکمے ایک ہی شخص کے ہاتھ میں رہیں کیونکہ اول تو اس میں بہت آسانی رہتی تھی دوسرے رومیوں کے ہاں بھی یہی طریقہ رائج تھا ۔

لیکن حضرت عثمان چاہتے تھے کہ جنگ اور خراج کے محکمے علحدہ علحدہ ہاتھوں میں رہیں تا کہ ہر شخص اپنے اپنے محکمے کی طرف پوری توجہ کر سکے اور تمام امور خوش اسلوبی سے انجام پا سکیں ۔

عمرو بن العاص چونکہ فاروقی سیاست کے پیروکاروں میں سے تھے ، دوسرے مصر کے واحد فاتح ہونے کی حیثیت سے وہ طبعاً وہاں کا نظم و نسق پوری طرح اپنے کنٹرول میں رکھنے کے خواہش مند تھے ، اس لیے وہ یہ بات برداشت نہ کر سکے کہ خراج کا محکمہ ان کے ہاتھ سے نکال کر ملک کے نظم و نسق سے انہیں بے دخل کر دیا جائے اور ان کے ہاتھوں میں صرف فوجوں کی کمان رہ جائے ۔ حضرت عثمان چونکہ عمرو بن العاص کے نظریے سے اتفاق نہ رکھتے تھے اس لیے انھوں نے مجبوراً آپ کو مصر کی ولایت سے معزول کر دیا ۔ ہماری رائے میں آپ کی معزولی کا واحد سبب یہی ہے ۔

تیسرا حصہ

معزولی سے وفات تک

پہلا باب

عمرو بن العاص اور حضرت عثمان کے باہمی تعلقات

معزولی کی وجہ سے عمرو بن العاص اور حضرت عثمان میں کشیدگی پیدا ہو گئی ۔ معزولی کے بعد جب عمرو بن العاص مدینہ پہنچ کر حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اس وقت وہ ایک یمنی فرغل پہنے ہوئے تھے ۔ حضرت عثمان نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ " اس فرغل میں کیا بھرا ہؤا ہے ؟" عمرو بن العاص نے جواب دیا ' عمرو بن العاص' حضرت عثمان نے کہا " میرا مطلب یہ نہ تھا ۔ میں نے پوچھا تھا کہ اس میں روئی بھری ہوئی ہے یا کچھ اور ؟" اس کے بعد حضرت عثمان نے فرمایا " تم نے مصر میں عبداللہ بن سعد کو کس حالت میں چھوڑا ؟" عمرو بن العاص نے جواب دیا " اسی حالت میں جسے آپ پسند کرتے تھے ۔" حضرت عثمان نے پوچھا " وہ کیا ؟" آپ نے جواب دیا " اپنی ذات کے لیے قوی ، اور اللہ کے لیے کمزور ۔" حضرت عثمان نے کہا " میں نے تو اسے حکم دیا تھا کہ وہ

تمھارے نقش قدم پر چلے ۔" آپ نے جواب دیا " آپ نے ناحق اسے اتنے بڑے کام کی تکلیف دی ۔"

اس گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن العاص کو مصر سے اپنی معزولی کا کتنا رنج تھا اور وہاں کے نئے والی کو کس نظر سے دیکھتے تھے ۔

اس کے بعد آپ مدینہ چھوڑ کر فلسطین چلے گئے اور وہاں اپنے محل ' عجلان ' میں سکونت اختیار کر لی ۔ حضرت عثمانؓ کے عہد میں جو فتنہ پرورش پا رہا تھا اس پر آن کی کڑی نظر تھی۔ اور وہ حالات کا جائزہ لینے کے لیے فلسطین سے وقتاً فوقتاً مدینہ آتے رہتے تھے۔ حضرت عثمانؓ بھی ان کی اصابت رائے کے باعث اہم امور میں ان سے برابر مشورہ لیتے رہتے تھے ۔ جب فتنے کی آگ پورے زور شور سے بھڑکنے لگی تو حضرت عثمانؓ نے انھیں بلایا اور فتنہ فرو کرنے کے بارے میں مشورہ لیا۔ آپ نے اس موقع پر جو مشورہ دیا وہ سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے ۔ آپ نے فرمایا:

" فتنے کا اصل باعث یہ ہے کہ آپ نے اس کے سرغنوں کو ضرورت سے زیادہ ڈھیل دے رکھی ہے اور ان سے بے حد نرمی کا سلوک کر رہے ہیں حالانکہ حضرت عمر کا یہ طریقہ نہ تھا۔ وہ کبھی اس قماش کے لوگوں سے نرمی کا سلوک نہ کرتے تھے۔ آپ کو بھی اپنے پیش رو کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور سختی کے موقع پر سختی اور نرمی کے موقع پر نرمی برتنی چاہیے ۔ سختی ان لوگوں کے لیے جو نرمی کا اثر قبول نہ کریں اور نرمی ان لوگوں کے لیے جن پر معمولی نصیحت بھی کارگر ہو جائے ۔ لیکن آپ دونوں قسم کے لوگوں سے نرمی برت کر فتنہ پرداز لوگوں کو شرارت میں اور زیادہ بڑھنے کا موقع دے رہے ہیں ۔"

ایک اور موقع پر پھر حضرت عثمان نے عمرو بن العاص سے فتنے کے بارے میں رائے دریافت کی تو انھوں نے کہا :

" فتنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ نے بنوامیہ کو ضرورت سے زیادہ عہدے دے رکھے ہیں اس وجہ سے لوگ آپ کے خلاف ہو گئے ہیں ۔ آپ کو اپنی اس حکمت عملی پر نظر ثانی کرنی چاہیے ۔"

حضرت عثمان نے یہ سن کر بات کا رخ کسی اور طرف پلٹ دیا ۔ جب دوسرے حاضرین اٹھ کر چلے گئے تو عمرو بن العاص نے کہا :

" امیرالمومنین ! آپ یقین جانیے میں آپ کا دلی خیرخواہ ہوں ۔ آپ میرے بزرگ ہیں ۔ مجھے معلوم تھا کہ ان لوگوں میں سے جو یہاں بیٹھے ہوئے تھے بعض لوگ فتنہ پردازوں کے جاسوس تھے ۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ آپ نے مجھے مشورے کے لیے بلایا ہے ۔ میں نے جو باتیں آپ سے کہیں وہ اس لیے کہیں کہ انھیں میری طرف سے شبہہ نہ ہو ۔ اور اس طرح میں فتنہ فرو کرنے میں آپ کی مدد کر سکوں ۔"

طبری نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ ایک دن حضرت عثمان نے عمرو بن العاص کو خلوت میں بلا بھیجا ۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچے تو آپ نے کہا " مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگوں میں میرے خلاف نفرت کے جذبات بھڑکاتے رہتے ہو حالانکہ مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے تم اپنے کو میرا بڑا خیرخواہ ظاہر کرتے ہو۔ یہ دو عملی میری سمجھ سے بعید ہے ۔" عمرو بن العاص نے جواب دیا " امیرالمومنین ! آپ کن لوگوں کی باتوں میں آ گئے ؟ حاسدین حاکموں کے حضور اپنے دشمنوں

کے متعلق ایسی ہی جھوٹی سچی باتیں منسوب کرتے رہتے ہیں ۔"
حضرت عثمان کو ان کی باتوں سے تسلی نہ ہوئی اور انھوں نے کہا
" لوگ تمھاری شکایتیں کثرت سے میرے پاس کرتے تھے لیکن
میں نے تمھیں بدستور مصر کا حاکم بنائے رکھا ۔" عمرو بن العاص
نے جواب دیا " مجھے حضرت عمر نے مصر کا حاکم بنایا تھا اور
وہ اپنی وفات کے وقت تک مجھ سے بے حد خوش تھے ۔"
حضرت عثمان نے کہا " اگر میں بھی تم سے عمر کا سا سلوک
کرتا تو تم سیدھے رہتے لیکن میں نے تم سے نرمی برتی اس لیے تم
سر چڑھ گئے ۔ میں جاہلیت میں بھی شہرت و اقتدار اور عزت میں
بڑھ چڑھ کر تھا اور خلافت ملنے سے پہلے بھی ۔" عمرو بن العاص
نے جواب دیا " یہ باتیں چھوڑیے ۔ اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں
رسول اللہ کے ذریعے سے ہدایت اور عزت عطا فرمائی ۔ آپ نے میرے
باپ عاص بن وائل کو دیکھا ہوگا اور میں نے آپ کے والد عفان
کو دیکھا ہے ۔ عاص آپ کے والد سے یقیناً زیادہ معزز تھے ۔"
حضرت عثمان نے کہا " زمانۂ جاہلیت کی باتیں کرنے سے کیا
فائدہ ؟" اس پر گفتگو ختم ہوگئی اور عمرو بن العاص حضرت عثمان
کے پاس سے چلے آئے ۔

جب حضرت عثمان کا محاصرہ کر لیا گیا تو عمرو بن العاص
مدینہ چھوڑ کر فلسطین چلے گئے لیکن نظریں ہمیشہ مدینہ ہی کی
جانب لگی رہتی تھیں ۔ جو بھی شخص مدینہ کی طرف سے آتا اس
سے حضرت عثمان کا حال ضرور پوچھتے ۔ آخر وہیں انھیں شہادت
حضرت عثمان کی خبر ملی ۔

دوسرا باب

حضرت علی اور حضرت معاویہ سے تعلقات

۱: آپ نے حضرت علی کے مقابلے میں حضرت معاویہ کو کیوں ترجیح دی ؟

حضرت علی کے خلیفہ ہوتے ہی مسلمانوں کا انتشار آئے دن بڑھنے لگا اور مسلمان مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک فریق حضرت عثمان کے انتقام کا مطالبہ لے کر کھڑا ہو گیا ۔ یہ فریق امویوں کا تھا اور اس کے سرخیل حضرت معاویہ تھے۔ ایک فریق ان لوگوں کا تھا جنھوں نے حضرت عثمان کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے اور آنھیں شہید کرنے میں براہ راست حصہ لیا تھا ۔ ان لوگوں نے حضرت علی کے سایۂ عاطفت میں پناہ ڈھونڈی ۔ چونکہ یہ پہلے ہی خلیفہ رسول اللہ کو شہید کر چکے تھے اور لوگوں پر ان کی ہیبت طاری تھی اس لیے ان کی ہمتیں بڑھ گئیں اور وہ ملک میں فتنہ و فساد برپا کر کے لوگوں کو خوف زدہ کرنے لگے ۔ ایک فریق ان لوگوں کا تھا جو حضرت عثمان کا انتقام لینے کے بارے میں امویوں کے ہم نوا اور ملک میں ایسے نظام حکومت کی ترویج کے خواہش مند تھے جو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کی اختیار کردہ سیاست پر مبنی ہو ۔ اس گروہ کو حضرت طلحہ ، حضرت زبیر ، اور حضرت عائشہ کی رہنمائی حاصل تھی ۔

طلحه اور زبیر نے ابتدا میں بحالت اضطرار و مجبوری حضرت علی سے بیعت کی تھی لیکن بعد میں انھوں نے یہ بیعت فسخ کر دی اور حضرت علی کے مقابلے کے لیے میدان میں نکل آئے۔ عمرو بن العاص کو اگرچہ حضرت عثمان کی سیاست سے اختلاف تھا لیکن انھوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت علی کو چھوڑ کر اس فریق کا ساتھ دیا جائے جو حضرت عثمان کے انتقام کا مطالبہ کر رہا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ حضرت علی اپنے آپ پر کسی قسم کی تنقید کے روا دار نہ تھے بلکہ یہ چاہتے تھے کہ جو کچھ وہ کہیں یا کریں لوگوں کو اس پر بے چون و چرا عمل کرنا چاہیے۔ وہ اپنی رائے کو ہمیشہ مقدم رکھتے تھے اور دوسروں کے مشوروں کو بہت کم قبول کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق اہم امور اہل الرائے اصحاب سے مشورہ لیے بغیر انجام نہ دیتے تھے لیکن حضرت علی میں یہ بات نہ تھی۔ ان امور کو دیکھتے ہوئے عمرو بن العاص کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ حضرت علی کی متابعت اختیار کرتے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے حضرت علی کے فریق کے علاوہ دو فریق اور سرگرم عمل تھے۔ ایک فریق طلحہ و زبیر اور حضرت عائشہ کا اور دوسرا معاویہ کا۔ عمرو بن العاص جانتے تھے کہ حضرت عائشہ اور طلحہ و زبیر کا گروہ اس قدر طاقت ور نہیں کہ وہ حضرت علی پر غالب آ جائے گا اور حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کی جاری کردہ سیاست پر مبنی نظام حکومت قائم ہو سکے گا۔ البتہ معاویہ کے متعلق انھیں یہ خیال تھا کہ تمام اہل شام چونکہ ان کے ہم نوا ہیں اور وہ خود بھی نہایت با تدبیر، جہاں دیدہ اور

دور اندیش سیاست دان ہیں اس لیے ان کے حضرت علی پر غالب آنے کی امید ہو سکتی ہے - عمرو بن العاص یہ بھی جانتے تھے کہ معاویہ سے مل جانے کے بعد معاویہ ان کے گراں قدر مشوروں سے کبھی بے نیاز نہ ہوسکیں گے - اس صورت میں انہیں وہی عزت و شہرت حاصل ہو سکے گی جو حضرت ابوبکرصدیق اور حضرت عمر کے عہد میں حاصل تھی -

ان امور کے پیش نظر عمرو بن العاص نے حضرت علی اور طلحہ و زبیر کے مقابلے میں معاویہ کا ساتھ دینے کو ترجیح دی اور ان کے ساتھ انتقام عثمان کے ہمہ‌گیر مطالبے میں شریک ہو گئے -

ب : جنگ صفین

معاویہ نے شام میں جو پالیسی اختیار کی تھی اور جس خوش اسلوبی سے وہاں کا نظام حکومت چلایا تھا اس کی وجہ سے آپ کی محبت شامیوں کے دلوں میں گھر کر چکی تھی اور وہ لوگ آپ کے ادنیٰ اشارے پر جانیں قربان کر دینے کے لیے تیار رہتے تھے - یہی حال لشکر کا بھی تھا اور وہ بھی احکام بجالانے کے لیے آپ کے اشاروں کا منتظر رہتا تھا -

معاویہ کی حضرت عثمان سے رشتہ‌داری تھی اور آپ کے سارے عہد حکومت میں وہ شام کی ولایت پر برقرار رہے تھے - جب حضرت علی خلیفہ ہوئے تو آپ نے یہ ضروری سمجھا کہ معاویہ کو شام کی ولایت سے معزول کر دیا جائے - لیکن ایسا کرنا آسان نہ تھا کیونکہ سارا شام ان کی پشت پر تھا - جب معاویہ نے دیکھا کہ حضرت علی ان کی معزولی کی درپے ہیں تو انہوں نے حضرت علی کے خلاف پروپیگنڈے اور حضرت عثمان کے انتقام

کا مطالبہ کرنے کی مہم تیزتر کر دی ۔ آپ کی طرف سے ان پر دو الزام لگائے جاتے تھے ، اول یہ کہ انھوں نے حضرت عثمان کی شہادت میں حصہ لیا (اگرچہ حضرت علی اس الزام سے بالکل پاک ہیں) دوم یہ کہ انھوں نے قاتلین عثمان کو پناہ دے رکھی ہے ۔

جنگ جمل میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد حضرت علی کوفہ تشریف لے آئے اور وہاں سے جریر بن عبداللہ بجلی کو معاویہ کے پاس بیعت لینے کے لیے بھیجا ۔ ایک خط بھی انھیں دیا جس میں آپ نے انصار و مہاجرین کی بیعت ، طلحہ و زبیر کے فسخ بیعت اور ان کے انجام کی تفصیل لکھنے کے بعد معاویہ کو بیعت کرنے اور اطاعت قبول کرنے کی دعوت دی تھی ۔ معاویہ نے یہ خط پڑھ کر جریر کو تو حضرت علی کی دعوت پر اچھی طرح غور و خوض کرنے کے بہانے چند روز کے لیے ٹھہرا لیا اور فوراً عمرو بن العاص کو ، جو اس وقت فلسطین میں مقیم تھے ، یہ خط لکھا :

" علی ، طلحہ اور زبیر کے درمیان جو واقعات پیش آئے ان کی تفصیل آپ کو معلوم ہوچکی ہوگی ۔ اب علی نے جریر بن عبداللہ کو بیعت لینے کے لیے میرے پاس بھیجا ہے ۔ مجھے آپ کا انتظار ہے آپ فوراً میرے پاس پہنچیے ۔ "

(یعقوبی ، جلد اول ، صفحہ ۳۱۰)

جب عمرو بن العاص کو معاویہ کا خط ملا تو انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں عبداللہ اور محمد کو بلایا اور ان سے اس خط کی روشنی میں مشورہ طلب کیا ۔ عبداللہ نے معاویہ کے پاس جانے کی مخالفت کی لیکن محمد نے جانے پر زور دیا ۔ عمرو بن العاص نے محمد کے مشورے پر عمل کیا اور دمشق روانہ ہو گئے ۔ دمشق

پہنچ کر آپ نے معاویہ کو مشورہ دیا کہ حضرت علی کی بیعت سے انکار کر دیجیے، ان سے حضرت عثمان کے خون کا مطالبہ برابر جاری رکھیے اور اگر ضرورت پڑے تو شامی فوج لے کر ان کے ساتھ لڑائی کرنے سے بھی گریز نہ کیجیے -

مشہور شیعہ مؤرخ یعقوبی کی روایت ہے کہ جب عمرو بن العاص معاویہ کے پاس پہنچے تو معاویہ نے ان سے کہا "اپنا ہاتھ بڑھائیے اور میری بیعت کیجیے -" عمرو بن العاص نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا - میں اپنا دین اس وقت تک آپ کے حوالے نہیں کر سکتا جب تک آپ کی دنیا سے اپنا حصہ نہ لے لوں -" معاویہ نے کہا "معلوم ہوتا ہے آپ کی نگاہ مصر پر ہے - آپ مجھے ایک رات کی مہلت دے دیجیے اور میرے پاس ہی آرام کیجیے - میں اس مطالبے پر غور کروں گا -" عمرو بن العاص راضی ہو گئے - اس موقع پر آپ نے یہ اشعار بھی پڑھے :

معاویَ لا اعطیک دینی ولم انل
بـه منک دنیاً فانظرن کیف تصنع
فان تعطنی مصراً فاربح بصفقة
اخـذت بـها شیخاً یضرو ینفع

(اے معاویہ ! میں اس وقت تک اپنا دین تمہارے حوالے کر کے اس کے بدلے تم سے دنیا حاصل نہ کروں گا جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ تم مجھ سے کیا معاملہ کرتے ہو - تم مجھے مصر دے دو اور اس کے بدلے گراں بہا فائدہ حاصل کر لو - مصر دے کر تم ایک ایسے شخص کو اپنے قبضے میں کر لو گے جو نقصان بھی پہنچا سکتا ہے اور فائدہ بھی -)

آخر معاویہ کو عمرو بن العاص کا یہ مطالبہ ماننا پڑا - جس

پر عمرو بن العاص نے معاویہ کی بیعت کر لی ۔ (یعقوبی ، جلد اول ، صفحہ ۲۱۶)

ہمارے خیال میں یعقوبی نے اس روایت میں عمرو بن العاص کی طرف جو باتیں منسوب کی ہیں وہ سب غلط اور من گھڑت ہیں اور عمرو بن العاص کی مخالفت کے باعث ان کی جانب منسوب کر دی ہیں ۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایسے جلیل القدر شخص کے پیش نظر صرف دنیوی جاہ و جلال اور حکومت و عزت ہو اور معاویہ کی بیعت کے لیے وہ ولایت مصر کی رشوت طلب کریں ۔

رہا معاویہ کی بیعت کرنا ، اس کی بھی کسی ذریعے سے تصدیق نہیں ہو سکی ۔ یہ بات کیونکر عقل میں آ سکتی ہے کہ عمرو بن العاص جیسے ذہین و فطین شخص ابتدا ہی میں معاویہ کی بیعت کر لیتے جب سیاسی فضا انتہائی غیر یقینی تھی ۔ حضرت علی جنگ جمل میں شاندار فتح حاصل کر چکے تھے اور شام کو معاویہ کے ہاتھوں سے چھیننے کے لیے تیاریاں کر رہے تھے ۔ کیا عمرو بن العاص اس بات سے ناواقف تھے کہ حضرت عثمان کے بعد اگر کوئی شخص خلافت کا صحیح حق دار ہے تو وہ حضرت علی ہیں ؟ کیا وہ حضرت علی کی بے نظیر شجاعت سے بے خبر تھے ؟ ان مذکورہ حقائق کی روشنی میں ، جب مملکت کی سیاسی حالت ڈانواں ڈول ہو رہی تھیؔ ، کوئی شخص یہ خیال کر سکتا ہے ، عمرو بن العاص کی سادگی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ آپ ہی سب سے پہلے معاویہ کی بیعت کرنے والے بنتے ؟ اگر معاویہ کو بیعت لینی ہوتی تو لازماً وہ یہ بیعت اہل شام اور اپنے دیگر حامیوں کے سامنے علانیہ لیتے تا کہ لوگوں کے دلوں پر یہ اثر پڑتا کہ جب عمرو بن العاص جیسے جلیل القدر شخص نے معاویہ

کی بیعت کر لی ہے تو یقیناً وہ خلافت کے حق دار ہیں ۔ لیکن تمام مؤرخین نے ، جن کی کتابوں تک ہمیں رسائی ہو سکی ہے ، اس قسم کا کوئی واقعہ بیان نہیں کیا ۔ نہ انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ عمرو بن العاص نے کس جگہ معاویہ سے بیعت کی اور نہ یہ لکھا ہے کہ کن لوگوں کے سامنے یہ بیعت کی گئی ۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز ممکن ہے وہ یہ ہے کہ عمرو بن العاص نے معاویہ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور بس ۔

معاویہ کی طرف سے صاف جواب ملنے پر جریر حضرت علی کے پاس واپس پہنچے اور آپ کے سامنے معاویہ اور شام کے تمام حالات کی تفصیل بیان کی ۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت عثمان کی خون آلودہ قمیص اور حضرت نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں جامع دمشق کے منبر پر لٹکی ہوئی ہیں ۔ لوگ آتے ہیں اور انھیں دیکھتے ہی ڈاڑھیں مار مار کر رونے لگتے ہیں ۔ انھوں نے قسم کھائی ہے کہ اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک حضرت عثمان کا انتقام نہ لے لیں گے ۔ چونکہ معاویہ نے ان کے دلوں میں یہ بات راسخ کر دی ہے کہ حضرت عثمان کی شہادت میں آپ کا حصہ ہے اور آپ نے ان کے قاتلوں کو پناہ دے رکھی ہے اس لیے وہ سب آپ سے لڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں ۔

حضرت علی نے جب اہل شام کی جنگی تیاریوں کا حال سنا تو وہ نوے ہزار کی جمیعت کے ہمراہ ۲۰ شوال ۳۶ھ کو کوفہ سے صفین روانہ ہوئے ۔ ادھر شام سے معاویہ پچاسی ہزار کا لشکر لے کر روانہ ہوئے ۔ معاویہ نے حضرت علی کے پہنچنے سے پہلے دریائے فرات کے کنارے ایک ہموار میدان میں ڈیرے ڈال لیے ۔ حضرت علی اور آپ کے لشکر کو صحرا میں ڈیرے ڈالنے پڑے ۔ چونکہ ان کے لیے پانی تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس

لیے لشکر کو ابتدا میں پیاس کی سخت تکلیف برداشت کرنی پڑی ۔ عمرو بن العاص نے معاویہ سے کہا " علی ، اس حال میں کہ نوے ہزار کا لشکر اُن کے ہمراہ ہے اور اُن کی تلواریں اُن کے کندھوں سے لٹک رہی ہیں ، کبھی پیاسا مرنے کے لیے تیار نہ ہوں گے ۔ اس لیے تم انہیں فرات سے پانی لینے کی اجازت دے دو ۔ وہ بھی پئیں تم بھی پیو ۔" لیکن معاویہ نے عمرو بن العاص کی بات نہ مانی اور کہنے لگے :

" اُنھیں اسی طرح پیاس سے مرنا چاہیے جس طرح انہوں نے عثمان کو پیاسا مارا تھا ۔"

جب حضرت علی کے لشکر میں یہ بات پہنچی تو وہاں سخت ہیجان برپا ہو گیا ۔ ایک شخص نے جوش میں آ کر یہ اشعار پڑھے :

ایمنعنا القوم ماء الفرات ۔۔۔ وفینا الرماح و فینا الجحف
وفینا علی لہ صولۃ ۔۔۔ اذا خوفوہ الردیٰ لم یخف
و نحن غداۃ لقینا الزبیر ۔۔۔ و طلحۃ خضنا غمار التلف
فمابالنا امس اسد العرین ۔۔۔ و ما بالنا الیوم شاۃ النجف

(کیا یہ شامی ہمیں فرات کے پانی سے روک سکیں گے حالانکہ ہم نیزوں اور تلواروں سے پوری طرح مسلح ہیں ۔ ہم میں علی ہیں جن کے حملوں کا کوئی شخص مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ دشمن انہیں ہلاکت سے ڈراتا ہے لیکن انہیں ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوتا ۔ ہم نے کل زبیر اور طلحہ کا مقابلہ کیا اور اور ہم بے دھڑک ہلاکت کے غبار میں گھس گئے جس نے ہمیں پوری طرح ڈھانپ لیا ۔ ہم کل تک جنگل کے شیر تھے کیا آج بزدل بھیڑ بن جائیں گے ؟)

ان اشعار نے پورے لشکر میں زبردست جوش و خروش پیدا کر دیا ۔ آخر حضرت علی نے ایک دستہ بھیجا جس نے جا کر معاویہ کے لشکر کو پانی سے ہٹا دیا اور خود اس جگہ قبضہ کر لیا ۔ اب معاویہ کے لشکر کی وہی حالت تھی جو اس سے قبل حضرت علی کے لشکر کی تھی ۔ جب پیاس نے سخت تنگ کیا تو معاویہ نے قاصد بھیج کر حضرت علی سے فرات کا پانی اپنے لشکر کے لیے حاصل کرنے کی درخواست کی جو حضرت علی نے بڑی فراخ دلی سے منظور کر لی ۔ دو روز بعد معاویہ نے ایک وفد حضرت علی کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا کہ آپس میں اتحاد کی کوئی صورت پیدا ہو سکے ۔ باہمی گفت و شنید کے بعد طے پایا کہ اواخر محرم ۳۷ھ تک لڑائی بند رہے اور اس مدت میں اتحاد کی کوئی صورت نکالی جائے ۔ لیکن افسوس کہ اتحاد کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور محرم گزرنے پر دونوں فریقوں میں جنگ شروع ہو گئی * ۔

صلح کی گفت و شنید کی ناکامی کے ذمہ دار حضرت علی اور معاویہ دونوں کے وفد ہیں ۔ فریقین کے نمائندے نہایت سخت زبان میں گفتگو کرتے تھے ۔ سیاست کی سوجھ بوجھ ہر دو فریق کے مندوبین میں بہت کم تھی ۔ نتیجۃً دونوں فریقوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف غیظ و غضب کی آگ اور زور سے بھڑکنے لگی ۔ طبری کی بیان کردہ روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علی کے قاصدوں میں تکبر اور خود پسندی بے حد تھی ، افتراق و انشقاق اور غرور و خود ستائی کے کلمات بہ کثرت ان کی

---

* الامامۃ و السیاستۃ از ابن قتیبہ (جلد اول ، صفحہ ۱۷۲)۔
مروج الذہب از مسعودی (جلد ۲ ، صفحہ ۱۴ - ۱۵)

زبانوں سے نکلتے تھے ۔ انھیں کسی صورت میں صلح کے پیغامبر نہ کہا جا سکتا تھا ۔ معاویہ بھی انھیں نہایت سختی اور تندی سے جواب دیتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں اہل جمل پر فتح حاصل کرنے کی وجہ سے کچھ غرور پیدا ہو گیا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان کے ہاتھوں معاویہ کے لشکر کا بھی وہی حشر ہوگا جو بصرہ میں حضرت عائشہ کے لشکر کا ہؤا تھا ۔

یکم صفر ۳۷ھ کو دوبارہ لڑائی شروع ہوئی ۔ ابتدا میں عام مقابلہ نہ تھا بلکہ روزانہ دونوں فوجوں سے ایک ایک بہادر میدان سے نکل آتا اور دونوں میں مقابلہ شروع ہو جاتا ۔ سات روز اسی طرح گزر گئے آخر حضرت علی نے اپنی فوج سے کہا ” کب تک ہم شامیوں پر عام دھاوا کرنے سے گریز کرتے رہیں گے ۔ ہمیں عام مقابلے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے ۔ چنانچہ عام مقابلے کی تیاریاں ہونے لگیں ۔ اس موقعے پر ایک شاعر نے کہا :

اصبحت الا مـــة فی امر عجب
والا مر مجموع غدا لمن غلب
فقلت قولاً صادقاً غیر کـــذب
ان غداً تہلک اعلام العـــرب

(اُمت ایک عجیب مخمصے میں پھنس گئی ہے ۔ اُمت کی سواری کا تاج اُسی کے سر پر رکھا جائے گا جو کل میدان جنگ میں اپنے حریف پر غالب آئے گا ۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ کل عرب کے سردار اور اُمت کے بڑے بڑے ستون میدان جنگ میں کام آ جائیں گے ۔)

بہت دنوں تک فریقین میں جنگ جاری رہی ۔ حضرت عمار

بن یاسر کی شہادت کے بعد جنگ میں تیزی آ گئی اور حضرت علی کے لشکر نے عمار کی شہادت سے جوش میں آ کر معاویہ کے لشکر پر پورے زور شور سے حملہ کر دیا اور انھیں دبانا شروع کر دیا ۔ بظاہر یہ دکھائی دے رہا تھا کہ حضرت علی کی فوج کو چند گھنٹوں میں فتح حاصل ہونے والی ہے ۔ یہ حالت دیکھ کر معاویہ نے اپنی فوج کے تمام زیرک اور ہوشیار اشخاص کو جمع کر کے ان سے مشورہ طلب کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ اس موقع پر عمرو بن العاص نے جو مشورہ دیا اس نے نہ صرف جنگ کا پانسا پلٹ دیا بلکہ آئندہ رونما ہونے والے واقعات پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا ۔ آپ نے یہ رائے دی کہ فوج میں سے جس جس شخص کے پاس قرآن شریف ہو وہ اسے نیزے پر اٹھا لے اور عراقیوں سے کہے " یہ کتاب اللہ ہے جو ہمارے اور تمھارے درمیان فیصلہ کرے گی ۔ اس لیے جنگ بند کر دو اور کتاب اللہ کے فیصلے کو قبول کر لو ۔" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ۔ جن جن لوگوں کے پاس قرآن مجید کے نسخے تھے انھوں نے انھیں نیزوں پر اٹھا لیا اور بلند آواز سے کہنے لگے " لوگو ! ہم کتاب اللہ کو اپنا حکم ٹھہراتے ہیں ۔ آؤ ، اور اس کے مطابق فیصلہ کر لو ۔" جب اہل عراق نے قرآن عزیز کے نسخے نیزوں پر چڑھے ہوئے دیکھے تو انھوں نے بھی کہا " بے شک ہم کتاب اللہ کا فیصلہ قبول کرنے کے لیے تیار ہیں ۔"

عمرو بن العاص کا مقصد اس تدبیر کے ذریعے سے دو عظیم الشان مقصد حاصل کرنا تھا اور وہ انھوں نے بحسن و خوبی حاصل کر لیے ۔

اول: حضرت علی کے لشکر کی طاقت کو توڑنا ۔

دوم: ان میں افتراق پیدا کر کے آئندہ انھیں لڑائی سے باز رکھنا ۔

حضرت علی نے اپنے ساتھیوں کو بے حد سمجھایا کہ ایسا کرنے سے معاویہ کی غرض تمہیں دھوکا دینا ہے اس لیے تم لڑائی جاری رکھو لیکن انھوں نے آپ کی نصیحت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور لڑائی سے ہاتھ کھینچ لیا ۔ اشتر ابھی تک دشمنوں سے جنگ کر رہا تھا ، انھوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ اشتر کو واپس بلا لیا جائے ۔ ناچار حضرت علی نے اشتر کی طرف آدمی بھیجا کہ لڑائی بند کر کے واپس چلے آؤ ۔ اشتر نے کہلا بھیجا کہ اس وقت مجھے میدان جنگ سے واپس بلانا اور مجھے میری جگہ سے ہٹانا قطعاً مناسب نہیں ، امید ہے کہ جلد ھی مجھے فتح حاصل ھوگی اس لیے قدرے توقف کریں ۔ جب قاصد نے اشتر کا یہ پیغام حضرت علی کو جا کر سنایا تو ھر طرف شور و غل برپا ھو گیا اور آپ کے ساتھیوں نے آپ سے کہا ”معلوم ھوتا ھے کہ آپ ھی نے اسے لڑتے رھنے کا حکم بھیجا ھے ، یا تو اسے واپس بلائیے ورنہ ھم آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے ۔“ اس پر حضرت علی نے قاصد سے کہا ، اشتر سے جا کر کہو کہ وہ واپس آ جائے کیونکہ خود ھماری فوج میں فتنہ برپا ھو گیا ھے ۔ چنانچہ اسے میدان جنگ چھوڑ کر واپس آنے کے سوا کوئی چارہ نہ رھا ۔

جب لڑائی بالکل بند ھوگئی تو حضرت علی نے اشعث بن قیس کو معاویہ کے پاس یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ وہ کیا چاھتے ھیں ۔ معاویہ نے جواب دیا :

” ھم یہ چاھتے ھیں کہ ھم تم کتاب اللہ کو اپنا حکم مان لیں اور جو وہ فیصلہ کرے اسے قبول کر لیں ۔ اس غرض کے لیے تم اپنے میں سے ایک آدمی منتخب کر لو ، ھم اپنے میں

سے ایک آدمی منتخب کر لیں گے ۔ ان دونوں کے سپرد یہ کام ہو گا کہ وہ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے احکام کے مطابق فیصلہ کریں ۔"

اشعث نے جا کر معاویہ کا پیغام حضرت علی کو سنا دیا ۔ آپ کے ساتھیوں نے کہا "ہمیں یہ طریق قبول ہے ۔ واقعی اسی طرح فیصلہ ہونا چاہیے ۔"

اہل شام نے عمرو بن العاص کو اپنا نمائندہ مقرر کیا اور اہل عراق نے ابوموسیٰ اشعری کو ۔ اس پر حضرت علی نے فرمایا "تم نے پہلے ہی میری نافرمانی کی ہے ، اس مرتبہ میری نافرمانی نہ کرو اور ابوموسیٰ کو حکم مقرر نہ کرو کیونکہ وہ کمزور آدمی ہیں ، ایسا نہ ہو کہ ان کے تقرر سے تمہیں کوئی نقصان پہنچ جائے ۔ لیکن عراقیوں نے ابوموسیٰ ہی کو اپنا نمائندہ بنانے پر اصرار کیا ۔ آخر مجبوراً حضرت علی کو بھی انہیں کے تقرر کی منظوری دینی پڑی ۔ (یعقوبی اور مسعودی)

ج : عمرو بن العاص اور تحکیم

(۱) معاہدۂ تحکیم ۔ عمرو بن العاص اور ابو موسیٰ اشعری دومۃالجندل میں ملے اور صفر ۳۷ھ میں معاہدۂ تحکیم لکھا گیا ۔ معاہدے کی عبارت ہم طبری (جلد اول ، صفحہ ۳۳ - ۳۴) سے لے کر نقل کرتے ہیں :

" بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ یہ وہ عہد نامہ ہے جس پر علی بن ابی طالب نے اہل کوفہ اور ان کے مومن اور مسلم ساتھیوں کی طرف سے اور معاویہ بن ابی سفیان نے اہل شام اور

ان کے مومن اور مسلم ساتھیوں کی طرف سے اتفاق کیا ہے ۔ اس عہد نامے کی رو سے طے پایا ہے کہ ہم اللہ عزو جل اور اس کی پاک کتاب کا فیصلہ قبول کریں گے ، اس کے سوا اور کسی کے فیصلے کو نہیں ۔ کتاب اللہ شروع سے آخر تک ہمارے درمیان فیصلہ کن ہو گی ۔ ہم وہی کریں گے جس کا وہ ہمیں حکم دے گی اور ہر اس چیز سے رک جائیں گے جس سے وہ ہمیں منع کرے گی ۔ 'عبداللہ بن قیس ابوموسیٰ اشعری' اور 'عمروبن العاص قرشی' حکم مقرر کیے گیے ہیں ۔ وہ دونوں کتاب اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں گے اور اگر کوئی بات کتاب اللہ میں نہ ملے گی تو سنت عادلہ جامعہ کی طرف رجوع کریں گے ۔

" علی ، معاویہ ، ان دونوں کے لشکروں اور دیگر سربرآوردہ اشخاص کی طرف سے حکمین کو ان کی حفاظت جان و مال کا پورا یقین دلایا جاتا ہے اور وعدہ کیا جاتا ہے کہ جو کچھ وہ فیصلہ کریں گے امت اس کے نفاذ میں ان کی پوری پوری مدد کرے گی ۔ تمام مومنوں اور مسلمانوں پر ، خواہ وہ کسی فریق سے تعلق رکھتے ہوں ، واجب ہے کہ وہ اس عہد نامے کا احترام کریں اور حکم جو فیصلہ کریں اسے کشادہ دلی سے قبول کر لیں ۔ عبداللہ بن قیس ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن العاص کے لیے ضروری ہے کہ وہ جو فیصلہ کریں کتاب اللہ اور سنت نبوی کے مطابق کریں اور جنگ کو بھڑکانے اور امن و امان میں خلل اندازی کرنے والی ہرحرکت سے اجتناب کریں ۔ انھیں فیصلہ کرنے کے لیے رمضان تک سہلت دی جاتی ہے ۔ اگر بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر فیصلے میں تاخیر کرنی پڑے تو وہ باہمی رضامندی سے ایسا کر سکتے ہیں ۔ اگر حکمین میں سے کوئی وفات پا جائے تو اس گروہ کا سربراہ اس کے بجائے کسی ایسے شخص کو مقرر کر دے جو

عدل و انصاف میں مشہور ہو ۔ حکمین اپنے فیصلے کا اعلان کسی ایسے مقام پر کریں گے جو عراق اور شام کے وسط میں ہوگا ۔ اس موقعے پر انھیں اختیار ہوگا کہ جس شخص کو چاہیں وہاں آنے کی اجازت دیں اور جس شخص کو نہ چاہیں اجازت نہ دیں ۔ اس کے بعد وہ اس عہد نامے کے مطابق اپنی شہادتیں قلم بند کریں ۔ اگر کوئی شخص اس معاہدے کو پس پشت ڈالنا اور ظلم و تعدی سے کام لینا چاہے تو اس فریق کا فرض ہوگا کہ وہ اس سے کامل بے تعلقی کا اظہار کرے اور صلح نامے کی شرائط کے پورا ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے ۔ اے اللہ ! ہم اس شخص کے خلاف تجھ سے مدد چاہتے ہیں جو اس معاہدے کی شرائط ترک کرنے کا ارادہ کرے ۔"

یہ معاہدہ ۱۰ صفر ۳۷ھ کو لکھا گیا اور اس پر طرفین کے متعدد سربر آوردہ اشخاص کے دستخط بطور گواہ ثبت کرائے گئے۔

(۲) حکمین کا اجتماع اور تحکیم کے نتائج : جب حکمین کے اجتماع کا وقت آیا تو حضرت علی نے ابوموسیٰ اشعری کو اور معاویہ نے عمرو بن العاص کو دومۃالجندل روانہ فرمایا ۔ ابو موسیٰ اشعری کے ساتھ چار سو آدمی تھے جن کے سردار شریح بن ھانی الحارثی تھے ۔ عبداللہ بن عباس انھیں نماز پڑھانے اور دیگر امور کی نگہداشت کے لیے مقرر تھے ۔ عمرو بن العاص کے ساتھ بھی چار سو آدمی تھے ۔

مسعودی نے لکھا ھے کہ جب حضرت علی کا وفد مقام اجتماع کے قریب پہنچا تو عبداللہ بن عباس نے ابوموسیٰ سے کہا:

" علی آپ کو حکم بنانے پر راضی نہ تھے کیونکہ اکثر لوگ فضیلت اور تقدم اسلام میں آپ سے بڑھے ہوئے ہیں ۔ لیکن

لوگوں نے آپ ہی کو حکم مقرر کرنے پر اصرار کیا - مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کی کمزوری کے باعث ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے کیونکہ آپ کا واسطہ عرب کے عقیل ترین شخص سے پڑا ہے - آپ یہ بات کبھی نہ بھولیں کہ علی کی بیعت ان لوگوں نے کی ہے جنھوں نے ابوبکر ، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی - علی میں کوئی خصلت ایسی نہیں جو انہیں خلافت کے ناقابل ٹھہرا سکے اور معاویہ میں کوئی خصلت ایسی نہیں جو انہیں خلافت کا مستحق بنا سکے -"

ادھر معاویہ نے عمرو بن العاص کی روانگی کے وقت انہیں یہ نصیحت کی :

" اے ابو عبداللہ ! اہل عراق نے علی کو مجبور کر کے ابو موسیٰ کو حکم مقرر کرایا ہے ، خود علی ابو موسیٰ کو مقرر کرنے کے حق میں نہ تھے - لیکن میں اور اہل شام تمہارے تقرر پر راضی ہیں - تمہارا واسطہ ایک زبان دراز اور کوتاہ عقل شخص سے پڑا ہے - اس لیے نہایت سوچ سمجھ کر یہ معاملہ نبٹانا اور ابوموسیٰ پر اپنی رائے کا اظہار بہت آہستہ آہستہ کرنا -"

عبداللہ بن عمر ، سعد بن ابی وقاص ، مغیرہ بن شعبہ وغیرہ متعدد غیر جانب دار جلیل القدر صحابہ بھی دومۃالجندل پہنچ گئے - یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہ حضرت علی کی بیعت کی تھی اور نہ اس فتنے میں اپنے آپ کو ڈالا تھا -

مسعودی کی روایت پڑھ کر چار اہم امور ہمارے سامنے آتے ہیں :

(۱) حضرت علی نے بہت مجبور ہو کر اپنی طرف سے ابوموسیٰ کو حکم مقرر کیا تھا لیکن انہیں آپ پر بھروسا نہ تھا کیونکہ

قبل ازیں وہ حضرت علی کا ساتھ نہ صرف خود چھوڑ چکے تھے بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنا ہم‌نوا بنا لیا تھا ۔ اس کے مقابلے میں معاویہ اور تمام اہل شام عمرو بن العاص کے حکم بنائے جانے پر پورے طرح راضی تھے -

(۲) تفقہ فی‌الدین کو علحدہ رکھ کر ابوموسیٰ سیاست میں عمرو بن العاص کی ٹکر کے شخص نہ تھے - عمرو بن العاص کا ذہن رسا جو تدابیر سوچ سکتا تھا ابوموسیٰ اس کے پاسنگ بھی نہ سوچ سکتے تھے -

(۳) اکثر جلیل‌القدر صحابہ مثلاً عبداللہ بن عمر ، سعد بن ابی وقاص ، مغیرہ بن شعبہ وغیرہ حضرت علی کی بیعت سے علحدہ رہے تھے ۔ ان کے علاوہ بھی اور بہت سے صحابہ ، جن کی بزرگی اور دانائی سے انکار نہیں کیا جا سکتا ، حضرت علی کی بیعت میں شامل نہ تھے -

(۴) عبداللہ بن عباس نے ابوموسیٰ سے جو باتیں کی تھیں وہ بظاہر بہت ہتک آمیز تھیں جن کا ابوموسیٰ اشعری پر برا اثر پڑا ہوگا اور اس کی وجہ سے آپ کے دل میں حضرت علی کی حمایت اور آپ کے اخلاص کی شدت میں ضرور کمی آ گئی ہوگی -

حکمین کا اجتماع رمضان ۳۷ھ میں ہؤا تھا ۔ اس موقع پر عمرو بن العاص نے تدبر ، سیاست ، ذکاوت اور فطانت کا بے نظیر مظاہرہ کیا ۔ آپ نے نہایت دانش مندی سے ابوموسیٰ کے ساتھ گفتگو شروع کی اور آہستہ آہستہ انھیں حضرت علی کی معزولی کے لیے تیار کر لیا اور اس طرح اپنے مؤکل ، معاویہ ، کے لیے راستہ صاف کر دیا -

مسعودی نے 'مروج الذہب' میں واقعۂ تحکیم کے متعلق

مندرجہ ذیل روایت بیان کی ہے :

''جب حکمین میں یہ بات چیت شروع ہوئی تو عمرو بن العاص یوں گویا ہوئے :

' اے ابوموسیٰ ! میری رائے ہے کہ ہم جو فیصلہ کریں انصاف سے کریں ، اہل وفا کی حمایت ان کی وفا کے باعث اور بد عہدوں کے خلاف فیصلہ ان کی بد عہدی کے باعث کریں ۔' (یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ عمرو بن العاص کن لوگوں کو اہل وفا اور کن لوگوں کو بد عہدوں کے زمرے میں شمار کرتے تھے ۔)

'' ان کے بعد ابوموسیٰ کھڑے ہوئے ، اللہ کی حمد و ثنا کی ، اس اختلاف کا ذکر کیا جو اسلام میں رونما ہو رہا تھا ، پھر کہا :

' اے عمرو بن العاص ! آؤ ہم باہم مل کر فیصلہ کر لیں جس کے ذریعے سے افتراق و انشقاق کا یہ سلسلہ بند ہو جائے ، اختلافات دور ہو جائیں ، صلح صفائی ہو جائے اور اللہ ہم میں دوبارہ الفت و محبت پیدا کر دے ۔'

''عمرو بن العاص نے ابوموسیٰ کی یہ تجویز پسند کی اور کہا ' ہو سکتا ہے کہ ہم آپس میں جو فیصلے کریں بعد میں بھول چوک کی وجہ سے ان پر عمل درآمد نہ ہو سکے اس لیے ضروری ہے کہ ہم جو باتیں طے کریں ایک کاتب انہیں ساتھ ساتھ لکھتا جائے ۔' ابو موسیٰ نے کہا ' تمھاری تجویز درست ہے ۔ بے شک ایسا ہی ہونا چاہیے ۔' چنانچہ عمرو بن العاص نے کاغذ اور کاتب مہیا کر لیا ۔ کاتب انہیں کا ایک غلام تھا ۔ آپ نے اس سے تمام حاضرین کے سامنے کہا کہ جو کچھ ہمارے درمیان طے

پائے تم اسے قلم بند کرتے رہو لیکن یہ خیال رکھو کہ کسی حکم کے کہنے سے اس وقت تک نہ لکھو جب تک دوسرا حکم بھی اس پر صاد نہ کر دے ۔ یہ اس لیے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ فریقین کے اتفاق سے لکھا جائے ۔ کوئی ایک شخص اپنی طرف سے کچھ لکھوانے کا مجاز نہیں ۔"

" اس کے بعد دونوں نے یہ عبارت لکھوانی شروع کی :

" بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ یہ وہ فیصلہ ہے جس پر عبداللہ بن قیس ابوموسیٰ اور عمروبن العاص متفق ہوئے ہیں ۔ ہم دونوں گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود اور اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد اس کے بندے اور رسول ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ وہ دین اسلام کو تمام دینوں پر غالب کریں خواہ مشرک اسے ناپسند ہی کیوں نہ کریں ۔"

" اس کے بعد عمرو بن العاص نے کہا ' ہم گواہی دیتے ہیں کہ ابوبکر رسول اللہ کے خلیفہ تھے ، آپ نے تا زندگی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول اللہ پر پورا عمل کیا اور اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کیے ۔'

ابوموسیٰ نے کہا ' ٹھیک ہے لکھو ۔'

" اس کے بعد عمرو بن العاص نے حضرت عمر کی نسبت بھی یہی الفاظ کہے ۔ ابوموسی نے کہا ' درست ہے یہ بھی لکھو ۔'

" اس کے بعد دونوں میں مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی :

عمرو بن العاص : عمر کے بعد عثمان ، مسلمانوں کے اجتماع اور اصحاب رسول اللہ کے مشورے اور ان کی رضامندی

سے خلیفہ منتخب ہوئے اور وہ پکے مومن تھے ۔

ابوموسیٰ : ہم یہاں یہ مسئلہ طے کرنے اور اس پر بحث کرنے کے لیے جمع نہیں ہوئے ۔

عمرو بن العاص : دونوں باتوں میں سے ایک بات ضروری ہے یا وہ مومن تھے یا کافر ۔

ابوموسیٰ : اچھا جو عمرو بن العاص کہتے ہیں وہی لکھو ۔

عمرو بن العاص : اب دو ہی باتیں ہیں یا وہ ظالم ہونے کی حالت میں قتل کیے گئے یا مظلوم ہونے کی حالت میں ۔

ابوموسیٰ : وہ مظلوم ہونے کی حالت میں قتل کیے گئے ۔

عمرو بن العاص : کیا اللہ نے مظلوم کے ولی کے لیے یہ حق نہیں رکھا کہ وہ اس کے خون کا مطالبہ کرے ؟

ابوموسیٰ : یقیناً ۔

عمرو بن العاص : کیا معاویہ سے بڑھ کر حضرت عثمان کا کوئی اور ولی ہو سکتا ہے ؟

ابوموسیٰ : نہیں ۔

عمرو بن العاص : پھر کیا معاویہ کا یہ حق نہیں کہ وہ قاتلین عثمان کا مطالبہ کریں خواہ وہ کوئی ہوں اور کہیں ہوں اور اس کام میں کوشش کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں ۔؟

ابوموسیٰ : یقیناً ۔

عمرو بن العاص نے کاتب سے کہا ' یہ سب باتیں لکھ لو ۔' ابوموسیٰ نے بھی لکھنے کی اجازت دے دی ۔

عمرو بن العاص نے کہا ' ہمارے پاس اس بات کے شواہد

موجود ہیں کہ علی ۔ حضرت عثمان کو قتل کرایا ۔‘

ابوموسیٰ نے کہا ’ اسی نزاع نے اُمت محمدیہ کو تفرقے میں ڈال دیا ہے ۔ ہم محض اللہ کی خوشنودی کی خاطر اسے دور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اس لیے ہمیں ایسی تجاویز سوچنی چاہئیں جن کے ذریعے سے اُمت کی اصلاح ہو سکے اور یہ تفرقہ دور ہو جائے ۔‘

عمرو بن العاص نے پوچھا ’ وہ تجویز کیا ہو سکتی ہے ؟‘

ابوموسیٰ نے کہا ’ تم جانتے ہو کہ اہل عراق کبھی معاویہ کو پسند نہ کریں گے ۔ اسی طرح اہل شام کبھی علی سے راضی نہ ہوں گے لہذا کیوں نہ ہم دونوں کو ان کے عہدوں سے معزول کر کے ان کی جگہ عبداللہ بن عمر کو خلیفہ بنا لیں ؟‘

”عمرو بن العاص،ابوموسیٰ کی زبان سے یہی کہلوانا چاہتے تھے ۔ جہاں تک دونوں کی معزولی کا سوال تھا انھوں نے اس پر صاد کیا لیکن عبداللہ بن عمر کے تقرر کو پسند نہ کیا بلکہ ان کی جگہ چند اور صحابہ کے نام تجویز کر دیے ۔ لیکن ابوموسیٰ نے عبداللہ بن عمر ہی کو خلیفہ بنانے پر اصرار کیا ۔ اس پر گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا اور جو کچھ طے پایا تھا اس پر فریقین کے دستخط ثبت ہو گئے ۔“

اس کارروائی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عمروبن العاص نے بہ غایت دانش مندی ابوموسیٰ سے وہی کچھ منوا لیا جو وہ چاہتے تھے ۔ حضرت علی کے مقرر کردہ حکم ابوموسیٰ کے اس اقرار سے کہ حضرت عثمان مظلوم ہونے کی حالت میں شہید کیے گئے اور معاویہ کو یہ حق ہے کہ وہ قصاص لینے کے لیے

قاتلین عثمان کا مطالبہ کریں اور یہ کہ قاتلین عثمان کو پناہ دینے کی وجہ سے علی بھی ان کے قتل میں شریک ہیں (اگرچہ محض قاتلین کو پناہ دینا اس بات کی دلیل نہیں کہ آپ بھی حضرت عثمان کے قتل میں شریک تھے لیکن آپ کے مخالفین اسی بات پر زور دے رہے تھے)۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ معاویہ حق پر تھے اور علی ناحق پر ۔ اور یہ سب کچھ عمرو بن العاص کی ذات اور کمال دانش مندی سے ہؤا ۔ آپ کا سب سے بڑا کمال جو اس موقع پر ظاہر ہؤا وہ ابو موسیٰ سے یہ اقرار کرنا تھا کہ حضرت علی ناحق پر تھے اور معاویہ حضرت عثمان کا قصاص لینے کے مطالبے میں حق بجانب ۔ آپ یہی چاہتے تھے اور یہی ہؤا ۔ ابو موسیٰ کو پہلے بولنے کا موقع دینے کا مقصد بھی یہی تھا کہ معزولی کی بات سب سے پہلے انہیں کی زبان سے نکلے، اور آپ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے ۔

طبری کی روایت اس سلسلے میں یہ ہے کہ جب آئندہ ہونے والے خلیفہ کے بارے میں فریقین کا اتفاق کسی نام پر نہ ہو سکا تو ابوموسیٰ نے کہا :

” میری رائے یہ ہے کہ ہم ان دونوں کو تو بہرحال معزول کر دیں اور آئندہ ہونے والے خلیفہ کا سوال عامۃالمسلمین پر چھوڑ دیں کہ وہ باہم مشورہ کر کے جسے چاہیں خلیفہ بنا لیں ۔“

عمرو بن العاص نے جواب دیا :

” آپ نے درست فرمایا ۔ میری رائے بھی یہی ہے ۔ اب آپ یہ کام کیجیے ، لوگوں کو بتا دیجیے کہ ہم اس امر پر متفق ہو گئے ہیں ۔“

چنانچہ ابوموسیٰ کھڑے ہوئے اور مجمع کو مخاطب کرکے کہا:

"لوگو! ہم نے مسلمانوں کی موجودہ کشمکش پر خوب غور کیا ہے اور ہم بالاتفاق اس رائے پر پہنچے ہیں، اُمت کی اصلاح و اتحاد کے لیے ضروری ہے کہ علی اور معاویہ دونوں کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے۔ اس کے بعد مسلمان جس شخص کو چاہیں اپنے میں سے خلیفہ منتخب کر لیں۔ چنانچہ میں علی اور معاویہ دونوں کو معزول کرتا ہوں تم جس شخص کو اس منصب کا اہل سمجھو منتخب کر لو۔"

ابوموسیٰ کے بعد عمرو بن العاص کھڑے ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد کہا:

"حضرات! ابوموسیٰ نے جو کچھ کہا وہ آپ نے سن لیا ہے۔ انھوں نے علی کو معزول کر دیا ہے، میں بھی انھیں معزول کرتا ہوں لیکن معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں کیونکہ وہ حضرت عثمان کے ولی اور ان کا قصاص لینے اور ان کے منصب پر فائز ہونے کے سب سے زیادہ حق دار ہیں۔"

اس پر دونوں کے درمیان کچھ درشت کلامی ہوئی۔ بعدازآں ابوموسیٰ مکہ چلے گئے اور اہل شام معاویہ کو خلافت کی مبارک باد دینے کے لیے دمشق پہنچ گئے۔*

* طبری نے یہ بھی لکھا ہے: جب عمرو بن العاص نے چاہا کہ ابوموسی کو پہلے بولنے کا موقع دیں تو عبداللہ بن عباس نے ابوموسی کو ایسا کرنے سے روکا اور کہا "مجھے یقین ہے کہ ایسا کرنے سے عمرو بن العاص کی غرض آپ کو دھوکا دینا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ اگر آپ کسی متفقہ فیصلے پر پہنچ جائیں

باقی صفحہ ۲٦۷ پر

ہمارے خیال میں یہ روایت ناقابل اعتماد ہے اور صحیح روایت وہی ہے جو مسعودی نے بیان کی ہے اور جس میں تقرر وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ صرف یہ مذکور ہے کہ ابوموسیٰ اور عمرو بن العاص دونوں حضرت علی اور معاویہ کی معزولی اور بعد ازآں مسلمانوں کے اتفاق سے کوئی خلیفہ منتخب کرنے کے سوال پر متفق ہوگئے تھے اور یہ بات تحریر میں لا کر فریقین نے اس پر اپنے دستخط ثبت کر دیے تھے ۔

عمرو بن العاص کی سیاسی قابلیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے عمداً حضرت علی کے بجائے معاویہ کو مسلمانوں کا حاکم بنانے کا ذکر نہیں چھیڑا کیونکہ آپ جانتے تھے کہ یہ چیز تلوار کے سوا اور کسی ذریعے سے حاصل نہیں کی جا سکتی ۔ آپ چاہتے تھے کہ حضرت علی پر مکمل غلبہ حاصل کرنے کے لیے معاویہ کو کچھ وقت مل جائے تاکہ وہ اس دوران میں اپنی قوت مجتمع کر سکیں ۔ آپ جانتے تھے کہ حضرت علی کے اپنے لشکر میں آپ کی مخالفت کا مواد پک رہا ہے اور وہ کسی نہ کسی روز ضرور پھوٹ کر لشکر میں ابتری کا باعث ہوگا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا ۔ چند ہی روز بعد خوارج کا فتنہ زور شور سے ابھرا اور حضرت علی باوجود انتہائی خواہش کے معاویہ سے جنگ کرنے کے لیے شام کی طرف کوچ نہ کر سکے ۔

عمرو بن العاص چاہتے تھے کہ علی اور معاویہ دونوں کو

بقیہ حاشیہ ۲٦٦

تو پہلے عمرو بن العاص کو بولنے کا موقع دیں اس کے بعد آپ بولیں ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بات طے ہو جانے کے بعد آپ تو مجمع عام کے سامنے اس کی تائید کر دیں لیکن عمرو بن العاص اس سے مکر جائیں ۔"

مساوی سطح پر رکھیں تا کہ جب معزولی پر فریقین کا اتفاق ہو جائے تو علی لازماً معزول ہو جائیں لیکن معاویہ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے کیونکہ انھوں نے تو سرے سے خلافت کا دعویٰ کیا ہی نہیں تھا اس لیے خلافت سے ان کی معزولی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ آپ جانتے تھے کہ حضرت علی یہ فیصلہ ہرگز قبول نہ کریں گے لیکن آپ کو یہ معلوم تھا کہ اس طرح حضرت علی کے حامی دو گروہوں میں بٹ جائیں گے اور معاویہ اس صورت حال سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکیں گے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا ۔ نہ صرف حضرت علی کے حامی دو گروہوں میں بٹ گئے بلکہ معاویہ کو بھی بعض ایسے صحابہ کی ، جو اب تک ان جھگڑوں سے بالکل الگ تھلگ تھے ، ہمدردی حاصل ہو گئی ۔ عمرو بن العاص کا یہ کارنامہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ۔

جہاں تک حکمین کے اخلاص سے کام کرنے کا تعلق ہے عمرو بن العاص کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے معاویہ کی وکالت کا پورا پورا حق ادا کر دیا ۔ معاویہ نے انھیں مقرر ہی اس لیے کیا تھا کہ وہ ایسے موقعوں پر مخالفین سے عہدہ برآ ہونے کا فن بخوبی جانتے تھے ۔ تمام اھل شام بہ‌طیب خاطر ان کے حکم مقرر ہونے پر راضی تھے ۔ ان کے مقابلے میں حضرت علی ابو موسیٰ کو حکم بنانے پر راضی نہ تھے اور اس کی وجوہ یہ تھیں :

(۱) آپ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ابوموسیٰ عمروبن العاص جیسے زیرک و دانا اور ہوشیار شخص سے گفتگو کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ۔ ابوموسیٰ عابد و زاہد اور خلوت نشین بزرگ تھے ۔ سیاست سے نہ انھیں کوئی واسطہ تھا اور نہ کبھی

اس کا تجربہ ھؤا تھا ۔ لیکن پیش نظر مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زاھد شب زندہ دار سے زیادہ ماھر سیاست دان کی ضرورت تھی ۔ چونکہ حضرت علی عراقیوں کو ابوموسیٰ کے حکم بنانے سے باز نہ رکھ سکے اس لیے نتیجہ آپ کی توقعات کے عین مطابق ظاھر ھؤا ۔ ابوموسیٰ کو شکست اٹھانی پڑی اور عمرو بن العاص کو شاندار فتح نصیب ہوئی ۔ *

(۲) حضرت علی ابوموسیٰ کو حکم بنانے پر اس لیے بھی رضامند نہ تھے کہ وہ آپ کے نزدیک بھروسے کے قابل نہ تھے ۔ کیونکہ جنگ جمل سے قبل ، جب ابوموسیٰ کوفہ کے والی تھے ، اھل شہر نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ آیا انھیں حضرت علی سے مل کر حضرت عائشہ کے مقابلے میں نکلنا چاھیے یا نہیں ۔ آپ نے اس استفسار کا یہ جواب دیا کہ اگر آخرت چاھتے ھو تو اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رھو اور اگر دنیا چاھتے ھو تو بے شک نکل پڑو ۔" آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ " اللہ کی قسم!

---

* اسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے عبداللہ بن عباس کہتے ھیں :

أبا موسى بليت وكنت شيخا ۔ قريب العفو مخزون اللسان
وما عمرو صفاتک يا ابن قيس ۔ فيا لله من شيخ يمانی
فامسيت العشيه ذا اعتذار ۔ ضعيف الركن منكوب العنان
تعض الكف من ندم وماذا ۔ يرد عليک عضک للبنان

(اے ابوموسی ! آخر تم دھوکا کھا ھی گئے ۔ تاھم تم عفو و ترحم کے لائق ھو ۔ اور تمھیں برا بھلا کہنے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ عمرو بن العاص جیسی صفات تم میں موجود ھی نہیں ۔ آج تم ندامت سے اپنی انگلیاں کاٹتے ھو لیکن انگلیاں کاٹنے سے اب کیا فائدہ ؟)

عثمان کی بیعت میری گردن میں معلق ہے ۔ اگر لڑنا ہی ضروری ہے تو ہمیں اس وقت تک کسی کے ساتھ ہو کر نہ لڑنا چاہیے جب تک عثمان کے قاتلوں کو چن چن کر قتل نہیں کر دیا جاتا۔"
ابوموسیٰ خانہ جنگی اور فتنہ و فساد کو قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اہل کوفہ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا :

" مسلمانو ! تم اس خانہ جنگی میں حصہ نہ لو کیونکہ یہ وہی فتنہ ہے جس کی رسول اللہ نے خبر دی تھی ۔ اس فتنے میں سونے والا جاگنے والے سے ، جاگنے والا بیٹھنے والے سے اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہے ۔ تم تلواروں کو نیام میں کر لو ، نیزوں کی انیوں کو نکال پھینکو ، کمانوں کی تانتیں توڑ دو ، مظلوم کو پناہ دو اور اس وقت تک اپنے گھروں میں بیٹھے رہو جب تک یہ فتنہ دور نہ ہو جائے ۔"

ابوموسیٰ کے ان اقوال اور خطبات سے لوگوں کے دلوں میں حضرت علی کی مدد کرنے کا جذبہ بہت حد تک سرد پڑ گیا ۔ ابوموسیٰ نے حضرت علی کی مدد اس وجہ سے بھی نہ کی کہ آپ کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا ، حضرت علی نے قاتلین عثمان کو پناہ دے رکھی ہے اور آپ کے نزدیک شرعاً ان لوگوں کو قتل کرنا اور ان سے لڑنا لازم تھا ۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :

" لوگو ! تم اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہو اور اس فتنے میں حصہ نہ لو سوا اس مطالبے کے کہ حضرت عثمان کے قاتلوں کو قتل کر دیا جائے ۔"

لوگوں کو حضرت علی کی مدد سے روکنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علی نے بالآخر انہیں کوفے کی ولایت سے معزول کر دیا ۔

ان حالات میں جب شروع ہی سے تعلقات کی یہ صورت ہو کہ حضرت علی یہ سمجھتے ہوں ، ابو موسیٰ نے ضرورت پڑنے پر ان کی مدد سے انکار کر دیا اور ابوموسیٰ یہ خیال کرتے ہوں کہ جب تک قاتلین عثمان قتل نہ کر دیے جائیں حضرت علی کی مدد کرنی جائز نہیں کون عقل مند شخص یہ تصور کر سکتا ہے کہ ابوموسیٰ نے پورے اخلاص اور پورے جوش سے حضرت علی کی وکالت کی ہو گی ۔ خصوصاً اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ ابوموسیٰ حضرت علی کی نسبت عبداللہ بن عمر کو خلافت کا زیادہ حق‌دار سمجھتے تھے ۔

یہ تو تھا حضرت علی اور ابوموسیٰ اشعری کے باہمی تعلقات کا پس منظر ۔ مگر عمرو بن العاص اور معاویہ کے تعلقات کی نوعیت متذکرۃالصدر اصحاب کے تعلقات سے بالکل مختلف تھی ۔ معاویہ کو عمرو بن العاص کی پوری پوری تائید حاصل تھی اور حضرت عثمان کے قصاص کا جو مطالبہ معاویہ کر رہے تھے اس سے عمرو بن العاص کامل طور پر متفق تھے ۔ علاوہ بریں عمرو بن العاص کو سیاست میں جو کمال حاصل تھا وہ ابوموسیٰ کو حاصل نہ تھا ۔ دونوں صاحبوں کی حالتوں کا موازنہ کرنے کے لیے وہ اقوال کافی ہیں جو تحکیم سے قبل ان کے متعلق کہے گئے تھے ۔ معاویہ نے عمرو بن العاص سے کہا تھا " میں اور اہل شام تمھارے تقرر پر راضی ہیں ۔ تمھارا واسطہ ایک زبان دراز اور کوتاہ عقل شخص سے پڑا ہے ۔" ادھر عبداللہ بن عباس نے ابوموسیٰ سے کہا تھا " علی آپ کو حکم بنانے پر راضی نہ تھے ۔ آپ کا واسطہ عرب کے عقیل ترین شخص سے پڑا ہے ۔"

تاہم مؤرخین ، ابوموسیٰ پر غفلت اور غلط رائے دینے کا

الزام لگا کر ظلم کرتے ھیں ۔ ھمارا خیال ہے کہ تحکیم کے موقع پر آپ نے جو کچھ کیا وہ اھل عراق کے فائدے کے لیے کیا جنھوں نے آپ کو حکم مقرر کرنے پر زور دیا تھا ۔ آپ کو معلوم تھا کہ اگر آپ کی رائے کی مخالفت ہوئی تو وہ صرف حضرت علی اور بنو ھاشمؓ ھی کی طرف سے ھو گی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ابوموسیٰ کی رائے کی تائید اھل عراق کے ایک بڑے حصے کی طرف سے ھوئی ۔

مذکورہ بالا تمام امور کے باوجود یہ خیال کرنا درست نہ ھوگا کہ معاویہ کی طاقت اور آپ کی سلطنت کی مضبوطی کا باعث صرف یہ امر تھا کہ آپ کو عمرو بن العاص جیسا مدبر اور فرزانہ شخص مل گیا تھا ۔ معاویہ کی سلطنت کے استحکام میں چند اور باتوں کو بھی دخل ہے :

اول : وہ اضطراب اور افتراق جو حضرت علی کی فوج میں رونما ھو رھا تھا ۔ حضرت علی نے معاویہ پر حملہ کرنے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا اور اس غرض سے فوج لے کر چل بھی پڑے تھے لیکن اپنی ھی فوج میں اختلاف اور اضطراب کے باعث آپ اپنے ارادے کو لباس عمل نہ پہنا سکے ۔ سب سے پہلے خوارج کی ایک بھاری تعداد آپ سے علحدہ ھوئی ۔ اس کے بعد آپ کے ساتھی بھی آھستہ آھستہ آپ سے علحدہ ھونے شروع ھوئے اور چند جان نثار ساتھیوں کے سوا کوئی بھی آپ کے پاس نہ رھا ۔ پھر آپ نے کوفہ کے روساء و امراء اور سربرآوردہ اشخاص کو بلایا اور انھیں شام چلنے کے لیے آمادہ کرنا چاھا لیکن انھوں نے بھی مجبوریاں ظاھر کر دیں اور شام چلنے سے صاف انکار کر دیا ۔

دوم : معاویہ کی فوج کا اتحاد ۔ اھل شام کا حال اھل عراق

کے بالکل برعکس تھا ۔ وھاں کے لوگ پوری طرح معاویہ کے ساتھ تھے اور لشکر آپ کا مطیع و فرمانبردار ۔ جو اتحاد شامیوں اور معاویہ کے لشکر میں پایا جاتا تھا وہ عراقیوں اور حضرت علی کے لشکر میں بالکل مفقود تھا ۔

ان وجوہ اور متحدہ قوت کی بنا پر معاویہ کی سلطنت کو روز بروز استحکام حاصل ہوتا جا رھا تھا اور وہ علاقے جو قبل ازیں حضرت علی کے پاس تھے آھستہ آھستہ معاویہ کے قبضے میں آتے جا رھے تھے ۔

حضرت علی اور معاویہ کی باھمی آویزش کے متعلق ھماری رائے یہ ھے کہ گو ھمیں عمرو بن العاص کی زیرکی ، عقل مندی ، تدبر اور اپنے دشمن کو زیر کرنے کی قدرت سے انکار نہیں لیکن یہ واقعہ ھے کہ آپ کے اس رویے سے جو اس تنازع میں آپ نے اختیار کیا صرف حضرت علی ھی کو نقصان نہیں ھؤا بلکہ اسلام کو بھی ضعف پہنچا اور مسلمانوں کے مختلف گروھوں میں اختلاف کی خلیج وسیع ھو گئی ۔ آپ ھی کی وجہ سے تحکیم کا مسئلہ پیدا ھؤا اور اسی کے باعث خوارج کے فتنے نے سر نکالا جو حضرت علی اور معاویہ دونوں کے یکساں دشمن تھے ۔ اور اس طرح اسلام کو جو زبردست نقصان پہنچا اس کی تلافی کی کوئی صورت نہ نکل سکی ۔

حضرت علی اور معاویہ کے اختلاف کو شروع ھی میں دور کر دینا آپ کے لیے مشکل نہ تھا ۔ ھمیں یقین ھے کہ آپ ضرور ان دونوں کے درمیان صلح کرا سکتے تھے ۔ اگر آپ ایسا کرتے تو نہ صرف ھزاروں مسلمانوں کی جانیں بچا لیتے بلکہ ان کے آئندہ اتحاد کی بھی ایک بنیاد قائم کر دیتے اور آپ کا یہ کارنامہ آپ کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیتا ۔ لیکن افسوس آپ نے ایسا نہ کیا ۔

حضرت علی کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے اور اس طرح معاویہ کے لیے راستہ صاف کرنے کا سب سے زبردست حربہ ، جو عمرو بن العاص نے استعمال کیا ، قاتلین عثمان سے انتقام لینے کا مطالبہ تھا ۔ اسی مطالبے نے معاویہ کے دعوے کو بے انتہا تقویت پہنچائی ۔ اگر حضرت علی حضرت عثمان کے مقرر کردہ والیوں کو معزول نہ کرتے اور آپ کے قاتلین کو مسلمانوں کی خوشنودی کی خاطر قتل کر دیتے تو نہ صرف آپ کے خلاف غلط فہمیاں دور ہو جاتیں بلکہ معاویہ کو بھی وہ طاقت ہرگز حاصل نہ ہوتی جس کے بل بوتے پر انھوں نے حضرت علی کی بیعت سے انکار اور اہل شام کو دین کے نام پر حضرت علی سے جنگ کرنے کے لیے تیار کر دیا ۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ معاویہ کی طرف سے حضرت عثمان کے قاتلین سے انتقام لینے کا مطالبہ خلوص پر مبنی نہ تھا ۔ آپ نے اس مطالبے کو محض سیاسی قوت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بنایا ۔ دلیل یہ ہے کہ جب سارے عرب پر آپ کا قبضہ ہو گیا اور قاتلین عثمان آپ کے چنگل میں آ گئے تو آپ نے بھی انھیں قتل نہ کرایا اور وہ بدستور کھلے بندوں دندناتے پھرتے رہے ۔ اس واقعے سے لامحالہ یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قاتلین عثمان سے انتقام کا مطالبہ صرف اسی وقت تک تھا جب تک آپ کو پوری طرح قوت حاصل نہ ہوئی تھی ۔ جونہی آپ کو مطلوبہ قوت حاصل ہو گئی انتقام کا جوش ختم ہو گیا ۔

ان تمام باتوں کے باوجود یوم صفین اور یوم تحکیم کے موقعوں پر جو واقعات پیش آئے ان کے لیے صرف عمرو بن العاص کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ یوم صفین کے موقع پر سب سے زیادہ مورد الزام حضرت علی کے لشکر کے وہ لوگ

ٹھہرتے ہیں جو یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کی فتح اب بالکل قریب ہے پھر بھی شامیوں کے فریب میں آ گئے۔ عمرو بن العاص کو تو لامحالہ اپنے لیڈر کو شکست سے بچانے کے لیے کوئی نہ کوئی تدبیر اختیار کرنی تھی - یہ عراقیوں کا فرض تھا کہ وہ شامیوں کی چال میں نہ آتے اور لڑائی کو اختتام تک پہنچا کر ہی دم لیتے -

اس ذیل میں ایک اور اہم امر کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے - اس زمانے کی سیاسی حالت کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی قلمرو میں کوئی نہ کوئی انقلاب برپا ہونا ضروری تھا خواہ وہ عمرو بن العاص اور معاویہ کے ہاتھوں وقوع پذیر ہوتا یا کسی اور کے ہاتھ سے - عمرو بن العاص اور معاویہ کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے میدان خالی پایا اور اس موقع کو غنیمت جان کر بدلتے ہوئے حالات کے مطابق حسب منشاء پورا پورا فائدہ اٹھا لیا - اگر وہ اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتے تو کوئی اور میدان میں نکل آتا - حضرت عثمان کی شہادت نے وہ حالات پیدا کر دیے تھے جو متذکرہ بالا انقلاب کا باعث بنے - یہ انقلاب دو مختلف طرفوں سے واقع ہؤا -

اول: خاص عربوں کی طرف سے - یعنی جب حضرت عثمان خلیفہ ہوئے تو بنو امیہ کے دلوں میں اس بات کی خواہش پیدا ہوئی کہ انھیں قریش پر پوری طرح غلبہ حاصل ہو جائے - قریش پر غلبہ حاصل ہونے کا مطلب ساری امت مسلمہ پر غلبہ حاصل ہونا تھا - حضرت عثمان کے عہد میں بنو امیہ کے متعدد افراد بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے - انھیں امید تھی کہ

خلافت آئندہ بھی انھیں کے ہاتھوں میں رہے گی اور بنوہاشم اس پر تسلط حاصل نہ کر سکیں گے ۔ لیکن حضرت عثمان کی بےوقت شہادت نے ان کی یہ امید پوری نہ ہونے دی اور حضرت علی خلیفہ بن گئے ۔ اس زمانے میں معاویہ کو جو بنو امیہ کے ایک معزز فرد تھے بے پناہ قوت و طاقت حاصل تھی ۔ شام کا لشکر ، جو عربوں کا مضبوط ترین لشکر تھا، پورے طور پر آپ کے ساتھ تھا ۔ اہل شام دل و جان سے آپ کے مطیع و فرمانبردار تھے ۔ آپ نے شامی لشکر اور شامی باشندوں کو تکمیل اغراض کے لیے بے دھڑک استعمال کیا اور کامیابی حاصل کر کے اموی سلطنت کی بنیاد رکھ دی ۔

دوم : عوام کی جانب سے ۔ وہ اس طرح کہ ایران اور روم کی مفتوح اور تہذیب و تمدن کی حامل قوموں سے جب عربوں کا میل جول بڑھا تو عرب ان کے نظام ملکی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انھوں نے بھی اسی قسم کا نظام حکومت رائج کرنا چاہا جیسا رومیوں ، اہل‌شام اور اہل مصر وغیرہ کے ہاں رائج تھا ۔ فتوحات وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی تھیں اور اب اسلامی مملکت خالص عربی النسل لوگوں پر مشتمل نہ تھی بلکہ اس میں مختلف اقوام و ملل ، متعدد مذاہب و نظریات اور علحدہ علحدہ طبائع و خصائل کے حامل اشخاص موجود تھے جن کے طریق بود و باش ، افکار و خیالات اور دیگر انواع حیات میں کوئی ہم آہنگی نہ تھی ۔ ان حالات کی موجودگی میں سلطنت کے لیے وہ طرز حکومت جاری نہ کیا جا سکتا تھا جو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کے زمانے میں رائج تھا کیونکہ وہ نظام حکومت ایک تنگ دائرے میں محدود تھا۔ لیکن اب ایک وسیع سلطنت کے لیے ، جس کی حدیں جزیرہ عرب سے

نکل کر ہزارہا میل تک پھیل چکی تھیں ، ایک نئے نظام حکومت کی ضرورت تھی ۔ اہل شام جن کی باگ ڈور بنو امیہ کے ہاتھوں میں تھی اس نئے نظام حکومت کو مملکت کے اطراف و جوانب میں رائج کرنے کے لیے سب سے زیادہ بے تاب تھے* ۔

اس صورت حال کے باعث عرب دو گروہوں میں بٹ گئے تھے ۔ پہلا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو بدستور اسی سادہ بدوی قدیم نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے جو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر کے عہد میں رائج تھا لیکن ایسا کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا کیونکہ سلطنت بے حد وسیع ہو چکی تھی اور سیاست کا دھارا کسی اور طرف مڑ چکا تھا ۔

دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جو نیا طرز حکومت اور ایسی

---

* اس نظریے پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ فتوحات کی کثرت اور سلطنت کی وسعت سب سے زیادہ حضرت عمر کے زمانے میں ہوئی ، نظم حکومت میں تبدیلی کا سوال ان کے زمانے میں کیوں نہ اُٹھا ؟ جواب یہ ہے کہ حضرت عمر کے عہد میں چونکہ فتوحات جاری تھیں اور نظم حکومت قائم کیا جا رہا تھا اس لیے طرز حکومت میں تبدیلی کا سوال پیدا نہ ہوا ۔ اگر حضرت عمر کچھ عرصہ اور زندہ رہتے تو یہ سوال آپ کے زمانے ہی میں پیدا ہو جاتا ۔ البتہ آپ حسن سیاست اور حسن بصیرت سے اس مسئلے کو اسلامی نظام اجتماعی میں کوئی نقص پیدا کیے بغیر نہایت خوش اسلوبی سے طے کر دیتے ۔ جو شخص غور سے تاریخ کا مطالعہ کرے اور اس زمانے کے حالات پر نظر دوڑائے اُسے پتا چل جائے گا کہ خود حضرت عمر کی شہادت اس آنے والے انقلاب کا پیش خیمہ تھی ۔

وسیع اسلامی سلطنت قائم کرنے کے حق میں تھے جو بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو۔

اس تبدیلئی افکار کا طبعی نتیجہ یہ ہؤا کہ دونوں گروہوں میں جنگ چھڑ گئی اور اسلامی حکومت کی تشکیل نو کے علم بردار۔ اہل شام اور اہل فارس ـــ ان لوگوں پر غالب آ گئے جو قدیم نظام حکومت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے ۔ مؤخر الذکر گروہ میں نہ صرف عربوں کا ایک معتدبہ حصہ شامل تھا بلکہ بعض وہ پاکباز صحابہ بھی تھے جنھوں نے 'سنت نبوی کو سختی سے اپنا دستورالعمل بنا رکھا تھا اور جو اس فتنے سے بالکل علیحدہ رہے تھے مثلاً حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت محمد بن مسلمہ وغیرہ۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے ۔ قبل ازیں رومیوں کو بھی بعینہ اسی قسم کے حالات سے اس وقت گزرنا پڑا تھا جب ان کی فتوحات ایشیا افریقہ اور یورپ تک پھیل گئی تھیں ۔ مسلمانوں کی طرح ان میں بھی اس وقت خانہ جنگی برپا ہوگئی جس کے نتیجے میں رومیوں کو پرانے جمہوری نظام کے بجائے نیا شہنشاہی نظام قائم کرنا پڑا۔

عمرو بن العاص اور معاویہ کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی ذکاوت و فطانت کی بدولت ان بدلتے حالات سے فائدہ اٹھایا ۔ اگر وہ میدان میں نہ آتے تو ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص آ جاتا اور وہی فوائد حاصل کر لیتا جو ان دونوں نے حاصل کیے ۔ اسلامی سلطنت کی وسعت اور بیسیوں اقوام پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو جانے کے باعث اس وقت کی سیاسی حالت اسی بات کی مقتضی تھی کہ کوئی نہ کوئی تغیر اور انقلاب واقع ہو جس کے نتیجے میں ایک نیا نظام پرانے نظام کی جگہ لے لے ۔ چنانچہ عین وقت پر یہ انقلاب برپا ہؤا اور یہ انقلاب برپا کرنے والے عمرو بن العاص اور معاویہ تھے ۔

تیسرا باب

مصر کی حکومت دوبارہ عمرو بن العاص کے ہاتھوں میں

گو حضرت عثمان کے عہد میں عمرو بن العاص مصر کی ولایت سے معزول ہو چکے تھے لیکن ان کے دل میں مصر پر دوبارہ حکومت کرنے کا ولولہ بدستور موج زن تھا ۔ واقعۂ تحکیم کے بعد جب معاویہ کی طاقت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا اور تمام اہل شام نے آپ کی بیعت کر لی تو انہیں مصر پر بھی تسلط قائم کرنے کا خیال پیدا ہؤا ۔ مصر کے اندرونی حالات بھی اس نہج پر جا رہے تھے کہ وہ معاویہ کے ممد و معاون ثابت ہو سکتے تھے ۔ مصر میں ایک گروہ ایسا تھا جو حضرت عثمان کے حامیوں میں سے تھا ۔ معاویہ نے اس گروہ کو اپنے ڈھب پر لانا چاہا اور اس کے سرداروں مسلمہ بن مخلد اور معاویہ بن حدیج سے خط و کتابت کر کے انہیں اپنی طرف مائل کرنا اور حضرت علی اور محمد بن ابوبکر (جنھیں حضرت علی نے مصر کا عامل مقرر کیا تھا) کے خلاف بھڑکانا شروع کیا ۔ محمد بن ابوبکر کا سلوک چونکہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا نہ تھا اس لیے وہ بہ آسانی معاویہ کے حامیوں میں شامل ہو کر محمد بن ابوبکر کو وہاں سے نکالنے اور حضرت علی کی مصر پر سے عملداری ختم کرنے کے لیے آمادہ

ہو گئے ۔ معاویہ نے ان کی ہمت افزائی کی اور انھیں اطمینان دلایا کہ ان کی مدد کے لیے جلد ہی ایک لشکر پہنچنے والا ہے ۔ چنانچہ آپ نے عمرو بن العاص کو محمد بن ابوبکر کے مقابلے کے لیے چھ ہزار کا لشکر دے کر بھیجا ۔ پورے بارہ سال کی غیرحاضری کے بعد عمرو بن العاص ۳۸ھ میں دوبارہ مصر پہنچے ۔ معاویہ کا حامی گروہ وعدے کے مطابق عمرو بن العاص سے مل گیا ۔ آپ نے لڑائی شروع ہونے سے قبل محمد بن ابوبکر کو ایک خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا :

” اے محمد بن ابوبکر ! تم مصر کو چھوڑ کر جان بچاؤ ۔ میں نہیں چاہتا کہ تمھارے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں ۔ اہل مصر تمھاری حکومت سے دل برداشتہ ہو کر تمھارے خلاف ہو چکے ہیں اس لیے اگر تم جان کی خیر چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ ۔ میں محض تمھاری خیرخواہی کی وجہ سے یہ خط لکھ رہا ہوں ۔ والسلام ۔ “

لیکن محمد بن ابوبکر پر اس خط کا کچھ اثر نہ ہؤا ۔ اس پر مجبوراً عمرو بن العاص فوج لے کر اس کے مقابلے کے لیے روانہ ہوئے ۔ طرفین سے دو دو ہزار آدمی مقابلے کے لیے نکلے ۔ لڑائی شروع ہوئی لیکن محمد بن ابوبکر کا لشکر عمرو بن العاص کی شامی فوج اور ان کے مصری ساتھیوں کے حملے کی تاب نہ لا سکا اور اس نے بری طرح شکست کھائی ۔ بے شمار لوگ قتل ہوئے ، باقی بھاگ گئے ۔ محمد بن ابوبکر بھی بھاگ کر ایک کھنڈر میں جا چھپا ۔ معاویہ بن حدیج اس کی تلاش میں نکلا اور اسے ڈھونڈ کر قتل کر دیا ۔ بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ اسے آگ میں جلا دیا گیا ۔ مقریزی لکھتے ہیں کہ یہ جنگ ایک شہر منشأة کے قریب ہوئی تھی ۔

محمد ابن ابوبکر کے لشکر پر فتح پانے کے بعد صفر ۳۸ھ میں عمرو بن العاص فسطاط روانہ ہوئے - وہاں پہنچ کر آپ بہ آسانی شہر پر قابض ہو گئے -

اس طرح مصر کی حکومت دوبارہ عمرو بن العاص کے قبضے میں آ گئی اور آپ وہاں کے مطلق العنان حاکم بن گئے - معاویہ نے آپ کو اختیار دے دیا تھا کہ فوج کو تنخواہ دینے کے بعد خراج کی بقیہ رقم جس طرح چاہیں خرچ کریں ، آپ سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی -

مصر پر بخوبی تسلط جمانے کے بعد آپ نے اُن خرابیوں کو کو دور کرنے پر توجہ کی جو آپ کے پیش روؤں کی ناقص حکمت عملی کی وجہ سے وہاں پیدا ہوگئی تھیں اور جن کے باعث اہل مصر میں بے چینی پھیلنے لگی تھی - لیکن عمرو بن العاص کا دوسرا عہد حکومت بہت مختصر ثابت ہؤا اور جلد ہی موت کے ظالم ہاتھ نے انہیں اُچک لیا -

۱ : عمرو بن العاص اور معاویہ کی باہمی شکر رنجی

معاویہ نے عمرو بن العاص کو مصر کی ولایت تو سپرد کردی تھی لیکن انہیں برابر دھڑکا رہتا تھا کہ کہیں آپ طاقت حاصل کر کے خود ان کے خلاف نہ کھڑے ہو جائیں - اسی خدشے کے پیش نظر انھوں نے آپ کو ایک خط لکھا جس میں وہ تمام شرائط تحریر کیں جو ولایت پر برقرار رہنے کے لیے ضروری تھیں - خط میں من جملہ اور باتوں کے یہ بھی لکھا تھا کہ ” مندرجہ شرطوں میں سے کوئی شرط آپ کو میری اطاعت سے علاحدہ نہ

کر سکے گی ۔" عمرو بن العاص بھانپ گئے کہ یہ لکھنے سے معاویہ کا کیا مطلب ہے ۔ آپ نے جواب میں لکھا " بشرطیکہ اطاعت شرط کو توڑنے کا موجب نہ ہو ۔" عمرو بن العاص کا مطلب یہ تھا کہ ان کی طرف سے اطاعت کی اولین شرط یہ ہے کہ انھیں مصر کی ولایت پرؑ بدستور برقرار رہنے دیا جائے ۔ یہ خط پڑھ کر معاویہ نے خیال کیا ، کہیں ایسا نہ ہو کہ مصر پر اپنی گرفت مضبوط کر کے عمرو بن العاص شام کا علاقہ بھی زیرنگیں لانا چاہیں اس لیے انھوں نے چاہا کہ جس طرح ممکن ہو مصر عمرو بن العاص کے ہاتھ سے لے لیا جائے ۔ انھوں نے اس غرض سے تیاری بھی شروع کر دی تھی لیکن معاویہ بن حدیج نے درمیان پڑ کر صلح کرا دی ۔

ابن عساکر نے لکھا ہے کہ جب معاویہ کو زبردست طاقت حاصل ہو گئی اور تمام معاملات آپ کی مرضی کے مطابق طے ہو گئے تو آپ کو خیال پیدا ہؤا کہ مصر پر عمرو بن العاص کا قبضہ بالآخر ان کی سلطنت کے لیے ضعف کا باعث ہو گا اس لیے اسے ان کے ہاتھ سے واپس لے لینا چاہیے ۔ دوسری طرف عمرو بن العاص کو یہ امید تھی، چونکہ معاویہ کو جو طاقت و قوت حاصل ہوئی ہے وہ صرف ان کی تدبیر و دانش اور سعی کی بدولت ہوئی ہے اس لیے معاویہ کو مصر کے ساتھ شام کا کچھ حصہ بھی ان کے ماتحت کر دینا چاہیے ۔ لیکن ایسا نہ ہؤا بلکہ الٹا معاویہ مصر کو بھی ان کے ہاتھ سے چھیننے کی تدابیر سوچنے لگے ۔ اس بنا پر دونوں میں شکررنجی پیدا ہو گئی اور لوگ قیاس کرنے لگے کہ اب دونوں قائدوں میں کبھی سمجھوتا اور اتحاد پیدا نہیں ہوسکتا ۔ لیکن قبل اس کے کہ معاملہ بڑھ جاتا اور دونوں جانب جنگ کی آگ بھڑکنے لگتی بعض دور اندیش لوگوں نے درمیان میں

پڑ کر دونوں میں صلح کرا دی اور ایک معاہدہ لکھا گیا جس کی رو سے طے پایا کہ کامل سات سال تک مصر عمرو بن العاص کی عمل داری میں رہے گا اور اس کے بدلے عمرو بن العاص پر معاویہ کی اطاعت و فرماں برداری لازم ہو گی - اس معاہدے پر، جو ۳۹ھ کے اواخر میں لکھا گیا تھا، متعدد معزز اشخاص کے دستخط بطور گواہ کرائے گئے - اس معاہدے سے تین سال بعد عمرو بن العاص کا انتقال ہو گیا -

گو ظاہر میں تو صلح ہو گئی لیکن دلوں میں کدورت باقی رہی جس کا اظہار وقتاً فوقتاً دونوں جانب سے ہوتا رہا- اس ضمن میں ایک واقعے کا اندراج دلچسپی سے خالی نہ ہو گا :

ایک مرتبہ کسی مجلس میں معاویہ نے اپنے ہم نشینوں سے پوچھا ": سب سے عجیب چیز کون سی ہے ؟" یزید نے جواب دیا " میرے خیال میں سب سے عجیب چیز بادل ہے جو زمین و آسمان کے درمیان ٹھہرا ہؤا ہے، نہ نیچے سے کسی چیز نے اسے سہارا دے رکھا ہے اور نہ اوپر سے وہ کسی چیز سے بندھا ہؤا ہے -" ایک شخص نے کہا " سب سے عجیب چیز وہ خوش قسمتی ہے جو جاہل کو حاصل ہو اور وہ بد نصیبی ہے جو عاقل کے حصے میں آئے -" ایک اور شخص نے کہا " سب سے عجیب چیز وہ ہے جس کی مانند کوئی اور چیز نہ ہو -" عمرو بن العاص نے کہا " عجیب تر چیز یہ ہے کہ باطل حق پر غالب آ جائے " (ان کی مراد اس سے حضرت علی پر معاویہ کے غلبے سے تھی -) معاویہ نے بھی چوٹ کی اور کہا " نہیں بلکہ عجیب تر چیز یہ ہے کہ انسان کو وہ چیز حاصل ہو جائے جس کا وہ مستحق نہ ہو " (مطلب یہ تھا کہ

عمرو بن العاص نے بزور مصر حاصل کر لیا ہے حالانکہ وہ ان کا حق نہ تھا ۔)

ب : عمرو بن العاص کو قتل کرنے کی کوشش

جنگ نہروان کے بعد (جو حضرت علی اور خوارج کے درمیان ہوئی تھی اور جس میں خوارج کو عبرت ناک شکست کھانی پڑی تھی) تین خارجی: عبدالرحمن بن ملجم ، برک بن عبداللہ اور عمرو بن بکر مکہ معظمہ میں ملے اور انھوں نے سازش کی کہ حضرت علی ، معاویہ اور عمرو بن العاص ، تینوں کو ایک ہی روز یعنی ۱۷ رمضان ۴۰ھ کو بیک وقت قتل کر دیا جائے تاکہ عالم اسلامی کو خون خرابے سے نجات ملے ۔ چنانچہ ابن ملجم مدینہ آیا اور مقررہ تاریخ پر حضرت علی پر حملہ کر کے انھیں شہید کر دیا ۔ برک بن عبداللہ نے دمشق میں معاویہ پر حملہ کیا لیکن وار اوچھا پڑا اور معاویہ کو معمولی زخم آیا جو بہت جلد اچھا ہو گیا ۔ عمرو بن بکر فسطاط پہنچا اور مقررہ تاریخ کو مسجد میں چھپ کر بیٹھ گیا اور صبح کی نماز کے لیے عمرو بن العاص کی آمد کا انتظار کرنے لگا ۔ اتفاق سے اس روز عمرو بن العاص کی طبیعت کچھ خراب تھی ۔ آپ نے نماز پڑھانے کے لیے اپنی جگہ خارجہ بن حذافہ قاضی مصر کو بھیج دیا ۔ عمرو بن بکر نے عمرو بن العاص کے دھوکے میں خارجہ بن حذافہ پر حملہ کر کے انھیں شہید کر دیا ۔ جب اسے پتا چلا کہ مقتول عمرو بن العاص نہیں بلکہ خارجہ بن حذافہ ہیں تو اس کی زبان سے نکلا اردت عمراً و اراداللہ خارجۃ (میں نے عمرو بن العاص کے قتل کا ارادہ کیا تھا لیکن اللہ نے خارجہ کی ہلاکت کا ارادہ کیا)، اس وقت سے یہ فقرہ بطور ضرب المثل بولا جانے لگا ۔

جب قاتل عمرو بن العاص کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ رونے لگا ۔ لوگوں نے کہا " اس قدر جرأت کے باوجود موت سے اتنا خوف ؟" اس نے جواب دیا " مجھے موت کا ڈر نہیں بلکہ یہ غم ہے کہ میرے دونوں ساتھی علی اور معاویہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے لیکن میں عمرو بن العاص کو قتل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا ۔" عمرو بن العاص نے اس کی گردن آڑانے کا حکم دیا ۔ چنانچہ اس کی گردن آڑا کر اسے سولی دے دی گئی ۔ جب معاویہ کو اس واقعے کا علم ہؤا تو انھوں نے عمرو بن العاص کو بال بال بچ جانے پر مبارکباد کا خط بھیجا ۔

ج : بعض متفرق امور

(۱) عمرو بن العاص ، معاویہ کے دورحکومت میں اکثر مصر سے شام آتے رہتے تھے اور انھیں اہم امور کے متعلق گراں قدر مشورے دیتے رہتے تھے ۔ معاویہ بھی کوئی اہم کام ان کی رائے اور مشورے کے بغیر نہ کرتے تھے ۔*

(۲) مصر کی ولایت آخریٰ کے زمانے میں عمرو بن العاص رفاہ عام کے وہ کام نہ کر سکے جو آپ نے ولایت اولیٰ کے زمانے میں کیے تھے ۔ اگر آپ کا دوسرا دور حکومت پہلے دور کی طرح طویل ہوتا تو یقیناً آپ رفاہ عام کے کاموں پر بھی توجہ مبذول کرتے لیکن آپ کا دوسرا دور بہت مختصر ثابت ہؤا اور یہ سارا

* طبری نے لکھا ہے کہ جب حضرت حسن نے خلافت چھوڑ کر معاویہ سے صلح کی تھی تو عمرو بن العاص ، معاویہ ہی کے پاس تھے ۔ اسی طرح جب قیس بن سعد سے معاویہ کی صلح ہوئی تو بھی عمرو بن العاص شام ہی میں تھے ۔

عرصہ فتنہ و فساد اور بد امنی کے ان شعلوں کو فرو کرنے میں صرف ہو گیا جو حضرت عثمان کے عہد سے معاویہ کے عہد تک یہاں پورے زور شور سے بھڑکتے رہے تھے اور جس کے باعث یہاں کے باشندے دو متحارب فریقوں میں منقسم ہو گئے تھے۔

(۳) عمرو بن العاص اسلام لانے سے قبل مکہ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ تجارت آپ کا موروثی پیشہ تھا لیکن اسلام لانے کے بعد جنگوں میں شرکت کی وجہ سے پھر کبھی تجارت کرنے کا موقع نہ ملا۔ بہ ایں ہمہ آن کی تاجرانہ روش آخر عمر تک نہ گئی۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے غلام وردان کے ہمراہ معاویہ کے پاس گئے۔ باتیں ہونے لگیں۔ عمرو بن العاص نے معاویہ سے پوچھا: ''امیرالمومنین! آپ کو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے اتنا بڑا رتبہ مرحمت فرما دیا ہے، کیا اب بھی کوئی ایسی چیز باقی رہ گئی ہے جس سے آپ لطف اٹھانا چاہتے ہوں؟'' معاویہ نے جواب دیا ''عورتوں کی مجھے خواہش نہیں۔ ہر قسم کے نرم و ملائم کپڑے میں نے پہنے ہیں اور اب مجھے معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ملایمت کسے کہتے ہیں۔ ہر قسم کا لذیذ اور پر تکلف کھانا میں نے کھایا ہے جس کی وجہ سے اب مجھے احساس بھی نہیں ہوتا کہ لذت کیا چیز ہے۔ خوشبو میرے نتھنوں میں اس طرح بس چکی ہے کہ خوشبو کا احساس ہی مجھ سے جاتا رہا ہے۔ اب تو میرے لیے سب سے دلکش چیز یہ ہے کہ مجھے سخت گرمیوں میں ٹھنڈا پانی میسر آ جائے اور میں اپنے بیٹوں اور پوتوں کو اپنے سامنے کھیلتا کودتا دیکھوں۔ ہاں تم بتاؤ کہ تمھاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟'' عمرو بن العاص نے جواب دیا ''میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرے پاس وافر مال ہو جسے میں تجارت میں لگا دوں اور اس سے بیش بہا نفع حاصل کروں۔''

اس کے بعد معاویہ وردان کی طرف متوجہ ہوئے اور اُن سے پوچھا ” وردان! تمھاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟“ وردان نے کہا ” میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ میں اپنی قوم پر ایسا احسان کروں جس کے بار سے ان کی گردنیں میری زندگی ہی میں نہیں بلکہ میرے بعد بھی میری اولاد کے سامنے جھکی رہیں ۔“

(۴) طبری میں مذکور ہے کہ معاویہ نے عمرو بن العاص کے بیٹے عبداللہ کو کوفہ کا والی مقرر کیا ۔ مغیرہ بن شعبہ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے ” آپ نے عبداللہ بن عمرو بن العاص کو کوفہ کا اور عمرو بن العاص کو مصر کا حاکم بنایا ہے ، اس طرح آپ تو شیر کے دو جبڑوں کے درمیان آ گئے ہیں ۔“ یہ سن کر معاویہ نے عبداللہ کو معزول کر کے مغیرہ کو کوفہ کا والی بنا دیا ۔ جب عمرو بن العاص کو یہ اطلاع ملی تو آپ معاویہ کے پاس پہنچے اور کہنے لگے ” آپ نے مغیرہ کو کوفہ کا عامل بنا دیا ہے ۔ وہ مفلس و قلاش آدمی ہے اگر خراج کہا جائے تو آپ اس سے کچھ وصول نہ کر سکیں گے ۔ خراج کی وصولی پر کسی ایسے شخص کو مقرر کریں جو مال‌دار بھی ہو اور آپ کا مطیع و فرماں بردار بھی ۔“ معاویہ کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی اور انھوں نے مغیرہ سے خراج کی وصولی کا محکمہ واپس لے لیا اور انھیں صرف امام الصلٰوۃ رہنے دیا ۔ مغیرہ نے عمرو بن العاص سے شکوہ کیا ۔ انھوں نے کہا ” یہ محض تمھاری شکایت کا بدلہ ہے ۔“

د : وفات

۴۳ھ میں ، جب آپ حاکم مصر ہی تھے ، بیمار ہوئے اور عین عیدالفطر کے روز اسلام کا یہ درخشندہ ستارہ ہمیشہ کے لیے

غروب ہو گیا ۔ مصر کے طول و عرض میں آپ کی وفات سے صف ماتم بچھ گئی ۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو اس صدمے سے رنجور نہ ہو ۔ *

ابن عساکر ابن شماسہ مہزی کی روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ مرض الموت میں عمروؓ بن العاص کی عیادت کے لیے حاضر ہوئے ۔ آپ نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیر لیا اور رونے لگے ۔ آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے کہا " آپ کیوں روتے ہیں؟ کیا رسول اللہ نے آپ کو فلاں فلاں بشارتیں نہیں دیں ؟" یہ سن کر آپ نے اپنا منہ عبداللہ کی طرف پھیرا اور فرمایا :

" میری سب سے بڑی دولت لاالہ الااللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ہے ۔ مجھ پر زندگی کے تین دور گزرے ہیں ۔ پہلا دور وہ تھا جب رسول اللہ سے زیادہ کوئی شخص میری نظروں میں برا نہ تھا ۔ اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں آپ پر قابو پا کر آپ کو قتل کر ڈالوں ۔ اگر میں اس حالت میں مر جاتا تو میرے لیے دوزخ یقینی تھی ۔ دوسرا دور وہ آیا جب اللہ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈالی ۔ میں بیعت کے لیے رسول اللہ کے حضور میں آیا اور آپ سے عرض کی " یا رسول اللہ ! اپنا ہاتھ پھیلائیے، میں آپ کی بیعت کرتا ہوں ۔" رسول اللہ نے اپنا دست مبارک پھیلا دیا لیکن میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ۔ رسول اللہ نے فرمایا " عمرو بن العاص ! تمھیں کیا ہوا ؟" میں نے عرض کی " یا رسول اللہ ! میری ایک شرط ہے کہ میرے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جائیں ۔" حضور نے فرمایا " اے عمرو ! کیا تم نہیں جانتے کہ اسلام ، ہجرت اور حج پچھلے تمام گناہوں کو

---

* عمرو بن العاص کی وفات یکم شوال ۴۳ھ مطابق یکم جون ۶۶۴ء کو ہفتے کے روز ہوئی (مترجم)

معاف کر دیتے ہیں ؟" چنانچہ میں نے حضور کی بیعت کرلی ۔ اس کے بعد میری یہ حالت ہوگئی کہ رسول اللہ سے زیادہ کوئی شخص میری نگاہ میں محبوب نہ رہا ۔ اگر کوئی شخص مجھ سے رسول اللہ کا حلیہ مبارک دریافت کرے تو میں بتا نہیں سکتا کیونکہ آپ کے رعب و داب اور عظمت و ہیبت کی وجہ سے میں آپ کے چہرے کی طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ کرتا تھا ۔ اگر میں اس حالت میں وفات پا جاتا تو جنت کی اُمید تھی ۔ اس کے بعد تیسرا دور آیا جس میں میں نے مختلف قسم کے اعمال کیے ۔ اب میں نہیں جانتا کہ میرا کیا حال ہوگا ؟"

اس کے بعد کہا :

" اے میرے بیٹے ! میری وفات کے بعد نوحہ کرنے والیاں میرے جنازے کے ساتھ نہ جائیں ۔ جب تم مجھے قبر میں رکھ چکو تو مٹی آہستہ آہستہ گرانا ۔ میری قبر میں اینٹ اور پتھر نہ ڈالنا ۔ دفن کرنے کے بعد اتنی دیر تک میری قبر کے پاس رہنا جب تک اونٹ ذبح ہو کر اس کا گوشت تقسیم ہو جائے تاکہ میں تمھاری وجہ سے مانوس ہو جاؤں اور یہ غور کر لوں کہ اپنے رب کے قاصدوں کو کیا جواب دوں ۔"

پھر کہا :

" اے میرے بیٹے ! تم موت کے مقابلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہو ؟ "

بیٹے نے حیران ہو کر پوچھا " ابا جان ! موت کے مقابلے میں ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں ؟ موت کے سوا اگر اور کوئی مصیبت آپ پر پیش آتی تو یقیناً ہم آپ کی مدد کرتے ۔"

آپ نے فرمایا " مجھے سہارا دے کر بٹھاؤ ۔" چنانچہ آپ کو

سہارا دے کر قبلہ رخ بٹھایا گیا ۔ آپ نے فرمایا " میں نے یہ جانتے ہوئے تم سے فرمائش کی تھی کہ تم موت کے مقابلے میں میری کوئی مدد نہیں کر سکتے ۔ کاش میں نے اپنی زندگی میں کسی کو اپنی حفاظت کے لیے نہ رکھا ہوتا ۔"

پھر کہا " اے اللہ ! تو نے حکم دیا ، میں نے حکم سے سرتابی کی ۔ تو نے ممانعت کی ، میں نے نافرمانی کی ۔ اگر تو مجھے معاف کر دے تو تیرا کرم ہے اور اگر سزا دے تو میں اپنے اعمال کی بدولت اس کا مستحق ہوں ۔ الٰہی ! میں قوی نہیں کہ غالب آجاؤں ۔ بےگناہ نہیں کہ معذرت کروں ۔ میں مغرور نہیں بلکہ گناہوں کی معافی چاہنے والا ہوں ۔ میں تیری بخشش چاہتا ہوں اور تیرے حضور اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں ۔لا الہ الا اللہ ۔"*

یہی کہتے جان ، جان آفرین کے سپرد کر دی ۔

کتاب ' حیاۃالحیوان الکبریٰ ' (باپ و عل) میں مذکور ہے کہ جب عمرو بن العاص کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان کے بیٹے نے پوچھا :

" ابا جان ! آپ کہا کرتے تھے کہ کاش میں کسی ایسے عقل مند شخص سے حالت نزع میں ملتا جو مجھے موت کی کیفیت بتا سکتا ۔ آپ سے زیادہ عقل مند کون ہو سکتا ہے ذرا موت کی کیفیت بیان تو فرمائیے ۔"

آپ نے کہا :

" اے بیٹے ! مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ میری گردن پر ٹوٹ پڑا ہے ۔ کجھور کے کانٹے پاؤں سے سر تک بھرے پڑے

* ابن خلکان ۔ العقدالفرید ۔ المعارف ابن قتیبہ ۔ المستطرف فی کل فن مستظرف ۔

ھیں ، گویا میں سوئی کے ناکے میں سے سانس لے رہا ہوں -"
پھر یہ شعر پڑھا ع

لیتنی کنت قبل ماقد بدالی فی رؤوس الجبال ارعی الوعولا
(کاش میں موت کے آنے سے پہلے پہاڑوں پر بکریاں چراتا پھرتا)

مسعودی کی روایت کے مطابق آپ نے اپنے پیچھے تین سو پچیس دینار ، بیس لاکھ درھم نقد اور دس ھزار درھم کی مالیت کی وہ جاگیر چھوڑی جو طائف میں تھی -

ابن عساکر لکھتے ھیں کہ طائف کے باغ کے علاوہ مصر اور دمشق میں بھی آپ کی جائداد اور مکانات تھے -

مؤلف ' کتاب الحیوان ' لکھتے ھیں کہ آپ نے اپنے پیچھے دیناروں سے بھرے ہوئے ستر ' بہار ' چھوڑے (' بہار ' بیل کی کھال کو کہتے ھیں جس میں دو اردب غلہ آ سکتا ھے)- اپنی وفات کے قریب آپ نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ یہ رقم تمہارے لیے ھے - لیکن آپ کے دونوں بیٹوں عبداللہ اور محمد نے اسے لینے سے انکار کر دیا - آپ کی وفات کے بعد جب معاویہ کو یہ خبر ملی تو آپ نے ان کے بیٹوں سے کہا " اس مال کے ، جو تمہارے والد نے جمع کیا تھا ، ہم زیادہ حق دار ھیں کیونکہ تمہارے والد نے وہ مال دشمنوں سے لڑنے کے لیے جمع کیا تھا-" چنانچہ انھوں نے آپ کے بیٹوں سے سارا مال و دولت لے کر اسے بیت المال میں جمع کرا دیا -

لیکن یہ روایت صحیح معلوم نہیں ہوتی - یہ کیونکر ممکن ھے کہ عمرو بن العاص ایک سو چالیس اردب (ستر من) سونا یا بہ الفاظ دیگر دس کروڑ دینار محض اپنے لیے جمع کر سکتے ،

درآں حالیکہ حضرت عمر کے عہد میں انہیں صرف تنخواہ ملتی تھی اور معاویہ کے عہد میں فوجیوں کی تنخواہوں اور ملکی نظم و نسق کے مصارف کو منہا کرنے کے بعد جو رقم بچتی تھی وہ عمرو بن العاص کی ہوتی تھی ۔

۷ : قبر

ابوالمحاسن ، ابن قتیبہ ، ابن زیارت اور دمیری اس امر پر متفق ہیں کہ عمرو بن العاص ، فخ کے نواح میں حجاز جانے والے راستے پر جبل مقطم کے دامن میں دفن کیے گئے ۔ تاہم اس کے صحیح محل و قوع کے متعلق اختلاف ہے ۔ مؤلف کتاب 'المزارات المصریہ' نے لکھا ہے کہ آپ کی قبر حضرت امام شافعی کی قبر کے مغرب میں اس جگہ تھی جو مقابر قریش کے نام سے موسوم ہے ۔ لیکن بعض کہتے ہیں کہ وہ فسطاط کی خندق کے مغرب میں اور سیدہ آمنہ بنت امام موسیٰ کاظم کی شہادت گاہ کے مشرق میں واقع تھی ۔

یہ حقیقت ہے کہ عمرو بن العاص کی قبر کا نام و نشان عرصہ ہؤا مٹ چکا ہے اور تاریخ اس بارے میں بالکل خاموش ہے ۔ آپ کی قبر کی تلاش میں جبل مقطم کے پتھروں کو ہٹانا بہت مشکل کام ہے ۔ اس سلسلے میں ہمیں عمرو بن العاص کی وہ وصیت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے جو آپ نے اپنی وفات کے قریب اپنے بیٹوں کو کی تھی ۔ آپ نے فرمایا تھا :

" میری قبر پر آہستہ آہستہ مٹی گرانا اور اس میں اینٹ اور پتھر نہ ڈالنا ۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عمرو بن العاص کی قبر خالص

مٹی کی تھی اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کے نشانات بھی مٹتے گئے ۔ اسی ضمن میں بٹلر کا وہ بیان بھی قابل غور ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ شہر فسطاط (جس کی بنیاد عمرو بن العاص نے رکھی تھی) کی اکثر عمارتوں کے آثار زمین میں دفن ہو گئے ہیں اور بہت کم عمارتوں کے آثار اب تک باقی ہیں ۔ ان خوش قسمت عمارتوں میں سے ایک جامع عمرو بن العاص ہے جو اب تک ویرانے میں کھڑی لوگوں کو داستان پارینہ کی یاد دلا رہی ہے ۔

محکمہ آثار قدیمہ کے زیر اہتمام فسطاط کی کھدائی میں شہر کی بعض عمارتیں منظر عام پر آئی ہیں ۔ انھیں میں قلعہ بابلیون کا وہ دروازہ بھی ہے جس کے راستے مقوقس مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلا تھا ۔ ہو سکتا ہے کہ کھدائی کرتے کرتے اس جگہ کا پتا بھی چل سکے جہاں عمرو بن العاص دفن کیے گئے تھے اور دوبارہ اس فتح نصیب جرنیل کے شایان شان ایک شاندار مقبرہ بنایا جا سکے ۔

ابن زیات نے لکھا ہے کہ عمرو بن العاص اور عقبہ بن عامر جہنی کو ایک ہی جگہ برابر برابر دفن کیا گیا تھا ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ابو بصرہ غفاری بھی آپ کے برابر ہی مدفون ہیں ۔

اختتامیہ

حضرت عمرو بن العاص کی زندگی،
مختصر تبصرہ

یہاں پہنچ کر حضرت عمرو بن العاص کے حالات زندگی کا بیان ختم ہوتا ہے۔ ہمیں امید ہے قارئین کرام کو اس عظیم الشان جرنیل اور باکمال سیاست دان کی زندگی اور اس کے کارناموں سے بہت حد تک واقفیت حاصل ہو گئی ہو گی۔

تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں آ کر مہتم بالشان کارنامے انجام دیے ہیں انھیں دو حالتوں سے سابقہ پڑا۔ بعض لوگ تو ایسے ہیں جن کے لیے پہلے سے ان کے حسب منشاء زمین تیار اور فضا سازگار ہوتی ہے۔ ان کا کام صرف اس تیار زمین میں بیج بونا اور اپنی فطری صلاحیتوں سے کام لے کر اس سازگار فضا سے فائدہ حاصل کر کے وہ کام انجام دینا ہوتا ہے جس کے لیے انھیں دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے پہلے سے زمین تیار نہیں ہوتی۔ انھیں جد و جہد کر کے پہلے اپنے لیے زمین ہموار کرنی پڑتی ہے، اس کے بعد شیریں اثمار حاصل کرنے کے لیے اس میں بیج ڈالنا ہوتا ہے۔

اس نظریے کو سامنے رکھ کر جب ہم حضرت عمرو بن العاص

کی زندگی پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے لیے پہلے سے زمین ہموار نہ تھی بلکہ انھوں نے انتہائی کاوش اور محنت و مشقت سے خود اپنے لیے زمین تیار کی۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات ہرگز نظر انداز نہ کرنی چاہیے کہ آپ کو ایک عظیم الشان قائد، بے مثل سیاست دان، فتح نصیب جرنیل، منصف مزاج حاکم اور چوٹی کا زیرک انسان بنانے میں سب سے بڑا حصہ اس دین کا ہے جس کی پیروی آپ نے اختیار کی۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر اسلام کا ظہور نہ ہوتا تو آپ کی مخفی صلاحیتیں اور جلیل القدر صفات اس عمدگی سے کبھی ظاہر نہ ہو سکتیں جیسی اسلام لانے کے بعد ظاہر ہوئیں۔ پہلے آپ کی صلاحیتیں ایک تنگ دائرے میں مقید تھیں لیکن اسلام لانے کے بعد ان کا دائرۂ عمل بے حد وسیع ہو گیا۔ میدان جنگ میں آپ ایک عالی مرتبت جرنیل کے روپ میں ظاہر ہوئے، جس کی فتوحات کا دائرہ بے حد وسیع تھا اور نظم و نسق کے میدان میں ایک کامیاب و کامران، ہر دلعزیز حاکم کی حیثیت سے آپ نے قدم رکھا جس نے حسن سلوک سے اہل ملک کے دل موہ لیے اور ملک کو خوش حال بنانے کے لیے دور رس اقدامات کیے۔ آپ ہی وہ واحد شخص تھے جس کے دل میں سب سے پہلے مصر کی فتح کا خیال پیدا ہؤا اور آپ ہی نے اس خیال کو لباس عمل پہنا کر اور صرف چار ہزار سپاہ کی مدد سے مصر کے کونے کونے کو فتح کر کے ساری دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اُمت مسلمہ کی دینی، سیاسی، حربی اور اجتماعی زندگی کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک ان عظیم اثرات کا ذکر نہ کیا جائے جو حضرت عمرو بن العاص کی بدولت ظاہر ہوئے۔ حضرت عمرو بن العاص اپنے زمانے کی ایک نادرۂ روزگار ہستی،

محبت آپ کے دل و دماغ پر مستولی تھی ۔ اسی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا کہ آپ نہایت بیتابانہ دشمنوں سے جنگ کرنے کا انتظار کرتے رہتے تھے اور دشمن کے بڑے سے بڑے لشکر کو ، خواہ وہ قوت و تعداد میں مسلمانوں کے لشکر سے کتنا ہی بڑھ چڑھ کر کیوں نہ ہوتا اور مسلمان اس کے مقابلے میں کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہوتے ، کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے ۔ مصر کو صرف چار ہزار سپاہ سے فتح کر لینا ہمارے اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل ہے ۔

حضرت عمرو بن العاص کا شمار عرب کے مشہور ترین عقلمند اشخاص میں ہوتا تھا ۔ اسی عقل مندی سے کام لے کر آپ نے جنگ صفین کے موقع پر آن کی آن میں شامیوں کی شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا ۔ اس کے بعد تحکیم کے موقع پر آپ نے حضرت ابوموسی اشعری پر جو برتری حاصل کی وہ صرف آپ ہی کا حصہ تھی ۔

آپ جاہلیت کے زمانے میں قریش کے معزز ترین اشخاص میں سے تھے ۔ جب اسلام لے آئے تو اس کا اثر پورے طور پر قبول کر کے جاہلیت کے تمام رذائل کو اپنے اندر سے نکال پھینکا ۔ حلم ، پاکیزگی ، رجوع الحق اور اپنی خطاؤں پر ندامت کا اظہار یہ وہ اخلاق تھے جن کا اظہار ہمیشہ آپ کی جانب سے ہوتا رہتا تھا ۔ اسی ضمن میں ابن عساکر قبیصہ کی ایک روایت بیان کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کچھ عرصے کے لیے حضرت عمرو بن العاص کے ساتھ رہا ۔ میں نے اخلاق کے اعتبار سے آن جیسا پاکیزہ ہم نشین اور کوئی نہ دیکھا ۔ ابوالمحاسن روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمرو بن العاص اور مغیرہ بن شعبہ میں کچھ جھگڑا ہوگیا ۔ حضرت عمرو بن العاص

نے غصے میں آ کر مغیرہ سے کہا :

" اے ھصیص کی اولاد! کیا تو میرا نام برائی سے لیتا ہے؟"

یہ سن کر آپ کے بیٹے عبداللہ نے کہا " انااللہ وانا الیہ راجعون ۔ کیا اب بھی آپ طریق جاھلیت کے مطابق قبیلوں کا نام لے کر دوسرے شخص کو برا بھلا کہتے ھیں ؟ "

یہ سن کر حضرت عمرو بن العاص فرط ندامت سے پانی پانی ھو گئے اور کفارے کے طور پر اسی وقت تیس غلام آزاد کیے ۔

تقویٰ و طہارت کا یہ عالم تھا کہ آپ ھر وقت خدا تعالیٰ کے عتاب اور یوم آخرت کے عذاب سے ڈرتے رھتے تھے ۔ لقیط روایت کرتے ھیں ، ایک دفعہ رات کے وقت میں نے سنا کہ عمرو بن العاص زار و قطار رو رھے ھیں اور کہ رھے ھیں :

" اے اللہ ! تو نے عمرو بن العاص کو مال دیا ۔ اگر تیری مرضی ھو تو اس کا سارا مال چھین لے لیکن اسے آگ کے عذاب سے بچا لے ۔ تو نے عمرو کو اولاد دی ۔ اگر تو چاھے کہ عمرو کی اولاد زندہ باقی نہ رھے تو بے شک اسے اس نعمت سے محروم کر دے لیکن اسے دوزخ سے بچا لے ۔ تو نے اسے غلبہ و اقتدار اور حکومت سے نوازا ۔ اگر تو چاھے تو اس کا غلبہ و اقتدار باقی نہ رھے تو اس سے حکومت و سلطنت چھین لے لیکن اسے جہنم سے بچا لے ۔"

اپنے مرض الموت میں بھی آپ اپنے گزشتہ اعمال کو یاد کر کے ان پر ندامت کا اظہار کر رھے تھے اور بار بار اللہ سے اپنے گناھوں کی معافی طلب کر رھے تھے ۔

آپ میں بذلہ سنجی اور ظرافت بہت پائی جاتی تھی ۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ نے کسی اھم معاملے کے متعلق آپ سے

گفتگو کرنی چاہی ۔ آپ نے کہا " یہ گفتگو تخلیے ہی میں ہو سکے گی ۔" حضرت معاویہ نے تمام لوگوں کو ، جو اس وقت آپ کے پاس بیٹھے تھے ، چلے جانے کا حکم دیا ۔ جب کمرہ خالی ہو گیا تو آپ نے حضرت معاویہ سے کہا " ذرا قریب آئیے میں کان میں آپ سے بات کہوں گا ۔" حضرت معاویہ نے اپنا کان قریب کر دیا ۔ آپ ہنس کر کہنے لگے " اس وقت کون شخص یہاں موجود ہے جو کان میں بات کہنے کی حاجت ہو ۔"

سیاست میں آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں نے آپ کو سفیر بنا کر نجاشی کے دربار میں بھیجا تھا ۔ اسلام لانے کے بعد رسول اللہ نے شاہ عمان کے پاس آپ کو اپنا سفیر بنا کر بھیجا ۔ مصر میں آپ نے سیاست کا جو اعلیٰ نمونہ دکھایا اس نے مصریوں کے دلوں کو موہ لیا ۔ آپ اپنے سارے عہد حکومت میں مصریوں کی ترقی و خوشحالی کے لیے کوشاں رہے ، عدل و انصاف کو کسی موقع پر بھی ہاتھ سے نہ جانے دیا ، جو معاہدے اور مواثیق آپ نے ان سے کیے ان پر سختی سے کاربند رہے اور کبھی کسی معاہدے کو توڑنے کا خیال بھی دل میں نہ آیا ۔ جنگ صفین کے موقع پر ، جب حضرت علی کے لشکر کی فتح یقینی دکھائی دے رہی تھی ، آپ کے عزم و ارادہ میں ہلکی سی بھی جنبش پیدا نہ ہوئی اور چشم زدن میں آپ نے حیرت انگیز تدبیر کے ذریعے سے میدان جنگ کا نقشہ تبدیل کرا دیا ۔ یہ واقعہ آپ کے کمال سیاست کا کا ناقابل تردید ثبوت ہے ۔

مختصر یہ کہ حضرت عمرو بن العاص نے اپنے آپ کو اہل عرب کا کامل نمونہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا ۔ آپ دولت

عرب کے ان معدودے چند معماروں میں سے ہیں جن کا تذکرہ کیے بغیر اس سلطنت کا ذکر مکمل نہیں ہو سکتا اور جن کی عظیم القدر خدمات ، جو اس حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں انھوں نے انجام دیں ، کسی زمانے میں بھی فراموش نہیں کی جا سکتیں ۔

نقشہ عرب
(نوٹ: موٹے حروف کے ذریعے علاقوں کی نشان دہی کی گئی ہے
اور باریک حروف کے ذریعے قبائل کی۔)
فارس
بلاد فارس
بصرہ
دریائے دجلہ
دریائے فرات
خلیج عمان
بحر ہند
حضرموت
مہرہ
صحرائے احقاف
العمالقہ
مصر

العریش سے تنیس تک
(عمرو بن العاص کی گزرگاہ)
البحر الأبیض المتوسط
(بحیرۂ روم)
خلیج بردویل
بئر المساعید
گزرگاہ عمرو بن العاص
بئر العبد
قطیہ
دریائے تنیس
دریائے طینی
البیلوزی

البحر الابیض المتوسط
(بحیرۂ روم)
برلس
خلیج برلس
دمیاط
دریائے دمیاط
بلقاس
سخا
بوصیر
تنیس
خلیج
دریائے تنیس
صان
دمنہور
الکریون
کفرالزیات
طنطا
کوم شریک
نقیوس
ترنوط
منوف
قلیوب
بابلیون
مصر
عین شمس
"ہلیوپولیس"
بلبیس
نہر تراجان
(وادی عرب التومیلات)
القلزم
فرما
نقشہ
فتح مصر
(ڈیلٹائی علاقہ)

مآخذ

میں نے اس کتاب کی تالیف میں عربی ، انگریزی اور فرانسیسی کی متعدد کتابوں سے استفادہ کیا ہے :

عربی مآخذ

مؤلف	کتاب
ابن اثیر	الکامل فی التاریخ - مطبوعہ مصر ۱۳۰۱ھ
ابن زیات	الکواکب السیارۃ فی ترتیب الزیارۃ
ابن اسحاق	فتوح مصر واعمالہا - مطبوعہ مصر ۱۲۷۵ھ
ابن برہان الدین	السیرۃ الحلبیۃ ، تینوں جلدیں
ابن حجر	الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ - مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ
ابن خلدون	العبر و دیوان المبتدا والخبر - مطبوعہ بولاق ۱۲۸۴ھ
ابن خلکان	وفیات الاعیان وانباء ابناء الزمان - مطبوعہ مصر ۱۳۱۰ھ
ابن دقماق	الانتصار لواسطۃ عقد الامصار - مطبوعہ قاہرہ ۱۸۹۳ء
ابن طباطبا	الفخری فی الاداب السلطانیہ والدول الاسلامیۃ - مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ
ابن عبدالحکم	فتوح مصر - مطبوعہ فرانسیسی مجلس معارف
ابن عبدربہ	العقد الفرید ، تینوں جلدیں
ابن قتیبہ	(۱) کتاب المعارف (۲) الامامۃ والسیاسۃ
ابن ہشام	سیرۃ ابن ہشام - مطبوعہ مصر ۱۳۲۹ھ

ابوالفرج مختصر تاريخ الدول - مطبوعه بيروت

ابوالمحاسن النجوم الزاهرة فى ملوك مصر والقاهره - مطبوعه ليڈن

البلاذرى فتوح البلدان - مطبوعه قاهره ١٣١٩ھ

البغدادى سبائک الذهب فى معرفة قبائل العرب - مطبوعه بغداد ١٢٨٠ھ

الاصفهانى كتاب الاغانى - مصر ١٣٢٣ھ

الآلوسى بلوغ الأرب فى احوال العرب - مطبوعه بغداد ١٣١٤ھ

الخضرى بک تاريخ الامم الاسلاميه

رفيق العظم بک اشهر مشاهير الاسلام فى الحرب والسياسة - مطبوعه مصر ١٣٢١ھ

السيوطى حسن المحاضرة فى تاريخ مصر والقاهره - مطبوعه المطبعة الشرقية

الشهرستانى الملل والنحل - مطبوعه مصر ١٣١٧ھ

الطبرى الامم والملوک - مطبوعه المطبعة الحسينية المصرية

عبداللطيف بغدادى الافادة والاعتبار فى الامور المشاهدة والحوادث المعاينة بأرض مصر

على مبارک الخطط التوفيقية - مطبوعه بولاق ١٣٠٦ھ

القلقشندى (ابوالعباس احمد) صبح الاعشى مطبوعه المطبعة الاميرية

القلقشندى (محمد بن عبدالله) نهاية الارب فى معرفة قبائل العرب (قلمى)

المبرد الكامل فى اللغة - مطبوعة ليپزگ

محمود فهمى مصر فى عهد الرومان - مطبوعه مصر ١٩١٦ء

المسعودى مروج الذهب ومعادن الجوهر - مطبوعه بولاق ١٢٨٣ھ

المقریزی — المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطط والآثار۔ مطبوعہ مصر ۱۲۷۰ھ
وستنفلد — تاریخ مکہ۔ مطبوعہ لیپزگ ۱۸۶۱ء
یاقوت حموی معجم البلدان۔ مطبوعہ مصر ۱۳۲۳ھ
الواقدی — فتوح الشام۔ مطبوعہ مصر ۱۳۰۲ھ
الیعقوبی — تاریخ الیعقوبی۔ مطبوعہ لیڈن ۱۸۸۳ء

یورپی مآخذ

Ameer Ali, Sayed : Short History of the Saracens, London 1891.

Amelineau : (a) Fragements Coptes, Journal Asiatique, 1888.
(b) Geographie de l'Egypte a l'Epoque Copte, Paris, 1893.

Butler, Alfred J. : (a) The Arab Conquest of Egypt, Oxford, 1902.
(b) Babylon of Egypt, Oxford, 1914.

Bury, J.B. : History of the Later Roman Empire, London, 1889.

Caussin de Perceval, A.P. : Essai l'Histoire des Arabes avant l'Islamisme, pendant l'epoque de Mohamet.

Gibbon, Edward : The History of the Decline and Fall of the Roman Empire

Huart, C.L. : Histoire des Arabes, Paris, 1913.
Irving, Washington : A History of the Lives of the Successors of Mohamet, London, 1912.
Lane-poole, Stanley : A History of Egypt in the Middle Ages, London, 1901.
Le Bon, Gustave : La Civilisation des Arabes, Paris, 1884.
Marcel, M.J.J. : l'Egypt, depuis la Conquete des Arabes, jusqu'a la Dominion, Paris, 1848.
Milne, J. Grafton : A History of Egypt under Roman Rule, London, 1913.
Muir, Sir William Temple : The Caliphate; its Rise, Decline and Fall, Oxford, 1902.
Quatremere, F. : Journal Asiatique, Paris, 1850.
Sedillot, L.B. : Histoire Generale des Arabes, Paris, 1877.
Sharpe, Samuel : (a) Chronology and Geography of Ancient Egypt, London, 1838.
(b) A History of Egypt under the Ptolemies, London, 1849.

سلسلۂ تاریخ و سوانح

« یہ سلسلہ شروع کر کے مکتبۂ جدید
نے قوم و ادب کی ایک اہم خدمت
انجام دی ھے ۔ »

(میاں) بشیر احمد ، بار ایٹ لاء
سابق سفیر برائے جمہوریۂ ترکی
مدیر « ھمایوں » لاھور

مکتبۂ جدید

عمرابوالنصر

الزهراء

''حضرت فاطمه زهرا سیرت و کردار کے لحاظ سے یه مرتبه رکھتی هیں که نسائیت کا مثالی پیکر بھی هیں اور مسلمان خواتین کے لیے ایک قابل تقلید نمونه بھی - رسول کریم کی نسل آپ هی سے چلی، آپ هی کے فرزند نے کربلا میں شہادت کو لبیک کہا - لیکن اس اهم شخصیت کے سوانح حیات مرتب کرنے اور سیرت و کردار کے سارے پہلوؤں سے روشناس کرانے سے غفلت برتی گئی - اب عمرابوالنصر نے اس مقدس اور صاحب مرتبه خاتون کے حالات جمع کیے هیں اور پوری سوانح حیات مرتب کی هے ، اور آپ کے عادات و خصائل کا نقشه اس خوش اسلوبی سے پیش کیا هے که بی بی فاطمه کی جیتی جاگتی شخصیت همارے سامنے آ جاتی هے -''

روز نامه « آفاق » لاهور

'' الزهراء ، خاتون جنت حضرت فاطمة الزهراء کی حیات طیبه سے نسبت رکھتی هے - عمرابوالنصر نے یه مختصر کتاب در حقیقت فرانسیسی مستشرق لامنس کی ایک ایسی تصنیف کے جواب میں لکھی هے جس میں خاتون جنت کی زندگی کو صحیح رنگ میں پیش نہیں کیا گیا - عمرابوالنصر نے لامنس کے اعتراضات کے جوابات کو بجائے خود ایک سوانح عمری بنا دیا هے اور قیمتی مواد جمع کر دیا هے - یه چھوٹی سی کتاب همارے سوانحی ادب میں ایک بیش قیمت اضافے کا حکم رکھتی هے اور اهل بیت کے ذکر میں جو ادب همارے یہاں پہلے سے موجود هے اس میں اس کا شمول غایت درجه پسندیده هے -''

مولانا صلاح الدین احمد

عمر ابوالنصر

الحسین

" الحسین " کے مصنف نے حق گوئی اور انصاف پسندی سے کام لے کر سبط نبی کی جامع سوانح عمری پیش کی ہے ۔"

روز نامہ « نوائے وقت » لاھور

" الحسین" واقعۂ کربلا کی مکمل اور مفصل تاریخ ہے ۔"

ھفت روزہ « تعمیر » راولپنڈی

" الحسین ھر پڑھنے والے کو صحیح اور مستند واقعات کا علم بخشتی ہے ۔"

روز نامہ « قومی آزاد » لکھنؤ

" الحسین" ان لوگوں کےلیے ایک مستند کتاب ہے جو قدیم و جدید کتب تاریخ کے مطالعے کی سکت رکھتے ھیں نہ فرصت ۔"

روز نامہ « تسنیم » لاھور

" الحسین" کےمصنف نے ایک مؤرخ کےطور پر غیر جانبدارانہ انداز بیان کو پوری طرح نباھا ہے ۔ اس احساس ضبط نے تحریر کی تاثیر میں اضافہ کیا ہے اور حضرت حسین کی شخصیت کی عظمت اور واقعۂ کربلا کی اھمیت و صداقت دل میں گھر کرلیتی ہے ۔"

روز نامہ « آفاق » لاھور

" الحسین " مسلمانوں کو اس اتحاد و وحدت کی دعوت دیتی ہے جس کے تحفظ اور سر بلندی کی خاطر حضرت حسین نے اپنی زندگی قربان کر دی ۔"

روز نامہ « امروز » لاھور

محمد حسین ہیکل

ہیکل پاشا عالم اسلام کے مستند و مشہور ترین اہل قلم میں سے ہیں ۔ آپ مصر کے وزیر تعلیم بھی رہ چکے ہیں ۔ آپ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ، روشن دماغ انسان ، وسیع النظر فلسفی ، بے لاگ نقاد ، متضاد بیانات و روایات کو سلجھانے پر قادر تاریخ دان ، اور اپنے خیالات و نظریات کو بہترین صورت میں پیش کرنے والے فنکار ہیں ۔ آپ نے اپنی گوناگوں صلاحیتوں کو ایک عدیم المثال ادبی و علمی کارنامے کے لیے وقف کر رکھا ہے اور محمد رسول اللہ ، ابوبکر صدیق اکبر ، عمر فاروق اعظم کی ایسی سوانح عمریاں تصنیف کی ہیں کہ تحقیق و علم و فن کا کمال ہیں ۔ مکتبۂ جدید نہایت عزت و احترام سے اُردو میں ہیکل پاشا کی دو کتابیں پیش کرنے کا افتخار حاصل کر رہا ہے — ابوبکر — اور ، عمر —

ابوبکر ، صدیق اکبر

آفتاب رسالت غروب ہوا تو مسلمانوں کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی ۔ عمر جیسے ثابت قدم بھی لڑکھڑا گئے اور اعلان کرنے لگے کہ رسول اللہ وفات نہیں پا سکتے ۔ لیکن وہ جو یار غار تھا ، اور اس سے بڑھ کر اس وقت کس کا جگر خون ہو رہا ہوگا ، اس نے اپنے محسوسات کو سینے میں دبا لیا اور زبان سے وہ صدائے حق بلند کی جس نے یاس و نو میدی کے گھٹا ٹوٹ اندھیرے کو چیر کر رکھ دیا — وہ پکارا :

" مسلمانو ! جو شخص محمد کا عبادت گزار ہے اسے معلوم ہو کہ محمد وفات پا چکے ہیں لیکن اگر وہ اللہ کا عبادت گزار ہے تو اللہ زندہ ہے اور اس پر موت وارد نہیں ہو سکتی ۔ "

عمر ، فاروق اعظم (زیر طبع)

سیرت

حضرت عمرو بن العاص رضؓ
(فاتح مصر)

ڈاکٹر

حسن ابراهیم حسن

(پی ایچ ، ڈی)

ترجمہ :

شیخ محمد احمد پانی پتی

لاہور

مکتبۂ جدید

(انار کلی)